گلاؤٹھی

دوآبہ گنگ و جمن میں واقع سادات کی ایک تاریخی بستی

سید منصور عاقل

(دوآبۂ گنگ وجمن میں واقع سادات کی ایک تاریخی بستی)

سید منصور عاقل

شائع کردہ:
مکتبہ اتحاد المصنفین
۱۳ - سٹریٹ ۱۳ سیکٹر ایف ۷/۲
اسلام آباد (پاکستان)

نام کتاب	گلاؤ ٹھی
مصنف	سید منصور عاقل
سال اشاعت	جون ۱۹۹۸ء
کمپوزنگ	نعیم کمپوزرز ۔ اسلام آباد
مطبع	منزل پرنٹرز ۔ اسلام آباد
سرورق	امجد شہزاد
قیمت	ایک سو پچاس (۱۵۰) روپیہ

ناشر
مکتبہ اتحاد المصنفین

۱۴ سٹریٹ ۱۳ سیکٹر ایف ۲/۷
اسلام آباد (پاکستان)

انتساب

رفتار زمانہ کی گرد میں روپوش ہو جانے والے
گلاوٹھی کے ان صاحبانِ کمال کے نام جن کے
ذکرجمیل سے تاریخ کے اوراق مزین نہ ہو سکے۔

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ

نمبرشمار	مضمون	صفحہ

اظہار تشکر

زیر نظر کتاب کی تصنیف و تدوین کا کام خاصا صبر آزما ثابت ہوا اور وہ اس لئے کہ معتبر ذرائع معلومات نہایت محدود و مختصر تھے۔ صرف سنی سنائی باتوں کو بنیاد بنا کر تاریخی حقائق قلمبند نہیں کئے جا سکتے اور چونکہ ہر راوی کا معتبر ہونا بھی ضروری نہیں اس لئے احتیاط اور بھی ناگزیر تھی ظاہر ہے کہ ایک چھوٹی سی بستی کی حیثیت سے گلاؤٹھی کے سیاسی' سماجی اور معاشی و ثقافتی پس منظر پر مطبوعہ و غیرمطبوعہ مواد بھی سہل الحصول نہیں تھا کیونکہ اس سے پیشتر اس موضوع پر نہ تو کوئی تحقیقی کاوش کی گئی اور نہ کسی ایسی ممکنہ کاوش کے نتائج منظر عام پر آئے ان حالات میں یہ امر انتہائی طمانیت کا باعث ہے کہ تمام تر مشکلات کے باوجود جو کچھ مواد اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ مستند ہے اور معتبر حوالوں سے ماخوذ ہے۔

میرے لئے ہرگز ممکن نہ تھا کہ میں اس کام کا آغاز بھی کر سکتا اگر متعدد خواتین و حضرات اور اداروں کا پر خلوص تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا اور گلاؤٹھی کی یادوں کے امین بعض بزرگان محترم میری حوصلہ افزائی نہ کرتے اس لئے میں اس کام میں مددگار ثابت ہونے والے ذرائع کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں اس عمارت کی بنیادی اینٹ رکھنے میں میرے عزیز دوست حفیظ اختر ڈائریکٹر جنرل نیشنل لائبریری آف پاکستان اور ان کے مستعد سٹاف نے اس مستند مواد تک پہنچنے میں میری مدد کی جس کا حصول میرے لئے تقریباً" ناممکن ہو چکا تھا انگریزی عہد میں شائع ہونے والے ڈسٹرکٹ گزٹیرز میں ضلع بلند شہر کا گزٹ مکمل شکل میں کہیں نہیں مل رہا تھا۔ چنانچہ برادرم حفیظ اختر نے انڈیا آفس لائبریری لندن سے حاصل کردہ مائیکروفش فارم میں اس مواد تک میری دسترس کو ممکن بنا دیا اور کچھ عرصہ تک میں نے نیشنل لائبریری اسلام آباد ہی میں بیٹھ کر پروجیکٹر پر ان دستاویزات کا مطالعہ کیا اور ضروری نوٹس حاصل کئے اس سلسلہ میں ایک بڑی مشکل یہ بھی آن پڑی تھی کہ ضلع بلند شہر کا نقشہ کسی بھی طرح مائیکروفش سے منتقل کرنا ممکن نہیں ہو رہا تھا چنانچہ اس سلسلہ میں میں اپنے ایک اور رفیق اور محترم دوست عتیق ظفر شیخ ڈائریکٹر جنرل نیشنل

آرکائیوز آف پاکستان کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے یہ مشکل حل کرنے کیلئے اپنے دفتر کے تمام تکنیکی عملہ کو اس کام پر لگا دیا اور وہ بلند شہر کے نقشہ کا فوٹو عکس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن ابھی ایک اور بھی مرحلہ باقی تھا کہ اس دھندلے عکس کی بنیاد پر واضح اور شفاف نقشہ مرتب کیا جائے اور یہ کٹھن کام برادرم سید احمد کے فرزند ارجمند سید نعیم احمد نے انجام دیا جو اسلام آباد ہی میں ایک بین الاقوامی آئیل کمپنی میں سینئر جیالوجسٹ کے منصب پر فائز ہیں اور مزاج و طبعیت کے اعتبار سے نہایت ایثار پیشہ اور تعاون کیش واقع ہوئے ہیں اس سلسلہ میں میری بہترین دعائیں ان کے لئے وقف رہیں گی۔

کتاب ہذا میں ضمیمہ کے طور پر اس فارسی رسالہ کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے جو "تذکرۃ الاقرباء و شجرۃ الاولیاء" کے نام سے ۱۲۷۴ھ میں سید محمد حسینی واسطی نے مرتب کیا سادات گلاؤٹھی کی نسبت یہ ایک نہایت اہم اور بنیادی نوعیت کی دستاویز ہے جس میں قصبہ گلاؤٹھی کے تقریباً" تمام سید خاندانوں کے نسبی سلسلوں پر مشتمل ایسی معلومات بھی ملتی ہیں جو مقامات اور شخصیتوں کے حوالے سے تاریخی اہمیت کی حامل ہیں اور جن کی قدر آئندہ نسلوں پر بھی اس لئے واجب ٹھہرے گی کہ یہ ان کے اجداد امجد کے اسمائے گرامی اور بعض قابل ذکر بزرگوں کے احوال پر مشتمل ایک مستند دستاویز ہے اس دستاویز کا اصل قلمی نسخہ گلاؤٹھی ہی کے ایک بزرگ حکیم سید امین الدین کے پاس محفوظ ہے جو شاد باغ لاہور میں مستقل سکونت رکھتے ہیں اور جنہوں نے میری درخواست پر ہی قلمی نسخہ کی ایک عکسی نقل ازرہ شفقت و محبت مجھے عطا فرمائی جس کے لئے میں ہمیشہ ان کا سپاس گزار رہونگا لیکن اس فارسی دستاویز کو اردو میں منتقل کرنے کا جو علمی کارنامہ میرے ماموں زاد بھائی سید محبوب حسن واسطی نے انجام دیا ہے وہ ان ہی جیسے عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر بیک وقت دسترس رکھنے والے سکالر کیلئے ممکن تھا اس سلسلہ میں انہوں نے نہ صرف میری فرمائش کو پذیرائی بخشی بلکہ اپنا بہت سا قیمتی وقت صرف کرکے کئی بار پروف ریڈنگ کی اور اپنے ایک نوٹ کا اضافہ کر کے اس دستاویز میں پائے جانے والے بعض ابہام دور کئے بلکہ اس رسالہ کے فہم کو بے حد سہل بلکہ دلنشین بنا دیا اس گرانقدر کاوش کے نتیجہ میں

زیر نظر کتاب کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہوا ہے جس کے لئے میں محبوب واسطی کا تہہ دل سے ممنون ہی نہیں بلکہ انہیں خراج تحسین پیدا کرتا ہوں' اصل میں انہوں نے اس کتاب کیلئے اور بھی مدد مہیا کرنے میں اور کراچی کے بعض گھرانوں اور گلاؤٹھی کے بزرگوں سے مل کر معلومات فراہم کرنے میں جس لگن اور خلوص کے ساتھ میری معاونت کی ہے کوئی بھی الفاظ سپاس اس کا احاطہ نہیں کر سکتے اللہ تعالی انہیں اپنی بہترین نعمتوں سے نوازے (آمین)

اور بھی بہت خواتین و حضرات میرے شکریہ کے مستحق ہیں جن کے تعاون کی یہ کتاب مرہون منت ہے خاص طور پر میں برادر محترم جناب اصلح الحسینی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی بعض یاد داشتیں محبوب واسطی صاحب کے ذریعہ کیسٹ پر محفوظ کرکے کراچی سے مجھے اسلام آباد بھجوائیں جو ایک حد تک اس کام میں میرے لئے رہنما ثابت ہوئیں اسی طرح جناب حسیب احمد مرحوم نے اپنی وفات سے کچھ قبل مجھے ایک مراسلہ کے ذریعہ اپنے خاندان کی اہم شخصیتوں کے بارے میں مواد مہیا کیا اور ان کی اہلیہ محترمہ سیدہ بدر نے منشی مہربان علی مرحوم کی ایک نادر تصویر بہم پہنچائی جو شریک اشاعت ہے اسی طرح منشی مہربان علی اور ان کی دختر فاطمہ بیگم اور نواسی ریاض فاطمہ کے بارے میں کوائف محترم اختر بیگانہ نے مہیا کیے۔ بیگم فیروزہ منسوب زیدی اور ان کی بڑی ہمشیرہ بیگم سید حامد علی جعفری نے اپنے والد حافظ سید شفیع الدین کی ایک یاد گار تصویر اور ان کے بارے میں اہم معلومات فراہم کیں میں ان ہستیوں کا ممنون ہوں۔

اسلام آباد میں برادرم سید ممتاز اللہ سالاری اور برادرم سید انیس الدین احمد نے اہم معلومات اور گلاؤٹھی کی تاریخی تصاویر عطا کرکے مجھے اپنے مخلصانہ تعاون سے نوازا۔ برادر مکرم مزمل جعفری نے کراچی سے فیکس پر اپنے وطن مالوف گھٹاؤلی کے بارے میں ایک پراز معلومات نوٹ ارسال کیا' جس کیلئے میں سراپا سپاس ہوں البتہ ایک ملال مجھے رہے گا کہ میں مسلسل کوشش و کاوش کے باوجود قصبہ گلاؤٹھی کا نقشہ حاصل نہیں کر سکا جو اس کتاب کیلئے انتہائی ضروری تھا۔

سید منصور عاقل

ابتدائیہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی سرزمین بذات خود معزز و محترم نہیں ہوتی بلکہ اسے اعزاز و شرف عطا کرنے والی وہ ہستیاں ہوتی ہیں جن کے کردار اور کارناموں پر تاریخ بھی فخر کرتی ہے ویسے بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جگہوں سے روشنی کے ایسے مینار بلند ہوئے ہیں جن کی تابناکی نے ایک عالم کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ مشاہیر عالم کے ناموں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ہستیاں اکثر و بیشتر گمنام گوشوں سے ابھریں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے انمٹ نقوش ثبت کر گئیں۔ دہلی جسے برصغیر کی تاریخ میں صدیوں سے ہر حکومت کا صدر مقام رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس کے قرب میں اور عین دریائے گنگا و جمنا کے دو آبے میں واقع ایسی ہی ایک چھوٹی سی بستی جسے گلاؤٹھی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے آج بھی اپنی تمام تر تاریخی عظمتوں کے ساتھ باقی و قائم ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ برصغیر میں برپا ہونے والی کسی بھی قومی' سماجی' سیاسی اور دینی تحریک کے حوالے سے اس بستی کے کردار کو فراموش کر دیا جائے کیونکہ اس خطہ ء زمین نے ایسی ہستیوں کو جنم دیا جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے اس بستی کے فرزندوں کے انہیں اوصاف کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے عظیم مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ رقعات عالمگیری میں ایک جگہ اس طرح رقمطراز ہیں :

"اگر ساداتِ عظّام گلاؤٹھی طالبانِ منصب و جاہ بودے
مدام قلمدانِ وزارتِ عظمیٰ بدستِ ایشاں بودے"

عظیم مغل شہنشاہ کا پیش کیا ہوا یہ خراج تحسین اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ گلاؤٹھی کے سادات عظام کے درمیان جہاں ایسی ہستیاں موجود تھیں جو وسیع ترین مغل سلطنت کے وزیراعظم کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتی تھیں وہاں منصب و جاہ سے بے نیازی ان کی درویشی و خاکساری کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کیونکہ خود ایک عظیم المرتبت حکمران اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ایک منتظم بھی تھے اور مردم شناسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کی اس رائے کو کسی مبالغہ پر مبنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بدقسمتی سے ماضی میں کبھی کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی کہ اس خطہ زمین کے تاریخی حقائق کو مجتمع کیا جاتا اور واقعات و شخصیات کے حوالے سے ایک منظر نامہ مرتب کیا جاتا تاکہ مربوط انداز میں معلومات فراہم ہوسکتیں۔ تاہم تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں جستہ جستہ حوالے ملتے ہیں جو اس چھوٹی سی بستی کو مزید تحقیق و تجسس کا موضوع قرار دینے کا جواز مہیا کرتے ہیں سب سے اہم کردار جو اس بستی کے باسیوں نے انجام دیا وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حوالے سے ہے جس میں گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے ایک قصبہ کی حیثیت سے حریت پسندوں کا مرکز بن گیا تھا اور گلاؤٹھی ہی کے جوار میں واقع مالاگڑھ سے اٹھنے والے ایک انقلابی رہنما ولیداد خاں کی قیادت میں اہل گلاؤٹھی نے برطانوی استبداد و استعمار کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ ڈاکٹر سید معین الحق اپنی انگریزی کی کتاب "۱۸۵۷ء کا عظیم انقلاب" The Great Revolution of 1857 میں جسے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ ضلع بلند شہر میں حریت پسندوں کی جانب سے انگریزوں کی مزاحمت کے واقعات تحریر کرتے ہوئے صفحہ ۳۸۱ تا ۳۸۵ کے درمیان رقمطراز ہیں کہ

> "گلاؤٹھی کے قصبے میں جو بلند شہر سے زیادہ دور نہیں ہے سپیٹ (انگریز فوجی کمانڈر) نے اپنی حکمرانی قائم کرنا چاہی لیکن وہاں اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا اور حریت پسندوں نے اسے

گلاؤٹھی سے نکال دیا اس طرح بلند شہر تمام تر انگریزوں کے
ہاتھوں سے نکل گیا"۔

گلاؤٹھی جسے ضلع بلند شہر کے قصبات میں ہمیشہ بخصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے بھی جنگ آزادی کے دوران نواب مالاگڑھ ولیداد خاں کی قیادت میں حریت پسندوں کی سرگرمیوں کا محور و مرکز بنا رہا کیونکہ یہ قصبہ میرٹھ سے علی گڑھ اور آگرہ جانے والی مشہور شاہراہ پر واقع ہے ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو علی گڑھ کے بعد جب ضلع بلند شہر میں جنگ آزادی کی ابتداء ہوئی تو انگریزوں اور حریت پسندوں کے درمیان گلاؤٹھی میں بھی کئی معرکے ہوئے جن کا ذکر انگریز حکمرانوں کے مرتب کردہ گزٹیرز میں جابجا ملتا ہے جس میں جنگ آزادی کو غدر اور حریت پسندوں کو باغیوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ انگریز اس علاقے میں تعینات نویں انفنٹری رجمنٹ میں بغاوت رونما ہونے کے بعد بھاگ کھڑے ہوئے تھے تاہم فوجی اعتبار سے انگریزوں کے لئے اس علاقے کی بازیابی نہایت ضروری تھی اس لئے میرٹھ سے فوجی کمک منگوائی گئی اور دہرہ دون کے گورکھوں کی مدد سے انگریز ضلع بلند شہر کے اس علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب تو ہوگئے لیکن یہ قبضہ سرفروشان آزادی کی مسلسل مزاحمت کے باعث زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور نواب ولی داد خاں نے ایک بار پھر انگریز اور ان کے حواریوں کو مار بھگایا۔ چنانچہ جولائی سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک ولیداد خاں اس علاقے پر قابض رہے بلکہ ایک موثر نظام حکمرانی بھی قائم کیا۔ ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے پوری تیاری کے بعد غازی آباد سے پھر یلغار کر دی اور اپنی حکمرانی دوبارہ سے قائم کرلی۔ اس سلسلہ میں جنگ آزادی کا احوال لکھتے ہوئے جنوری ۱۹۵۷ء میں جنگ آزادی کی صد سالہ تقریبات سے متعلق اخبار الجمعیت دہلی اپنی مخصوص اشاعتوں میں گلاؤٹھی کا ذکر بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ آزادی کی خونریز تحریک میں ولی داد خاں کے ایک ساتھی اور معاون حاجی اللہ یار خاں نے جو گلاؤٹھی میں بحیثیت پولیس افسر تعینات تھے زبردست کردار ادا کیا انہوں نے اپنی خدمات انقلابی حکومت کے سپرد کر دی تھیں انہوں نے تحریک آزادی میں پوری جاں سپاری

کے ساتھ حصہ لیا چنانچہ انہیں بھی انقلاب کی ناکامی کے بعد گرفتار کرلیا گیا اور ان کی تمام جائیداد ضبط کرلی گئی۔

تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد حریت پسندوں کی صرف جائیدادیں ہی ضبط نہیں کی گئیں بلکہ انہیں پھانسی دینے کی سزاؤں کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور بلند شہر میں جو گلاؤٹھی سے صرف بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایک آم کے درخت کے ساتھ جو بعد میں کالا آم کے نام سے مشہور ہوا بیشمار حریت پسندوں کو درخت کے ساتھ لٹا کر پھانسی دی گئی۔ انہیں شہدائے آزادی میں گلاؤٹھی کے ایک معزز خاندان سادات کے فرزند سید برکت اللہ شہید بھی تھے جو بہادر شاہ کی فوج میں ملازم تھے اور جنہیں انگریزوں کے خلاف جہاد آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں پھانسی کی سزا دی گئی اور اس سزا پر عمل درآمد بلند شہر میں کالا آم کے مقام پر پھانسی دیکر کیا گیا۔ سید برکت اللہ شہید کی بھی تمام جائیداد ضبط کرلی گئی۔ آپ کا مزار بلند شہر ہی میں واقع ہے۔ سادات گلاؤٹھی نے جنگ آزادی میں چونکہ بھرپور حصہ لیا اس لئے اس جنگ کی ناکامی کے بعد انہیں کو انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا۔ ان کی تمام جائیدادیں جو انہیں مغل فرمانرواؤں سے اپنی اعلیٰ خدمات کے عوض ملی تھیں یا عظیم دینی، علمی اور ذاتی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر عطیہ کی گئی تھیں نہ صرف بحق انگریزی سرکار ضبط کرلی گئیں بلکہ ان جائیدادوں سے ان خاندانوں کو نوازا گیا جنہوں نے مادر وطن سے غداری کی تھی اور حریت پسندوں کی سرگرمیوں کی صرف مخبری ہی نہیں بلکہ قدم قدم پر ان کے جہاد آزادی میں رکاوٹیں پیدا کی تھیں جیسا کہ ذکر کیا گیا انگریز حکمرانوں نے اپنے مرتب کردہ گزٹیرز میں جابجا گلاؤٹھی کا ذکر کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ مقامی حریت پسندوں کے ہاتھوں انہیں بار بار ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا چنانچہ "بلند شہر سے پسپائی" (Abandonment of Buland shahr) کے عنوان کے تحت انگریز مورخ ضلع بلند شہر کے گزیٹر کے صفحہ ۱۷۰ پر لکھتا ہے۔

"گوروں کے چلے جانے کے ایک دن بعد ولیداد نے گلاؤٹھی سے

پولیس آؤٹ پوسٹ کو بھی ختم کر دیا تاہم مسٹر سپیٹ (انگریز فوجی کمانڈر) کی پارٹی ضلع میرٹھ میں ہاپوڑ (جو گلاؤٹھی سے نو میل کے فاصلہ پر واقع ہے) کے قریب بابو گڑھ کے مقام پر موجود رہی جہاں سے وہ روہیل کھنڈ کے باغیوں (حریت پسندوں) پر نظر رکھے ہوئے تھی ۱۸ جون کو گلاؤٹھی میں ولیداد کی آؤٹ پوسٹ کو پیچھے ہٹنا پڑا لیکن ۲۲ جون کو بریلی سے باغیوں (حریت پسندوں) کا ایک پورا بریگیڈ پہنچ گیا اور اس طرح یورپین فوج کو میرٹھ کی طرف ہٹنا پڑا چنانچہ میرٹھ آگرہ روڈ باغیوں (حریت پسندوں) کے قبضہ میں آگئی اور مالاگڑھ اردگرد کے باغیوں (حریت پسندوں) کا مرکز بن گیا۔ ولی داد نے علی گڑھ اور خورجہ پر قبضہ کرلیا اور ضلع بلند شہر میں بارہ بستی کے پٹھانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ مالا گڑھ کے قلعہ پر چھ توپیں نصب کر دی گئی تھیں جہاں سے پوری شاہراہ ان کی زد میں تھی اور جہاں سے کسی کو گزرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کیونکہ ایسا کرنے کی سزا موت تھی۔ ولیداد کی طاقت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اور وہ ایک بڑا دشمن بن چکا تھا۔ جھانسی بریگیڈ بھی اس سے آ ملا چنانچہ ستمبر میں جھانسی بریگیڈ کے ساتھ گلاؤٹھی میں گھمسان کی لڑائی ہوئی"۔

گلاؤٹھی کو چونکہ اس کتاب کا موضوع بنایا گیا ہے لہٰذا ایسے مستند حوالوں کا دیا جانا ضروری ہے جن سے اس بستی کے باسیوں کی ان عظیم قربانیوں کا علم ہوسکے جو تاریخ کی گرد میں روپوش ہوکر رہ گئی ہیں۔ یہ قصبہ کم و بیش نصف نصف ہندو مسلم آبادی پر مشتمل تھا لیکن تہذیبی' ثقافتی اور تمدنی اعتبار سے مسلمان ہمیشہ غالب رہے۔ یہی نہیں بلکہ جنگ آزادی تک خوشحالی بھی مسلمانوں کا مقدر بنی رہی لیکن جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی معاشی خوشحالی کو بدترین انتقام کی بھینٹ چڑھا دیا

گیا اور گن گن کر ان مسلمان گھرانوں بالخصوص سادات کو ان کے جائز اثاثوں اور جائیدادوں سے محروم کر دیا گیا۔ اس حقیقت کا اعتراف انگریز مورخ خود گزیٹیر کے صفحہ ۲۳۵ تا ۲۳۷ پر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> ''گلاؤٹھی کے سید سبزواری سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ محمد تغلق کے عہد میں یہ لوگ ترکستان میں سبزوار کے مقام سے یہاں منتقل ہوئے۔ اکبر کے عہد میں انہیں کثیر تعداد میں مالیہ معاف اراضیات عطا کی گئیں جو ۱۸۵۸ء تک ان کے ورثاء کے قبضے میں رہیں اور بغاوت کی سزا کے طور پر ضبط کرکے بھٹونہ کے جاٹوں کو دیدی گئیں۔ اس وقت وہ گاؤں جو ولیداد خاں کی ملکیت تھا اس کا نصف مہربان علی نے خرید لیا''۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کے گزیٹیر کی پانچویں جلد جو ضلع بلند شہر سے متعلق ہے اور جسے ایچ ۔ آر ۔ نیول (H. R. Nevill) آئی سی ایس نے ۱۹۰۳ء میں مرتب کیا اور جسکے اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۱۶ء، ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے ان میں گلاؤٹھی سے متعلق اگر کسی شخصیت کا ذکر ملتا ہے تو وہ گلاؤٹھی کے ممتاز سادات گھرانے کی مخیّر اور محب وطن شخصیت منشی سید مہربان علی ہیں جن کی رفاہی خدمات کا اعتراف انگریز مورخ کو بھی کرنا پڑا ہے۔ ان کے بارے میں مزید تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی۔ تاہم موجودہ سیاق و سباق میں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جہاں سرسید اور ان کے رفقاء نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ مسلمانوں کا انگریز سے مزید برسرپیکار رہنا ان کے مفاد میں نہیں ہے وہاں قصبہ گلاؤٹھی کی حد تک منشی سید مہربان علی نے بھی اسی حکمت عملی کو اپنایا۔ انہوں نے گلاؤٹھی کے مسلمانوں کی ضبط شدہ جائیدادیں خرید کر واگزار کرائیں اور انگریز حکمرانوں سے اس انداز سے مراسم استوار کئے کہ مسلمانوں کے خلاف ان کے غیظ و غضب میں کمی واقع ہو اور قصبہ میں امن و امان کے ساتھ

کالی ندی پر منشی مہربان علی کا تعمیر کرایا ہوا پل
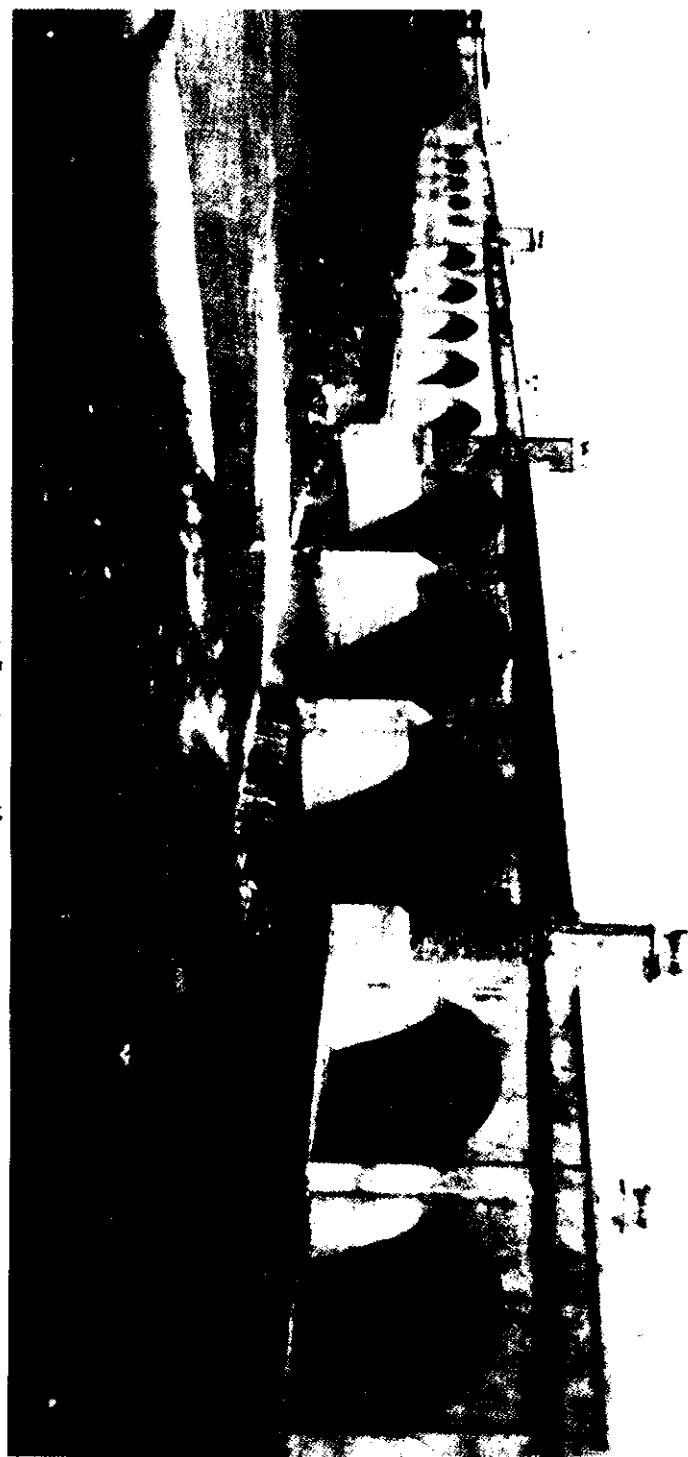
ساتھ معاشی اور معاشرتی زندگی بھی بحال ہو سکے۔ انہوں نے ایک طرف انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور دوسری طرف اس بے پناہ دولت و ثروت سے جس کے وہ اس وقت تک مالک بن چکے تھے' متعدد ایسے رفاہی کام کئے جن سے انگریز حکومت کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہاتھ بٹائے جانے کا احساس ہوا اور بیک وقت اہل قصبہ کو ان کی روزمرہ زندگی میں سہولتیں میسر آگئیں۔ بلند شہر سے ہاپوڑ اور میرٹھ جانے والی سڑک گلاؤٹھی سے گزرتی ہے۔ ایک ندی جو کالی ندی کے نام سے مشہور ہے گلاؤٹھی کے مقام پر ضلع بلند شہر میں داخل ہوتی ہے اور مشرق کی طرف تقریباً" ڈیڑھ میل تک بہتی ہے۔ برسات کے موسم میں ہمیشہ اس ندی میں سیلاب آتا اور قصبہ گلاؤٹھی کی زرعی معیشت کو تلپٹ کرکے رکھ دیتا۔ لوگوں کی معاش کا زیادہ تر دارومدار چونکہ زراعت پر تھا اس لئے ہر سال کی یہ تباہی ان کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ حکومت کا فرض تھا کہ اس سلسلہ میں انسدادی اقدامات کرتی لیکن انگریز حکومت کو خصوصاً" گلاؤٹھی کے باشندوں کے آلام و مصائب سے کوئی سروکار اس لئے نہ تھا کہ اس خطۂ زمین سے اسے جنگ آزادی کے دوران بے پناہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا چنانچہ منشی سید مہربان علی نے یہ فرض انجام دیا۔ انہوں نے کالی ندی تک سڑک کو پختہ کرایا اور انگریز مورخ کے مطابق تیس ہزار روپیہ کے خرچ سے کالی ندی پر ایک پل بھی تعمیر کرایا جو اس وقت کے انگریز حاکم مسٹر گراؤزے (Mr. Growse) کی خوشنودی کا بھی سبب بنا۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ بے شمار کنوئیں تعمیر کرائے جو یقیناً خلق خدا کی دعاؤں کا سبب بنے ہوں گے۔ گلاؤٹھی کے مسلمانوں کیلئے سب سے بڑا تحفہ منشی سید مہربان علی کی تعمیرکردہ وہ عظیم الشان مسجد اور ملحقہ دینی مدرسہ ہے جس کا افتتاح حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے دست مبارک سے ہوا اور جو آج تک سرچشمہ ء فیوض و برکات بنا ہوا ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں فارسی رسالہ "تذکرۃ الاقربا و شجرۃ الاولیاء" مولفہ ۱۲۷۴ھ کے مولف سید محمد حسینی واسطی کا بیان جنہوں نے رسالہ مذکورہ میں سادات گلاؤٹھی کے شجرہ ہائے نسب پر بحث کی ہے اور جو زیر نظر کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے قدرے مختلف ہے۔ ان کے بیان کے مطابق

مسجد مذکورہ جسے گلاؤٹھی کی جامع مسجد کی حیثیت حاصل ہے ایک پرانی مسجد کی تعمیر نو کا نتیجہ ہے جس کا اہتمام سادات گلاؤٹھی نے کیا۔ بہرحال واضح اور متعدد شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ مسجد مذکورہ کی تعمیر یا تعمیر نو منشی مہربان علی ہی کا کارنامہ ہے۔ اس سلسلہ میں مولف رسالہ مذکور نے قطعہ تاریخ بھی کہا جس کے اشعار درج ذیل ہیں۔

چہ سرائیم وصف ایں مسجد	کہ دگر مسجد قبا آمد
وچہ مسجد بود کہ ہر خشتش	بمحک زر اتقا آمد
کعبۂ حاجت خلائق ہست	قبلہ ء مقصد و دعا آمد
مسجد و صحن و چاہ شیر ینش	بطہور و بصد صفا آمد
نیست معلوم حال ایں مسجد	کر بہ عصر کہ پادشا آمد
لیک پیش سکونت سادات	ایں رفیع البنا بپا آمد
کہنہ گر دید گنبد و سقفش	شق بہ دیوار جابجا آمد
دل سادات رابہ ترمیمش	حسن توفیق رہنما آمد
صرف کردند ابیض و احمر	ہمہ را پیش حق جزا آمد
شکر للہ کہ بہتر از سابق	طرح ایں خانہ خدا آمد
بہر تاریخ او زعالم قدس	"یافت تعمیر نو" ندا آمد

۱۲۶۷ھج

قصبہ گلاؤٹھی کو چونکہ میرٹھ' بلند شہر اور علی گڑھ کے اضلاع میں جغرافیائی اعتبار سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اس لئے یہاں بھی ہمیشہ ان تحریکوں کے اثر و نفوذ کو محسوس کیا گیا جن میں برصغیر کے مسلمان پیش پیش رہے اور جنہیں صوبہ یوپی اور بالخصوص متذکرہ اضلاع میں پذیرائی حاصل ہوئی چنانچہ علی گڑھ تحریک' تحریک خلافت اور خاکسار تحریک کے علاوہ مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کی زیر قیادت پروان چڑھنے والی اور تاریخ ساز کامیابی سے ہمکنار ہونے والی تحریک پاکستان میں بھی اہل گلاؤٹھی کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اس سرزمین سے تعلق رکھنے والے ادیبوں'

شاعروں، صحافیوں، علماء و مشائخ اور سیاسی و سماجی کارکنوں اور اکابرین نے بھرپور کردار ادا کیا اور جن کی اولادیں آج بھی پاکستان میں مختلف حیثیتوں میں اہل ملک کی نظریاتی اساس ہی کو مستحکم و توانا رکھنے کا فریضہ انجام نہیں دے رہیں بلکہ انتظامی اور سیاسی و سماجی شعبوں میں بھی اپنی دانش و ذہانت، محنت و کاوش اور خلوص و بے لوثی کے ثبوت فراہم کرچکی ہیں اور کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں کوائف زیر نظر کتاب میں شخصیات کے باب میں بیان کئے گئے ہیں۔

علی گڑھ تحریک کو گلاؤٹھی میں پذیرائی حاصل ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ۱۸۰۳ء سے ۱۸۲۳ء تک ضلع بلند شہر کا نصف سے زائد حصہ ضلع علی گڑھ میں شامل تھا۔ ضلع بلند شہر کی موجودہ شکل ۱۸۲۳ء میں وجود میں آئی لیکن اس کے بعد بھی کافی عرصہ تک عدالتی اور دیگر انتظامی معاملات کیلئے ضلع بلند شہر علی گڑھ سے منسلک رہا۔ ویسے بھی ان دونوں اضلاع کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں چنانچہ علی گڑھ اور بلند شہر سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب رہے ہیں۔ مختلف حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید مرحوم اپنی تحریک کے سلسلہ میں گلاؤٹھی اور اس کے مضافات میں آئے اور یہاں کے مخیر حضرات سے مالی تعاون حاصل کیا۔ یہی نہیں بلکہ گلاؤٹھی سے حصول تعلیم کے لئے علی گڑھ جانے والے نوجوانوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا بلکہ گلاؤٹھی کے اکثر حضرات کو علی گڑھ ہی سے گریجویٹ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ فیض عام انٹر کالج میرٹھ، اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ اور مسلم ہائی سکول بلند شہر جیسی درسگاہیں بھی علی گڑھ کیلئے ہونہار طالب علموں کی نرسری کا کام کرتی رہیں جہاں تسلسل سے گلاؤٹھی کے نوجوان زیر تعلیم رہے۔

اسی طرح خاکسار تحریک کو بھی جو ہندو متعصب اور مسلح تنظیموں کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی گلاؤٹھی میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی چنانچہ راقم الحروف بھی اپنے حافظے میں محفوظ بچپن کی یادوں میں آجتک "چپ راست" کی صدائے

بازگشت سنتا ہے اور وہ دور آج بھی چشم تصور کے سامنے اسی طرح ترو تازہ ہے جب گلاؤٹھی کے نوجوان بیلچے سنبھالے خاکی ملبوس میں قصبہ کے گلی کوچوں میں منظم گشت کرتے تھے اور جس کی دہشت سے مقامی ہندو آبادی لرزہ براندام رہتی تھی۔ گلاؤٹھی میں خاکسار تحریک کا تعلق چونکہ مرکزی تنظیم سے بھی رہتا تھا اس لئے اہل گلاؤٹھی کو منشی مہربان علی کے تعمیرکردہ ایک محل میں خاکسار جیشوں (دستوں) کے قیام و میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ جہاں تک تحریک خلافت کا تعلق ہے دہلی، علی گڑھ اور مراد آباد چونکہ تحریک کے اہم مراکز تھے اور جو ضلع بلند شہر سے متصل تھے اس لئے گلاؤٹھی کی فضا اس تحریک سے بیحد متاثر تھی۔ راقم الحروف کے تایا قاضی سید سمیع اللہ مرحوم گلاؤٹھی کی خلافت کمیٹی کے چیئرمین تھے جن کی قیادت میں تحریک کا زور تیزی سے بڑھتا گیا بلکہ جسے گلاؤٹھی کے شعراء کے ولولہ انگیز کلام نے مہمیز عطا کی خصوصاً" جناب فدا گلاؤٹھوی مرحوم نے (راقم الحروف کے نانا) جو داغ دہلوی کے نورتنوں میں شمار ہوتے تھے اور قادر الکلام شاعر تھے۔ بیشمار ایسی نظمیں لکھیں جنہوں نے نوجوانوں کے خون کی گردش ہی کو تیز نہیں کر دیا بلکہ جذبہ شہادت کو بھی تازہ کر دیا۔ ان کا یہ شعر جو مولانا محمد علی جوہر سے منسوب منظوم خراج عقیدت کا عنوان تھا آج بھی اس عہد کو دیکھنے والے بزرگوں کے حافظے میں یقیناً محفوظ ہوگا۔

چشم بددور یہ ہیں بحر فنا کے غواص
موت کے گھاٹ اترتے نہیں مرنے والے

تحریک پاکستان کے سلسلہ میں گلاؤٹھی ہر چند کہ ایک ادنیٰ حیثیت میں تمام تر منظر کا صرف ایک حصہ ہے لیکن برصغیر کے مسلم اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کی طرح یہاں کے لوگوں کو بھی یہ عظیم اخلاقی امتیاز و افتخار حاصل ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ وہ مجوزّہ مملکت پاکستان کی جغرافیائی حدود میں شامل نہیں ہوسکیں گے انہوں نے تحریک پاکستان کو اپنے خون پسینہ کی خوشبو سے مہکائے رکھا اور ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی سے لیکر ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان پر منتج ہونے والی تحریک تک اہل گلاؤٹھی اپنے کردار و عمل کے باعث ہر مرحلہ پر سرخرو رہے ورنہ آج حصول آزادی کے بعد ایسے خطے اور

ان سے وابستہ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر چند کہ آزادی کے ثمرات سے پوری طرح فیض یاب ہو رہے ہیں لیکن تاریخ کے صفحات میں ان سے منسوب شرمندگی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ بقول محسن بھوپالی۔

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

قیام پاکستان کے بعد گلاؤ ٹھی پر زیر نظر کتاب مرتب کرنے کا جواز بھی یہی ہے کہ یہ خطہ بھی ان مسلم اقلیتی علاقوں میں شامل تھا جو مسلمانان برصغیر کیلئے ایک علیحدہ، آزاد و خودمختار مملکت کے حصول کی جدوجہد میں سرخرو ہوئے۔ اصل میں ان علاقوں کے مسلمانوں کو مسلم ریاست کے قیام سے اپنی ان آرزوؤں کی تکمیل دکھائی دیتی تھی جس کی تمنائیں ان کے دلوں میں مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہید بریلویؒ اور سید جمال الدین افغانیؒ کی اسلامی تحریکوں نے عرصہ دراز سے پیدا کر دی تھیں اور جن کا مرکز ہمیشہ مسلم اقلیتی علاقے رہے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے ہر چند کہ مسلم ریاست کا خاکہ قیام پاکستان سے سترہ سال قبل ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد سیشن میں پیش کیا لیکن حقیقت میں اس تصور کی بنیاد ستاون برس قبل ۱۸۹۰ء میں مولانا عبدالحلیم شرر رکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنی زیرادارت شائع ہونے والے رسالہ "مہذب" کی ۲۳ اگست ۱۸۹۰ء کی اشاعت میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر ہندو مسلم فسادات کا ذکر کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جو لوگ ہندوستان کی قوموں کو ایک بتاتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ چنانچہ مولانا نے لکھا:۔

"ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آگیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دل شکنی کئے نہیں پوری ہوتیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو مسلمان باہم تقسیم کرلیں اور اپنی آبادی علیحدہ کرلیں"۔

مولانا شرر کے مندرجہ بالا حوالے کا ذکر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنی کتاب "کاروان صحافت" میں کیا ہے جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا اور شریف الدین پیرزادہ نے بھی اپنی انگریزی کتاب "پاکستان کا ارتقاء" (Evolution of Pakistan) کے صفحہ ۵۸ پر مولانا شرر کے حوالے سے یہی کچھ تحریر کیا ہے۔ لیکن تقسیم ملک کا تصور قطعی اور واضح الفاظ میں ضروری توجیہات کے ساتھ پیش کرنے کا کام دہلی کے مشہور خیری برادران یعنی ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری نے جو پاکستان کے ممتاز و محترم قانون دان جناب حبیب الوہاب الخیری کے حقیقی تایا تھے، ۱۹۱۷ء میں علامہ اقبالؒ کے خطبہ الہ آباد سے بھی کم و بیش تیرہ سال قبل انجام دیا۔ اپنی کتاب "پاکستان کا ارتقا" کے صفحہ ۸۶ پر شریف الدین پیرزادہ لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری نے اپنے ایک تحریری بیان کے ذریعہ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے لگ بھگ ہندوستان کو مسلم اور ہندو انڈیا میں تقسیم کر دینے کا منصوبہ یورپ میں سٹاک ہوم (سویڈن) کے مقام پر سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس کے موقع پر پیش کیا جس کا خلاصہ کانفرنس کی روئیداد میں شامل ہے اور جس کا ثبوت اس مراسلت سے ملتا ہے جو مسٹر ایٹلی کی معرفت جو اس وقت لارڈ پریوی سیل تھے (تقسیم ہند کے وقت برطانیہ کے وزیراعظم) پروفیسر اے ایس خیری (دہرہ دون جیل میں اسیر) اور بلجیم کے مسٹر کیملے ہیو سمنز (Mr. Camille Huysmans) صدر سوشلسٹ انٹرنیشنل کے درمیان ہوئی"۔

۲۲ اگست ۱۹۴۱ء کو دہرہ دون جیل سے مسٹر ایٹلی کے نام لکھے جانے والے مراسلہ میں پروفیسر محمد عبدالستار خیری نے مکتوب الیہ سے یہ درخواست کی کہ چونکہ کیملے ہیو سمنز کا پتہ انہیں معلوم نہیں ہے اس لئے وہ ان کا مراسلہ ان تک پہنچا دیں

تاکہ وہ ان کی اس تحریری یادداشت کی تصدیق کرسکیں جو انہوں نے سوشلسٹ انٹرنیشنل کی سٹاک ہوم کانفرنس کے موقع پر ۱۹۱۷ء میں پیش کی تھی۔ اس تصدیق طلبی کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے مخالفین نے پاکستان کے مطالبہ پر ان پر برطانوی سامراج کی شہ پر ایسا کرنے کا الزام عائد کیا تھا حالانکہ یہ مطالبہ ۱۹۱۷ء ہی میں منظر عام پر آچکا تھا۔ پروفیسر خیری کے مکتوب میں اس طرف واضح اشارہ ملتا ہے تاہم اس مکتوب میں پروفیسر خیری نے جو اہم ترین بات کی اور جس کی تصدیق بعد میں مسٹر ایٹلی کی معرفت اپنے جوابی مکتوب میں مسٹر کمیلے ہیوسمنز نے کی اس کے تاریخی الفاظ یہ ہیں!

> ''ہندوستان کا واحد حل صرف یہ ہے کہ ہر یونٹ یعنی ہر دیسی ریاست اور برٹش انڈیا کے ہر صوبے کو حق خود ارادیت استعمال کرنے کی اجازت ہو تاکہ وہ اپنی پسند کا نظام حکومت چن سکیں اور اس کے بعد یہ یونٹ دو تین یا زیادہ یونٹوں کی فیڈریشن میں شامل ہوسکیں۔ نیز اگر وہ چاہیں تو متعدد یونٹوں کی یہ فیڈریشن ایک مزید وسیع تر فیڈریشن کا حصہ بن جائے ان میں سے بعض یونٹ رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے یورپ کی وسیع ترین ریاستوں سے بھی بڑے ہوں گے۔ ان خودمختار یونٹوں کے ذریعہ ایک طرح کی دولت مشترکہ ہند تشکیل پاسکے گی جس کے ہر یونٹ کو علیحدہ ہو جانے کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس سلسلہ میں کسی بھی قسم کے جبر یا دباؤ کو روا نہیں رکھا جانا چاہیے۔ اس طرح مسلم یونٹ اپنی علیحدہ فیڈریشن بنا سکیں گے اور اگر وہ اسے اپنے مفاد میں سمجھیں اور اس مقصد کیلئے ہندو ان میں اعتماد پیدا کرسکیں تو وہ وسیع تر فیڈریشن میں شامل ہوسکتے ہیں لیکن مسلمان بالجبر کسی بات کو ماننے پر تیار نہیں ہونگے''۔

قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے خطبہ الہ آباد کو خیری برادران

کے اس تصور نے یقیناً فکری پس منظر مہیا کیا ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ کابینہ مشن کی ۱۹۴۶ء کی تجاویز بھی اسی تصور کی مرہون منت معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ پاکستان کے عوام میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو مولانا شرر اور خیری برادران کے پاکستان کو تصوراتی بنیاد فراہم کرنے کے زبردست کارنامے سے واقف ہیں۔ ان حضرات کا تعلق بھی انہیں خطوں سے تھا جو مسلم اقلیتی علاقے تھے اور جہاں آزاد مسلم ریاست کا قیام ممکن نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ کے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد سے متعلق تو بعض حلقوں نے علامہ پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ الہ آباد کے اجلاس کے بعد اپنے بیان سے منحرف اور دستبردار ہوگئے تھے۔ اس الزام کا محرک تھامسن کو بتایا جاتا ہے جو مانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار کے طور پر دو بار ہندوستان آیا۔ اس نے اپنی کتاب (Inlet India For Freedom) میں اس بات کا انکشاف کیا اور ہندوستان کے سابق صدر راجندر پرشاد اور جواہر لعل نہرو نے بھی اس بات کو اپنی تحریروں میں اچھالا تاہم شریف الدین پیرزادہ نے اپنی کتاب "منزل بمنزل" میں اس الزام کی تردید کر دی ہے۔

یہ اندازہ لگانا کہ مسلم اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کا تحریک و تخلیق پاکستان میں کیا حصہ ہے قطعاً مشکل نہیں ہے کیونکہ یہ علاقے اور ان سے وابستہ مسلم زعماء از اول تا آخر ہر مرحلہ پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء کے ڈھاکہ اجلاس میں مسلم لیگ کا آئین بنانے کیلئے ۶۲ افراد پر مشتمل جو کمیٹی بنائی گئی تھی ان میں اکثریت ان حضرات کی تھی جو بہار، اودھ (لکھنؤ) آگرہ، کاٹھیاواڑ، گجرات، بمبئی، مدراس، اڑیسہ اور سی پی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کمیٹی کے جائنٹ سیکرٹری نواب محسن الملک تھے۔ مسلم لیگ کے کل اکتیس (۳۱) سالانہ اجلاس ہوئے۔ پہلا اجلاس ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ اور آخری اجلاس دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں منعقد ہوا۔ ان اجلاسوں میں چند کے سوا باقی تمام اجلاس لکھنؤ، الہ آباد، بمبئی، پٹنہ، مدراس، علی گڑھ، احمد آباد، ناگپور اور آگرہ میں منعقد ہوئے۔ یہی صورت حال مسلم لیگ کے قیام کے سلسلہ میں شملہ وفد میں نظر آتی ہے جو لارڈ منٹو سے ملنے گیا تھا اس میں بھی زیادہ تر اراکین مسلم

اقلیتی علاقوں سے شامل تھے۔ اسی طرح ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت جب انتخابات ہوئے تو مسلم اقلیتی صوبوں نے مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا جبکہ مسلم اکثریتی صوبوں میں یعنی پنجاب' سندھ' صوبہ سرحد اور بنگال میں مسلم لیگ کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلم لیگ کو کل ۴۸۴ نشستوں میں صرف ۱۰۸ مسلم نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ پنجاب کی ۸۴ نشستوں میں سے صرف دو نشستیں بمشکل حاصل ہوسکیں جبکہ صوبہ سندھ کی ۳۵ اور سرحد کی ۳۸ نشستوں میں سے مسلم لیگ کو ایک نشست بھی نہ مل سکی۔ ظاہر ہے کہ اس ناکامی کی بڑی وجہ صرف یہ تھی کہ مسلم اکثریتی صوبوں کے اکابرین انگریزوں اور ہندوؤں کے زیراثر تھے اور اپنے ذاتی مفادات پر مشترکہ نصب العین کو نقصان پہنچانے میں پیش پیش رہے۔ اس کے برخلاف اقلیتی صوبے ایسے مواقع پر اپنے ذاتی مفادات کو ملی مفادات پر قربان کرنے سے کبھی پیچھے نہیں رہے کہ تاریخ یہی کچھ بتاتی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف محمد حسام الدین غوری نے اپنی کتاب ''مسلمانوں کی سیاسی تنظیم'' میں بھی کیا ہے۔

> ''مسلم اکثریتی صوبے انگریزوں اور ہندوؤں کے آلہ کار بنے ہوئے تھے۔ مسلم اقلیتی صوبوں نے مسلم لیگ کی حمایت کرکے ہندوستان کی تحریک آزادی اور حصول پاکستان کی منزل کو قریب تر کر دیا۔ جس کا اعتراف قائداعظم نے بارہا کیا اور اس تاریخی حقیقت کو خاص طور پر مسلم لیگ کی کونسل کے آخری اجلاس منعقدہ دہلی (۱۹۴۶ء) میں بیان کرکے اس بات کی ضمانت دی تھی کہ ہم مسلم اقلیتی صوبوں کے احسانات' ان کے ایثار اور بے مثال قربانی کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ انشاء اللہ ان کے لئے پاکستان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے اور اس کی توانائیاں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی فلاح اور بہبود کیلئے وقف رہیں گی''۔

زیر نظر کتاب میں موضوع کے اعتبار سے صرف متعینہ حدود ہی میں متعلقہ مواد

پیش کیا جاسکتا ہے لیکن گلاؤٹھی بھی چونکہ ان جغرافیائی خطوں میں شامل ہے جو تشکیل پاکستان کے ذمہ دار ہیں لہٰذا راقم الحروف ہی کیا کوئی بھی مورخ ان کے سیاسی کردار کو جس کی تمامتر بنیاد عظیم اخلاقی اقدار پر قائم ہے نظرانداز نہیں کرسکتا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد پر منعقد ہوئے قصبہ گلاؤٹھی شہید ملت لیاقت علی خاں کے حلقہ نیابت میں شامل تھا اور انہیں کامیاب بنانے کیلئے اہل قصبہ نے صرف اپنی حدود ہی میں نہیں بلکہ تمام حلقہ میں جس طرح سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی وہ نہ صرف ان کی کامیابی پر منتج ہوئی بلکہ لیاقت علی خاں مرحوم کو پاکستان کی مملکت اسلامیہ کا پہلا وزیراعظم بننے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات جنوری ۱۹۴۶ء میں ہوئے اس میں بھی مسلم لیگ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہر چند کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں دوسری جماعتیں چند نشستیں لینے میں کامیاب ہوگئیں لیکن مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلم لیگ کو سو فیصد کامیابی حاصل ہوئی جبکہ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں جو دسمبر ۱۹۴۵ء میں منعقد ہوئے سو فیصد کامیابی ہوئی کل مسلم نشستیں تیس (۳۰) تھیں ان سب پر مسلم لیگ نے قبضہ کیا جبکہ قائداعظم کے مقابلے میں حسین بھائی لال جی اور دوسرے امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں۔

تازہ خواہی داشتن گرداغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے بازخواں ایں قصہ ء پارینہ را

گلاؤٹھی

اکثر دیکھا گیا ہے کہ قصبوں' شہروں اور دیہات کے ناموں کے پس منظر میں ایک تاریخ ہوتی ہے۔ یہ نام اکثر شخصیتوں سے بھی منسوب ہوتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اہم تاریخی واقعہ ان کے نام کا سبب بن جاتا ہے۔ بہرحال یہ نام اپنا کوئی نہ کوئی پس منظر ضرور رکھتے ہیں' چنانچہ گلاؤٹھی کے بارے میں بھی نام کے حوالے سے مختلف روایات ملی ہیں جن کے بارے میں باقاعدہ تصدیق تو ممکن نہیں ہوسکی البتہ ہر روایت میں قرین قیاس عناصر موجود ہونے کے باعث انہیں پر انحصار کیا جا رہا ہے۔

نام

گلاؤٹھی میں خاندان سادات کے ایک فرد سید محمد حسینی واسطی نے ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ فارسی زبان میں ایک رسالہ بعنوان "تذکرۃ الاقرباء و شجرۃ الاولیاء" تالیف کیا جس سے مولف کے نہایت ذہین' صاحب علم اور دقیقہ رس سکالر ہونے کا تاثر ملتا ہے۔ انہوں نے اس رسالہ میں منجملہ دیگر امور کے گلاؤٹھی کے اہل سادات کے شجرہ ہائے نسب پر جامع بحث کی ہے نام کے سلسلہ میں موصوف لکھتے ہیں:

"یہ قصبہ دہلی کے مشرقی جانب دو منزل پر واقع ہے۔ اس کی آب و ہوا معتدل ہے اور یہاں کے ساکن صاحب کمال۔ عام

خیال یہ ہے کہ نویں صدی ہجری نبویؐ میں شیر شاہ یا سلیم شاہ کے دور حکومت میں ایک افغانی گلاب خاں نے اسے اپنے نام پر آباد کرکے اس کا نام "گلاب بسی" رکھا تھا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ اور زبان کی تبدیلیوں کے باعث بعد میں یہ گلاب بسی کا نام تبدیل ہوکر گلاؤٹھی ہوگیا۔ چونکہ یہاں کے سادات کرام کو جاگیریں عطا ہوئیں اور یہاں کی سکونت انہوں نے مستقل اختیار کرلی اور افغانوں کے مال و ثروت میں کمی آنا شروع ہوئی اس لئے قصبہ کا نام "سادات پور" پڑگیا"۔ (ترجمہ)

مولف موصوف نے جو کچھ لکھا وہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے البتہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ "سادات پور" نام رکھے جانے کے بعد دوبارہ اس قصبہ کو گلاؤٹھی کے نام سے کیوں یاد کیا جانے لگا۔ بہرحال یہ ممکن ہے کہ "سادات پور" کا نام زیادہ عرصہ زبان زد خاص و عام نہ رہا ہو اور لوگوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوبارہ گلاؤٹھی کہنا شروع کر دیا ہو۔

دوسری روایت بلند شہر کے ضلع گزٹ سے ملتی ہے۔ انگریز مورخ لکھتا ہے کہ میواتی گلاؤٹھی کے اصل مالکان تھے اور یہ قصبہ انہوں نے آباد کیا لیکن ایک اور روایت کے مطابق گلاؤٹھی کا نام "گہلوٹ" راجپوتوں سے ماخوذ ہے۔ بہرحال انگریز مورخ کی بیان کردہ روایت قرین قیاس سہی لیکن خاصی تشنہ اور نامکمل ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ اس سلسلہ میں ہمیں مزید معلومات حاصل ہوتیں لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔

محلِ وقوع

گلاؤٹھی جو ضلع بلند شہر کا ایک اہم قصبہ ہے دریائے گنگا اور جمنا کے دو آبے میں واقع ہے یعنی مشرق میں دریائے گنگا اور مغرب میں دریائے جمنا بہتے ہیں۔

دریائے گنگا کے پار مراد آباد اور بدایوں کے اضلاع واقع ہیں اور جمنا کے دوسری طرف دہلی اور گڑگانواں' شمال میں ضلع میرٹھ اور غازی آباد واقع ہیں۔ غازی آباد کو تقسیم ملک کے بعد ضلع کا درجہ دیدیا گیا تھا اور جنوب میں علی گڑھ واقع ہے۔ کالی ندی مشرق میں تقریباً" ڈیڑھ میل تک بہتی ہے اور گلاؤٹھی ہی کے مقام پر ضلع بلند شہر میں داخل ہوتی ہے۔ یہ ندی ضلع کی زرعی معیشت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ گلاؤٹھی میرٹھ سے علی گڑھ اور آگرہ جانے والی مشہور شاہراہ پر قصبہ ہاپوڑ اور بلند شہر کے درمیان واقع ہے۔ بہت بڑی تجارتی منڈی ہے اور ہاپوڑ سے خورجہ جانیوالی ریلوے لائن کا سٹیشن بھی ہے۔ قصبہ کے جنوب مغرب سے ایک سڑک سکندر آباد جاتی ہے اور دوسری مشرق میں گلاؤٹھی کو سیانہ سے ملاتی ہے۔ سکندر آباد والی سڑک کے جنکشن کے قریب ہی فوجی پڑاؤ کا ایک میدان ہے جو شاہراہ اعظم کے مغرب میں واقع ہے۔ جنوب ہی میں تھوڑے فاصلے پر ایک پی ڈبلیو ڈی کا بنگلہ ہے۔ گلاؤٹھی کے بازار میں دو طرف سے راستے آتے ہیں جو تیسری سڑک میں مل جاتے ہیں۔ قصبہ کا بڑا بازار جنوبی نصف حصہ میں واقع ہے۔ قصبہ کم و بیش ایک درجن سے زیادہ محلوں پر مشتمل ہے جو اکثر و بیشتر اپنے بانیوں کے نام سے منسوب ہیں مثلاً محلّہ قاضی فیض اللہ' شرافت اللہ' مہربان پورہ وغیرہ۔ اکثر باغات اور زرعی اراضیات وغیرہ جنوب میں واقع ہیں۔ دریائے گنگا سے ایک ڈسٹریبیوٹری نکالی گئی ہے جسے گلاؤٹھی ڈسٹری بیوٹری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو قصبہ کے شمال مشرق پر محیط ہے۔ بیشتر علاقہ زرخیز ہے اور نہری پانی فراوانی کے ساتھ دستیاب ہے۔

شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ شاہراہ اعظم جو گرانڈ ٹرنک روڈ یا جی ٹی روڈ کے نام سے مشہور ہے اور جو پشاور سے کلکتہ تک معہ دہلی بے شمار شہروں کو ملاتی ہے چونکہ گلاؤٹھی سے بھی گزرتی ہے اسلئے اس قصبہ کو جغرافیائی اور تاریخی اہمیت حاصل ہونے کے اسباب میں یہ ایک سبب بھی شامل ہے۔ ضلع کے بڑے قصبوں یعنی شکارپور' جہانگیر آباد' سیانہ اور اورنگ آباد کی طرح مقامی انتظام و انصرام کیلئے گلاؤٹھی میں بھی ایک ٹاؤن کمیٹی قائم ہے۔ جسے لوکل ٹیکس لگانے کا اختیار حاصل ہے۔ ان

محاصل کے ذریعہ سڑکوں کی مرمت، تعلیم اور علاج معالجہ کے مصارف پورے کئے جاتے ہیں۔

آب و ہوا

آب و ہوا کے اعتبار سے گلاوٹھی کو موسموں کا خطہ کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہاں گرمی، سردی اور برسات ہر موسم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ موسموں کی یہی خوبی ہے کہ یہاں سردیوں میں سوائے دسمبر اور جنوری کے موسم تقریباً" اعتدال پر رہتا ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقوں جیسی لو، سردی نہیں ہوتی البتہ موسم سرما خاصا پرلطف گزرتا ہے۔ اسی طرح گرمی بھی سوائے مئی، جون اور جولائی کے مہینوں کے جن میں گرم ہوائیں یعنی لو بھی چلتی ہے۔ بالعموم معتدل رہتی ہے اور لوگ تر و تازہ رہتے ہیں البتہ بارشیں خوب ہوتی ہیں جو عموماً" جون کے آخری ہفتہ میں شروع ہو جاتی ہیں اور اکتوبر تک وقفہ وقفہ سے جاری رہتی ہیں گلاوٹھی میں برسات کا موسم اس قدر خوبصورت ہوتا ہے کہ گھر گھر جھولے پڑ جاتے ہیں اور لوگ آموں کے باغات کی کثرت کے سبب آموں سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں گلاوٹھی اور مضافات میں برسات کے حوالے سے ایک مخصوص عوامی کلچر کے خدوخال واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

گلاوٹھی اور مضافات

گلاوٹھی کے ریلوے سٹیشن، پولیس سٹیشن اور ڈاکخانے سے وابستہ دیہات و مواضعات کو ہم گلاوٹھی کے مضافات قرار دیں گے جن میں گلاوٹھی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ گلاوٹھی کا شمار ضلع و تحصیل بلند شہر میں ہوتا ہے اور پرگنہ اگوتہ ہے۔ انتظامی حدود کی یہ تقسیم انگریزوں کے وقت ہی سے نافذ چلی آتی ہے۔ پرگنہ اگوتہ ضلع کا زرخیز ترین علاقہ ہے۔ اس پرگنہ کے چار دیہات کے علاوہ باقی علاقہ گلاوٹھی کے

سادات اور دوسری ذات برادریوں پر مشتمل ہے۔ پرگنہ اگوتہ کا واحد قصبہ گلاؤٹھی ہے لیکن اس کے علاوہ چند بڑے دیہات بھی ہیں مثلا برال' بھٹونہ' احمد نگر' سینٹہ اور مالا گڑھ۔ اگوتہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جسے پرگنہ کا صدر مقام بنایا گیا ہے۔ پرگنہ کے مغربی نصف حصے میں ذرائع آمدورفت بہتر ہیں کیونکہ شمال سے جنوب کی جانب پختہ سڑک ہے جو بلند شہر سے ہاپوڑ اور میرٹھ جاتی ہے اور گلاؤٹھی سے گزرتی ہے۔ گلاؤٹھی ہی میں اس سڑک سے چھوٹی سڑکیں نکلتی ہیں اور ایک سڑک سکندر آباد جاتی ہے البتہ پرگنہ کے مشرقی نصف حصے میں سڑکیں برائے نام ہیں جس کی وجہ کالی ندی ہے۔ اس ندی پر گلاؤٹھی کے قریب پل تعمیر کیا گیا ہے جہاں سے ایک چھوٹی سڑک سیانہ اور دوسری سڑک گلاؤٹھی سے اورنگ آباد جاتی ہے۔

گلاؤٹھی میں پہلی بار ۱۸۸۷ء میں ایک شفاخانہ (ڈسپنسری) بھی قائم ہوا جس کا انچارج ایک ہاسپٹل اسسٹنٹ کو بنایا گیا۔ گلاؤٹھی میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے پرائمری اور مڈل سکولوں کے علاوہ ہندو مسلمانوں کے علی الترتیب قائم کردہ دیوناگری (ڈی این) اور مفید عام کالج اور سکول بھی ہیں۔ قصبہ چودہ محلوں پر مشتمل ہے جو اپنے بانیوں کے نام سے منسوب ہیں۔ ایک سرائے بھی ہے جو ۱۸۴۸ء میں پلاؤڈن نامی انگریز نے بنائی اور اسی کے نام سے منسوب ہوئی۔ قصبہ کے بیشتر مکانات پختہ ہیں البتہ کچے مکانات بھی ہیں۔ قصبہ تقریباً" ڈھائی ہزار ایکڑ رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ تین چوتھائی رقبہ مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ گلاؤٹھی ڈسٹری بیوٹری کی وجہ سے جسے دریائے گنگا کی ایک نہر سے نکالا گیا ہے قصبہ میں آبپاشی کی کوئی دشواری نہیں۔ اس کے علاوہ کنوؤں سے بھی آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۹ء کے ترمیمی ایکٹ کے تحت گلاؤٹھی میں ٹاؤن ایریا کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا چیئرمین عوام کا منتخب کردہ غیرسرکاری شخص ہوتا ہے جو بڑی حد تک اپنے فرائض آزادانہ طور پر انجام دیتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ وہ تمام دیہات و مواضعات جو گلاؤٹھی کے پولیس سٹیشن' ریلوے سٹیشن اور ڈاکخانے سے وابستہ ہیں انہیں گلاؤٹھی کے مضافات شمار کیا

گیا ہے ان کا مختصر سا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے کیونکہ یہ علاقے بھی اک طرح گلاؤٹھی ہی کا حصہ ہیں اور مجموعی طور پر گلاؤٹھی کی سیاسی' سماجی' معاشی اور تہذیبی و ثقافتی فضا مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سینٹہ

یہ موضع اپنے محل وقوع کے اعتبار سے گلاؤٹھی سے بالکل متصل ہے اور درمیان میں صرف کالی ندی واقع ہے اور بنیادی طور پر سادات ہی کی بستی ہے۔ اس کی تاریخی اور سماجی حیثیت کے پیش نظر بلند شہر کے ضلع گزٹ میں جو انگریز مورخین کا مرتب کردہ ہے کم سے کم تین مختلف مقامات پر ذکر ملتا ہے۔ صفحہ ۷۶-۷۵ پر درج ہے کہ سینٹہ بلند شہر کے شمال میں بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ چوہان راجپوت جو اپنا نسب پرتھوی راج سے وابستہ کرتے ہیں اس کی حکومت ختم ہونے کے بعد یہاں آباد ہوئے۔ بعد کے برسوں میں ان میں سے ایک مسلمان ہوگیا جسے پرگنہ اگوتہ میں بتیس (۳۲) دیہات پر مشتمل جاگیر عطا ہوئی جو بعد میں "چوہانوں کا بتیسہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے بعد صفحہ نمبر۱۷۱ پر بھی یہی بتایا گیا ہے کہ اکبر کے عہد سے پہلے یہ علاقہ "چوہانوں کا بتیسہ" کہلاتا تھا اور عہد اکبری میں اسے پرگنہ کی حیثیت دی گئی تھی۔ سینٹہ کی یہ حیثیت مرہٹوں کے دور تک قائم رہی جنہوں نے وہاں اپنا ایک عامل مقرر کیا تھا تاکہ چوہانوں کو قابو میں رکھا جاسکے لیکن اس افسر نے اگوتہ میں قیام کیا اور اس طرح اگوتہ پرگنہ قرار پایا۔

سینٹہ کے بارے میں انگریز مورخین صفحہ نمبر ۲۸۸ پر مزید لکھتے ہیں کہ یہ گاؤں گلاؤٹھی میرٹھ شاہراہ کے دو میل مشرق میں کالی ندی کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ ماضی میں یہ گاؤں اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اکبر کے عہد میں یہ پرگنہ کا صدر مقام رہا البتہ مرہٹوں نے اپنے دور میں پرگنہ کا صدر مقام سینٹہ سے اگوتہ منتقل کر دیا۔ ابتدا" یہ گاؤں چوہانوں کی ملکیت تھا لیکن بعد میں حقوق ملکیت سبزداری سیدوں کے

ہاتھ آئے۔ انہیں سبزواری سادات میں سے ایک شخص جہانگیر علی کو عہد اکبری میں ۱۴۰۰ بیگہ زمین (مالیہ معاف) عطا ہوئی اور یہ ملکیت زمیندار فیض علی تک جاری رہی۔ یہ موضع ۱۰۹۵ ایکڑ رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ گلاؤٹھی ڈسٹری بیوٹری سے آبپاشی حاصل کی جاتی ہے' کنویں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بستی زراعت پیشہ سیدوں' چوہانوں' جاٹوں اور چماروں پر مشتمل ہے۔

ضلع بلند شہر میں بالعموم میرٹھ اور مظفر نگر کے اضلاع کی نسبت سیدوں کی تعداد کم ہے لیکن سینٹھ میں بھی گلاؤٹھی اور ضلع کے دیگر قصبات و مواضعات کی طرح سماجی و تمدنی برتری سادات ہی کو حاصل رہی ہے۔ یہ سادات حسینی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی رضوی' نقوی اور زیدی حضرات بھی ہیں۔ سینٹھ اور گلاؤٹھی کے سید صاحبان کو ضلع گزٹ میں سبزواری قرار دیا گیا ہے جو غیاث الدین تغلق کے عہد میں ترکستان کے مقام سبزوار سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ بہرحال سادات ہی میں ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوئیں جو اپنے علم و فضل اور غیرمعمولی بصیرت و آگہی کے سبب محترم گردانی گئیں اور جن کا اعتراف دور دور کیا گیا۔ سینٹھ میں ایسا ہی ایک خاندان سادات زیدی کا تھا جن کے ایک بزرگ سید فرزند علی زیدی تھے جن کا سلسلہ نسب ابو الفضل بن ابوالفرح واسطی سے ملتا ہے۔ ان کے بھائی حکیم سید عبدالغفور اپنے عہد کے ممتاز طبیب تھے اور ان کا تعلق قلعہ دہلی سے تھا۔ سرسید احمد خاں بھی ایک بار سید فرزند علی صاحب سے تعلق کی بنا پر سینٹھ تشریف لائے۔ بہرحال خاندانی امتیاز کے اس سلسلہ کو حکیم سید تہور علی نے اور بھی چار چاند لگائے جو سید فرزند علی کے پوتے اور سید انوار الحق کے فرزند تھے۔ انہوں نے طبیہ کالج علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بلند شہر میں مطب قائم کیا اور تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے لئے اس قدر کام کیا کہ بلند شہر کی تاریخ میں یادگار ہو کر رہ گیا۔

گٹھاؤلی

سو ڈیڑھ سو مکانات پر مشتمل اس چھوٹے سے گاؤں کے مغرب میں گلاؤٹھی واقع ہے جبکہ مشرق میں بلند شہر اور شمال مغرب میں سینٹھہ آباد ہے۔ اس گاؤں کو بھی اپنے مکینوں کے جاہ و حشمت اور روحانی مراتبت کے سبب شہرت بھی حاصل ہے اور عظمت بھی۔ اصل میں اولیائے کرام کا مسکن ہونے کے حوالے سے گٹھاؤلی کا پرانا نام "کوٹھا ولی" تھا جو آج بھی اللہ کے ولیوں کی سرزمین کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔ مغلیہ عہد سے اس خطے کو شہرت حاصل ہونا شروع ہوئی چنانچہ اس دور کی عیدگاہ کی عمارت کے آثار آج بھی گٹھاؤلی میں موجود ہیں۔

حضرت خواجہ قطب الدین جو بخارا سے ہجرت کرکے یہاں سکونت پذیر ہوئے ان کا لگایا ہوا "اندھیریا باغ" آج بھی ماضی کی یاد تازہ کئے ہوئے ہے۔ گٹھاؤلی کو آباد کرنے کا سہرا حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے عہد میں کرمان سے آنے والے دو بزرگوں کے سر ہے جو حقیقی بھائی بھی تھے۔ بڑے بھائی کا نام محمود شاہ اور چھوٹے بھائی کا نام تیفور شاہ تھا۔ یہ دونوں حضرات جید بزرگ اور مادر زاد ولی تھے۔ تیفور شاہ کا مزار گٹھاؤلی ہی میں ہے بلکہ ان کے صاحبزادے سید احمد کرمانی کا ذکر ضلع بلند شہر کے گزٹ میں بھی ملتا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ انہیں "مالامل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مالاگڑھ گاؤں کا نام بھی انہیں سے منسوب ہے۔ سید احمد کرمانی کا مزار بھی گٹھاؤلی ہی میں واقع ہے۔ ان کے تین صاحبزادوں میں سے ایک شاہ ابّن نے ایک شادی گٹھاؤلی ہی میں کی چنانچہ ان کی اولاد بھی یہیں آباد ہوئی البتہ شاہ ابّن کا مزار امروہہ میں ہے۔ آج بھی گٹھاؤلی میں مسجد کے سامنے چوپال میں املی کا درخت ان کے حوالے سے یادگار ہے۔ ایک روایت کے مطابق شاہ ابّن نے مسواک کرکے زمین میں گاڑی دی اور کہا کہ یہاں املی کا درخت اگے گا۔ لوگوں کو یقین نہ آیا لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے کا یہ درخت آج بھی موجود ہے جو گرم و سرد زمانہ سے ہر طرح محفوظ رہا۔

گھاؤلی کی اکثر آبادی مسلمانوں پر مشتمل رہی ہے جن میں سادات کی غالب اکثریت تھی جو تعلیم یافتہ اور زمیندار پیشہ تھے۔ مختصر ترین بستی ہونے کے باوجود یہاں کے باسیوں میں کئی پی ایچ ڈی اور متعدد گریجویٹ و پوسٹ گریجویٹ ملیں گے جبکہ اس گاؤں کے سرسبز و شاداب ماحول کو موروں جیسے خوبصورت جانوروں کی موجودگی نے اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں جن کا رقص آنے جانے والوں کی نگاہوں کا مرکز بنا رہتا ہے۔

مالا گڑھ

گلاؤٹھی کے قرب میں واقع مالاگڑھ بھی تحصیل و ضلع بلند شہراور پرگنہ اگوتہ کا ایک گاؤں ہے جسے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حریت پسندوں کا مرکز ہونے کے سبب بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ پرگنہ اگوتہ کے انتہائی جنوب میں واقع ہے جبکہ کالی ندی جس کا اصل نام انگریز مورخ کے مطابق کالندی تھا گاؤں کی مغربی سرحد پر واقع ہے۔ بلند شہر سے فاصلہ تقریباً" چار میل ہے۔ یہ گاؤں اپنے رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے تو کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں تاہم تاریخی اعتبار سے بیحد اہم ہے۔ مالاگڑھ کا قدیم نام "راٹھورا" تھا جو گوروُدا راجپوتوں کی ملکیت تھا جن سے یہ گاؤں ایک خٹک پٹھان حق داد خاں نے خرید لیا تھا جو مرہٹوں کے برسراقتدار آنے سے کچھ عرصہ قبل برن (بلند شہر) کا عامل تھا' اس نے وہاں گنج (منڈی) اور مٹی سے ایک قلعہ تعمیر کرایا جو گاؤں کے مغرب میں واقع ہے۔ اسی نے اس گاؤں کا نام سید محمد کرمانی جنہیں "مالا مل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور جن کا مقبرہ قریبی گاؤں گھاؤلی میں واقع ہے' ان سے منسوب کرتے ہوئے مالاگڑھ رکھا۔ اس کے بعد حق داد خاں کے بیٹے بہادر خاں نے گاؤں پر حق ملکیت کا دعویٰ کیا اور چھتیس (۳۶) دوسرے دیہات کے ساتھ یہ گاؤں بھی پانچ ہزار روپیہ سالانہ کے ٹھیکہ پر لے لیا۔ ۱۸۲۴ء میں بہادر خاں کا انتقال ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی یہ ٹھیکہ بھی ختم ہوگیا تاہم بہادر خاں کے چھوٹے بیٹے اور

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک عظیم المرتبت ہیرو ولی داد خاں کی ملکیت میں دوسرے مواضعات کے ساتھ یہ گاؤں بھی آگیا۔ ولی داد خاں کو ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک جاری رہا۔ یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ولی داد خاں کی بھانجی کی شادی مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے فرزند مرزا جواں بخت سے ۱۸۵۲ء میں انجام پائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب انگریزوں کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا تو ولی داد خاں کو مغل شہنشاہ کی جانب سے برن (بلند شہر) اور کول (علی گڑھ) کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ سقوط دہلی کے بعد اسے بلند شہر میں انگریز کرنل کے ہاتھوں شکست ہوئی اور مالاگڑھ میں اس کے قلعہ کو زمیں بوس کر دیا گیا۔ چھتاری کے نواب محمود علی خاں نے کیونکہ انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لئے مالاگڑھ کے حقوق انہیں دیدیئے گئے۔ ولیداد خاں کو مالاگڑھ سے فرار ہونا پڑا۔ سید معین الحق نے اپنی انگریزی کتاب "۱۸۵۷ء کا عظیم انقلاب" میں لکھا ہے کہ ولی داد خاں بلند شہر سے بریلی پہنچے اور وہاں مئی ۱۸۵۸ء میں شہر پر انگریزوں کے قبضہ تک بہادر خاں کے ساتھ رہے اور اس کے بعد وہ روپوش ہوگئے۔ بتایا جاتا ہے کہ دس سال بعد وہ بنجارہ کا بھیس بدل کر مالاگڑھ آئے اور وہاں سے اپنے مدفون خزانے لے گئے۔ اس کے بعد کے حالات معلوم نہیں۔

مسلم راجپوتوں کے مواضعات

سینٹھ گٹھاؤلی اور مالا گڑھ کے علاوہ متعدد دیہات و مواضعات بھی ایسے تھے جو گلاؤٹھی کے ڈاک خانے۔ پولیس سٹیشن اور ریلوے سٹیشن سے وابستہ تھے ان میں سے اکثر کی معاشرتی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ایک ہی برادری کے لوگ کثرت سے آباد تھے جنہیں "جھوجہ برادری" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ نہایت محنتی، جفا کش، ذہین اور ترقی پسند رجحانات کے حامل تھے چنانچہ ان حضرات میں سے بیشتر نے مختلف شعبوں میں نمایاں حیثیت حاصل کی جب کہ جھوجہ برادری تعلیم سے دلی وابستگی کے سبب تیزی سے ترقی کرتی رہی ۔ اسی برادری کے ایک فرد ملا نجیب اللہ خاں

بلند شہر میں وکالت کرتے تھے انھوں نے اپنے پیشہ میں بلند مقام اور امتیاز حاصل کیا انھوں نے اپنی آمدنی سے کئی گاؤں خریدے یہی وجہ تھی کہ ان کا شمار بلند شہر کے روساء میں ہوتا تھا انھوں نے ملکی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا ان کا انتقال ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو بلند شہر میں ہوا ان کے صاحبزادے مولوی علیم الدین خاں نے بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور باپ کی طرح وکالت میں نام پیدا کیا یہی نہیں بلکہ وکالت کا یہ سلسلہ آگے بھی چلا اور ان کے فرزند شمیم احمد خان نے بھی جو راقم الحروف کے مسلم ہائی سکول بلند شہر میں ہم جماعت تھے علی گڑھ سے ایم اے ایل ایل بی کرنے کے بعد وکالت شروع کی تاہم ان کا رجحان سیاست کی طرف زیادہ رہا جس کے نتیجہ میں وہ تقسیم ملک کے بعد صوبہ یو پی میں غذا سپلائی اور انڈسٹری کے نائب وزیر بھی رہے۔ بہر حال اس برادری کے افراد کے باصلاحیت ہونے میں کوئی شک نہیں یہی وجہ تھی کہ انہیں جھوجہ کہا جانے کے خلاف ایک احساس کمتری پیدا ہوگیا اور وہ اس لفظ کو معیوب سمجھنے لگے یہ بھی درست ہے کہ سماجی اعتبار سے اس وقت کے معاشرہ میں انہیں کم تر مقام کا حامل سمجھا جاتا تھا چنانچہ اسی نفسیاتی صورت حال کے ردعمل کے طور پر پاکستان آنے کے بعد اس برادری کے ایک فاضل رکن میجر (ریٹائرڈ) رفیع الدین باور نے "برن سے بنوں تک" نام سے ۱۹۸۶ء میں راولپنڈی سے ایک کتاب شائع کی جس میں اس برادری کے بارے میں تفصیل سے کوائف مہیا کیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اصل میں یہ جھوجہ برادری نہیں بلکہ جنجوعہ راجپوت برادری ہے ہمارے نزدیک زیر نظر کتاب کے سیاق و سباق میں اس بحث کی کوئی اہمیت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نے "مسلم راجپوتوں کے مواضعات" کا ذیلی عنوان قائم کر کے اپنے قارئین کو متعلقہ معلومات فراہم کرنا چاہی ہیں۔

"برن سے بنوں تک" کے مولف نے لکھا ہے کہ دہلی سے جنوب مشرق کی جانب قریب چالیس میل کے فاصلے پر بلند شہر کے گرد ونواح میں شاہراہ اعظم جو دہلی کو علی گڑھ اور آگرہ سے ملاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ اور قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر

کے گرد و نواح میں ہاپوڑ سے بلند شہر جانے والی سڑک کے دونوں جانب کوئی پچیس ۲۵ مواضعات پر مشتمل ایک برادری آباد ہے یہ لوگ مسلم راجپوت ہیں نقشہ دیکھنے سے یہ بھی صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ برادری دوحلقوں میں آباد ہے یعنی مواضعات جیت پور، بھیکن پور، علی پور، احمد نگر، مرشد پور، ہردے پور، اکبر پور خورد، اینچانہ کورانہ، موڑی اور دیولی خورد وغیرہ دوسرا حلقہ ضلع کے صدر مقام بلند شہر کے اطراف میں اندازاً چھ سات میل کے علاقے میں آباد ہے یعنی مواضعات برال دیولی۔ (کاظم پور) کمال پور۔ اکبر پور کلاں۔ موکھیڑا۔ اڑھولی۔ دریا پور۔ مرغوب پور۔ صفدر پور۔ کیتھرہ۔ املیا۔ تاج پور اور ننگلہ وغیرہ ایسے دیہات جہاں سے قربت کے باعث گلاؤٹھی روز آمد ورفت کا سلسلہ رہتا ہے کم و بیش گلاؤٹھی ہی کے فطری معاشرتی و معاشی ماحول کا حصہ بن گئے ہیں ان میں مرشد پور جو ہاپوڑ سے گلاؤٹھی آنے والی پختہ سڑک کے بائیں جانب واقع ہے اور ہردے پور جو ہاپوڑ گلاؤٹھی ریلوے لائین کے بائیں طرف واقع ہے تقریباً تمام تر ہی مسلم راجپوت برادری پر مشتمل ہیں اسی طرح عبداللہ پور موڑی جو گلاؤٹھی سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ہے اور اکبر پور خورد جو مشرقی کالی ندی اور ریلوے لائن کے درمیان موضع موڑی سے شمال مشرق کی جانب آباد ہے اپنے باسیوں کی کثرت آمدورفت کے باعث گلاؤٹھی ہی کے سماج کا حصہ بن گئے ہیں ان مواضعات کی آبادی بھی مسلم راجپوتوں پر مشتمل ہے البتہ عبداللہ پور موڑی میں میواتی مسلمانوں کی تعداد نصف سے کچھ کم ہے۔ بلند شہر کے مشہور وکیل ملا نجیب اللہ خان کا تعلق بھی اکبر پور خورد ہی سے تھا جہاں تک موضع اینچانہ کورانہ اور دیولی خورد کا تعلق ہے یہ بھی گلاؤٹھی سے ڈیڑھ سے تین میل کی حدود میں واقع ہیں موضع اینچانہ قصبہ گلاؤٹھی سے ہندو جاٹوں کے مشہور گاؤں میرپور جانے والی پختہ سڑک پر مشرقی کالی ندی کے کنارے آباد ہے گلاؤٹھی سے فاصلہ اندازاً دو میل ہے پختہ سڑک کی وجہ سے آمد ورفت میں آسانی کے سبب گلاؤٹھی کے کچھ ہندو باشندوں نے یہاں زمین خرید کر باغات لگائے ہیں تاہم آبادی میں ہندو اکا دوکا سے زیادہ نظر نہیں آتے موضع کورانہ بھی گلاؤٹھی سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع

ہے اور دیولی خورد جو سکندر آباد جانے والی سڑک کے نزدیک واقع ہے گلاؤٹھی سے دو میل سے زیادہ دور نہیں۔

تاریخی پس منظر

بلند شہر کے عین قرب میں واقع ایک اہم قصبہ کی حیثیت سے گلاؤٹھی کا تاریخی پس منظر اصل میں ضلع کی اجتماعی تاریخ ہی کا ایک حصہ ہے بلکہ دہلی سے پچاس میل کی حدود میں واقع ہونے کے سبب سے بھی گلاؤٹھی ہمیشہ ان تمام تحریکوں سے متاثر رہا ہے جن کا منبع و مرکز دہلی تھا اور جو برصغیر کا صدر مقام ہونے کی نسبت تاریخ کے مختلف ادوار میں نزدیک و دور کے واقعات کا ہدف بنا رہا ہندوستان کے دیگر شمالی علاقوں کی طرح ضلع بلند شہر کی تاریخ بھی مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے محمود غزنوی کا عہد ۹۹۷ء سے ۱۰۳۰ء تک محیط ہے۔ ۱۰۲۴ء میں وہ سومناتھ پر آخری بار حملہ آور ہوا انھیں حملوں کے دوران جب ۱۰۸۸ء میں محمود غزنوی برن (بلند شہر) کے نواح میں پہنچا تو اس وقت یہاں راجہ ہردت حکمران تھا اس کی ریاست گلاؤٹھی ہاپوڑ اور میرٹھ کے ملحقہ علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی اور بلند شہر جو اس وقت برن کے نام سے موسوم تھا اس کی راجد ھانی تھا اس دور کا اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ راجہ ہردت محمود غزنوی اور اس کے ساتھیوں کے حسن سلوک رواداری اور عالی ظرفی سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ اپنی دس ہزار رعایا کے ساتھ مسلمان ہو گیا اور اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ علاقہ پہلی بار اسلام کی روشنی سے منور ہوا لیکن محمود غزنوی کے چلے جانے کے بعد ہندوؤں کے قبضہ میں اس لئے آ گیا کہ محمود وہاں کوئی باقاعدہ حکومت قائم نہیں کر سکا تھا۔ یہاں تک کہ جب شہاب الدین غوری کا سپہ سالار قطب الدین برن پر حملہ آور ہوا تو اس وقت یہاں راجہ چندرسین حکمران تھا چندرسین نے بھرپور مقابلہ کیا لیکن قطب الدین کی منظم و تربیت یافتہ فوج کے سامنے اسے پسپائی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ خود بھی اس معرکہ میں ہلاک ہو گیا اس کے بعد چندرسین کے ایک رشتہ دار جے پال نے قطب الدین سے صلح کر لی یہی نہیں بلکہ وہ

خود اور رعایا کے بیشتر افراد مسلمان ہو گئے چنانچہ اس خاندان کے لوگ اب بھی ضلع بلند شہر میں آباد ہیں اور اکثر و بیشتر زرعی اراضیات کے مالک ہیں۔

خاندان تغلق جس کے آٹھ بادشاہوں کی حکمرانی ۱۳۲۰ء سے ۱۴۱۴ء تک رہی اسی کے ایک بادشاہ محمد شاہ تغلق نے ۱۳۴۳ء میں بلند شہر پر حملہ کیا جس کا ذکر قاضی ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں کیا ہے تغلقوں کا عہد اس علاقے میں ایک اور دور کے آغاز کا سبب ثابت ہوا چودھویں صدی عیسوی اس علاقے کی تاریخ میں خاص واقعات کی حامل ہے کیونکہ اس صدی میں مختلف فرقوں کے لوگ دوسرے علاقوں سے آکر ضلع بلند شہر میں آباد ہونا شروع ہو گئے تاہم اس علاقے میں مکمل امن و سکون صرف مغلوں کے عہد میں قائم ہو سکا جس کا سہرا مغلوں کی مستحکم حکومت کے سر ہے۔ اس سلسلہ میں اکبر اور اس کے جانشینوں کا دور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں دیگر علاقوں کی طرح بلند شہر اور مضافات میں بھی لوگوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا البتہ ۱۷۰۷ء میں بہادر شاہ اول کی تاجپوشی کے ساتھ ہی مغل عہد حکومت کا زوال شروع ہوا اور ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح بلند شہر اور اس کے گرد و نواح کے علاقے بھی افراتفری کا شکار ہو گئے۔

بلند شہر اور گردونواح کے علاقے اٹھارہویں صدی عیسوی میں علی گڑھ کے زیر انتظام رہے جسے اس زمانے میں کول کہا جاتا تھا اور اس علاقے پر مرہٹوں کی حکومت تھی انہوں نے کول ہی کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے علی گڑھ کے قلعہ پر قبضہ کر کے اس کے گرد و نواح کے علاقے کو ضلع علی گڑھ کا نام دیا اور بلند شہر اور اس کے مضافات کو جس میں گلاؤٹھی بھی شامل تھا اس میں شامل کر دیا موجودہ ضلع بلند شہر کا کچھ علاقہ انگریزوں نے ۱۸۰۱ء میں نواب وزیر والئی اودھ سے اپنے قبضہ میں لے لیا اور بیس سال تک بلند شہر کا علاقہ علی گڑھ کے زیر انتظام رکھا۔ تاہم ۱۸۲۳ء میں اس کو ایک الگ ضلع کی حیثیت دے دی گئی اور اس طرح موجودہ

ضلع بلند شہر وجود میں آیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم سے پہلے ضلع میں تحصیلوں کے صدر مقام یعنی بلند شہر انوپ شہر سکندر آباد اور خورجہ میں میونسپل کمیٹیاں قائم تھیں اور بڑے بڑے قصبوں بشمول گلاؤٹھی میں ٹاؤن کمیٹیاں قائم تھیں جو لوکل انتظام کی ذمہ دار تھیں ان کے باقاعدہ الیکشن ہوتے تھے اور انہیں لوکل ٹیکس لگانے کا اختیار تھا جس سے سڑکوں کی مرمت تعلیم اور علاج معالجے کی ضروریات پوری کی جاتی تھیں۔

مغلوں کے دور میں اس علاقے نے دارالحکومت دہلی کے نزدیک ہونے کی وجہ سے تہذیبی ثقافتی اور تعلیمی میدانوں میں بہت ترقی کی البتہ مغلوں کے آخری دور میں ضلع میں بد نظمی کے باعث ان شعبوں میں انحطاط ہوا۔ انگریزوں نے جن حالات میں اور جن طریقوں سے اپنا اقتدار قائم کیا اس کے نتیجہ میں بھی انگریزوں کے خلاف عدم تعاون اور نفرت کی فضا پیدا ہوئی جس کے باعث یہ علاقہ انگریزی طرز تعلیم سے بڑی حد تک محروم رہا۔ خصوصاً" مسلمانوں کو یہ احساس تھا کہ انگریزوں نے انہیں حکومت اور اختیارات سے محروم کیا ہے اس سے وہ انگریزوں کی ہر چیز سے متنفر رہے ان حالات میں سرسید مرحوم نے اپنی تحریک کے ذریعہ مسلمانوں میں حقائق کا سامنا کرنے کا شعور بیدار کیا اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ بعد کے برسوں میں یعنی تقسیم کے وقت تک ضلع کا تعلیمی معیار بہتر ہو گیا تھا قریب قریب ہر بڑے قصبے میں ایک اردو مڈل سکول تھا گلاؤٹھی میں بھی مڈل سکول کے علاوہ ہندوؤں نے ایک سکول دیوناگری سکول کے نام سے قائم کر لیا تھا اور مسلمانوں نے اپنے تعلیمی ادارہ کی بنیاد مفید عام سکول کے نام سے رکھی یہ ادارہ میرٹھ کے فیض عام کالج کے طرز پر قائم کیا گیا جو آج تک مقامی مسلمان آبادی کی تعلیمی ضرورتیں پوری کر رہا ہے اور ایک تسلیم شدہ کالج کا درجہ حاصل کر چکا ہے بلند شہر میں بھی ایک گورنمنٹ ہائی سکول کے علاوہ دو تین پرائیویٹ ہائی سکول تھے جن میں ایک مسلم ہائی سکول تھا جو گلاؤٹھی اور گرد ونواح کے مسلمان طالب علموں کے لیے بڑی کشش کا باعث تھا دو انٹر کالج تھے ایک خورجہ میں اور ایک لکھاؤٹی میں البتہ اس وقت تک ضلع میں ڈگری کالج کوئی نہیں تھا زیادہ تر طلباء ڈگری کی تعلیم کے لیے یا تو میرٹھ

جاتے تھے یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

انگریز مورخ نے بھی ضلع گزٹ میں اس علاقہ کی قدیم تاریخ مختصرا" بیان کی ہے اور طبقات ناصری کے حوالے سے لکھا ہے کہ التمش بھی برن اور اس کے مضافات کا گورنر رہا اور ۱۲۹۸ء میں علاء الدین اپنے چچا جلال الدین فیروز شاہ کے قتل کے بعد برن (بلند شہر) آیا اور اس جگہ کو اس نے اپنا صدر مقام بنالیا ۱۳۲۴ء میں تخت نشین ہونے کے بعد محمد بن تغلق نے برن پر فوج کشی کی اور وحشیانہ قتل عام کیا لوگوں کے سر قلعہ کی دیوار پر رکھوادیئے تاکہ آبادی دہشت زدہ ہو سکے۔ تاہم اس کے بھتیجے فیروز تغلق نے جو اس کے بعد تخت نشین ہوا رعایا سے نرمی کا سلوک کیا فیروز گنج خورجہ میں اس کی ایک یادگار بھی قائم ہے فیروز کی وفات کے دس سال بعد تیمور نے ۱۳۹۸ء میں حملہ آور ہو کر تباہی مچادی ہاپوڑ گلاوٹھی اور برن (بلندشہر) کی طرف لوٹ مار کرنے والوں کے گروہ کے گروہ روانہ کئے گئے۔

ضلع گزٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ ۱۴۰۷ء میں ابراہیم شاہ آف جونپور نے دہلی کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے برن پر بھی قبضہ کر لیا تاہم اگلے ہی برس یعنی ۱۴۰۸ء میں محمود غزنوی نے دہلی سے روانہ ہو کر برن میں جونپور کی فوج کو شکست دی اور انھیں قلعہ میں محصور کر دیا ۱۴۳۴ء میں مبارک شاہ کے قتل کے بعد جب دربار کے امراء میں جنگیں شروع ہوئیں تو سنبل کے ایک لودھی ملک اللہ داد کا کانے برن پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کے خلاف بغاوت برپا ہوئی تو اس وقت برن پر برانڈ سپیٹ (Brand Spate) حکمران تھا اس نے ضلع کے بڑے زمینداروں کو افواج مہیا کرنے کا حکم دیا تاکہ باغیوں کو کنٹرول کیا جا سکے چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل کرنے والوں میں کچیر کا راؤ گلاب سنگھ۔ چھتاری کے محمد علی خاں۔ پہاسو کے مراد علی خاں خانپور کے عبداللطیف خاں اور شکار پور کے کچھمن سنگھ شامل تھے لیکن ولیداد خاں کی قیادت میں منظم ہونے والے گلاوٹھی اور دیگر علاقوں کے حریت پسندوں نے انگریزوں کے جاہ و حشم کو خاک میں ملا دیا یہ الگ بات کہ اپنوں کی غداری اور وسائل کی کمی

کے باعث آزادی کی وہ منزل جو ۱۸۵۷ء ہی میں حاصل ہو جاتی تھی نوے ۹۰ سال بعد ۱۹۴۷ء میں میسر آئی۔

۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہ خبر ملنے پر کہ علی گڑھ میں تعینات رجمنٹ نے بغاوت کر دی ہے برن کا انگریز کمانڈر برانڈ سپیٹ میرٹھ فرار ہو گیا بعد میں دوسرے یورپین افسران بھی فرار ہو کر اس سے جا ملے انقلابیوں نے جیل کو توڑ ڈالا اور قیدیوں کو آزاد کرالیا تمام دفتری ریکارڈ پر قبضہ کر لیا اور پھر دہلی کا رخ کیا۔ سپیٹ ۲۵ مئی کو بلند شہر واپس آگیا اور مشتبہ لوگوں کو سزادی اس دوران میں انقلابیوں نے سکندر آباد پر قبضہ کر لیا جو بلند شہر کے مغرب میں آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے گوروں کے چلے جانے کے بعد باغی فوجیوں نے ایک بار پھر سپیٹ کی پوزیشن کو غیر مستحکم کر دیا ادھر والی مالا گڑھ اور شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے قرابت دار ولی داد خاں نے دہلی کی انقلابی حکومت کے نمائندہ کے طور پر خود کومنوانا شروع کر دیا۔ جب انقلاب کا آغاز ہوا تو ولی داد خاں دہلی میں تھے چنانچہ بادشاہ نے دو آب کے علاقوں پر حکمرانی کی سند عطا کر دی ولی داد خاں ۲۶ مئی کو دہلی سے روانہ ہوئے اور دادری سے جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اپنی فوج میں مقامی لوگوں کی ایک خاصی تعداد بھرتی کرلی ادھر گلاؤٹھی میں جو بلند شہر سے زیادہ دور نہیں ہے سپیٹ نے اپنی حکمرانی قائم کرنا چاہی لیکن اسے وہاں اہل گلاؤٹھی کے ہاتھوں شکست سے دو چار ہونا پڑا اور اسے گلاؤٹھی سے نکال دیا گیا۔ اس طرح بلند شہر تمام تر انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

تقریباً" چار ماہ تک بلند شہر اور علی گڑھ کے اضلاع اور مضافات ولیداد خاں کے زیر نگیں رہے انھوں نے نہ صرف اپنے علاقوں کا نظم و نسق بخوخوبی چلا یا بلکہ دوسرے انقلابی رہنماؤں کے ساتھ بھی وقت ضرورت تعاون کیا ملحقہ علاقوں پر ولیداد خاں کازبردست اثر تھا جس کے نتیجہ میں مالا گڑھ نزدیک و دور کے لوگوں کی آماجگاہ بن گیا تھا خورجہ اور علی گڑھ پر انقلابیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور خاص طور پر بارہ بستی کے مذہبی ذہن رکھنے والے مسلمان جوق در جوق بغاوت میں حصہ لے رہے تھے اس

طرح ولیداد خاں نے انگریزوں کے طاقتور دشمن کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور وہ تحریک حریت کی علامت بن گئے تھے۔ ولیداد خاں بہادر خاں کے فرزند تھے جن کے سپرد شہنشاہ دہلی نے بلند شہر کی حکمرانی کی تھی بہادر خاں نے مالا گڑھ میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا تھا جو کالی ندی کے کنارے واقع تھا اور بلند شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا اسی وقت سے یہ قلعہ اس خاندان کا مورچہ بن گیا تھا۔

ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں سقوط دہلی کے ساتھ ہی دو آب کے علاقے میں انقلابیوں کا جذبہ متاثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنرل ولسن نے بلند شہر کی طرف فوج کا ایک دستہ روانہ کیا تین دن بعد یہ دستہ سکندر آباد پہنچا جسے ۲۶ ستمبر کو انقلابی خالی کر چکے تھے تاہم اگلے روز جب یہ دستہ بلند شہر کے قریب ایک چوراہے پر پہنچا تو انقلابی شہر سے باہر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے ملے' پیدل دستے باغات کی دیواروں کے ساتھ ساتھ صف بند تھے اور انھوں نے اپنی توپیں کھیتوں میں کھڑی فصلوں میں چھپائی ہوئی تھیں انگریزوں کے دستے نے انقلابیوں پر زبردست گولہ باری شروع کر دی چنانچہ انقلابیوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں شہر کے اندر داخل ہونا مناسب سمجھا اس دوران میں سرائے اورجیل سے برطانوی دستوں پر زبردست فائرنگ کی گئی لیکن برطانوی دستے آگے بڑھتے گئے اور آخر کار شہر میں داخل ہو گئے اور گلی کوچوں میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی چنانچہ جنگ بلند شہر میں جو بھرپور انداز میں لڑی گئی فریقین کا بھاری نقصان ہوا۔ برطانوی کمانڈر گریٹ ہیڈ ۳ اکتوبر کو بلند شہر سے روانہ ہو کر اسی روز بعد دوپہر خورجہ پہنچا ادھر حریت پسندوں نے مالا گڑھ کا مضبوط قلعہ خالی کر دیا برطانوی فوجیوں نے یکم اکتوبر کی بعد دوپہر قلعہ کو اڑادیا۔ تاہم لیفٹیننٹ ہوم جس نے قلعہ کو چنگاری دکھائی تھی مارا گیا۔

سقوط بلند شہر کے بعد حریت پسندوں کی جائیدادوں کی ضبطی کے ساتھ ساتھ انھیں پھانسی دینے کی سزاؤں کا سلسلہ بھی شروع ہوا ولیداد خاں بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے بلند شہر میں ایک آم کے درخت کے ساتھ جو بعد میں کالا آم کے نام سے

مشہور ہوا بے شمار حریت پسندوں کو لٹکا کر پھانسی دی گئی اسی موقع پر گلاؤ ٹھی کے ایک معزز خاندان سادات کے فرزند سید برکت اللہ کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی ان کا قصور بھی یہ تھا کہ وہ حریت پسند تھے اور جہاد آزادی میں حصہ لیا تھا۔ آزادی کی خوں ریز تحریک میں ولی داد خاں کے ایک ساتھی اور معاون حاجی یاد اللہ خاں نے جو گلاؤ ٹھی میں بحیثیت پولیس افسر تعینات تھے زبردست کردار ادا کیا انہوں نے اپنی خدمات انقلابی حکومت کے سپرد کر دی تھیں انہوں نے تحریک آزادی میں پوری جاں سپاری کے ساتھ حصہ لیا چنانچہ انھیں بھی انقلاب کی ناکامی کے بعد گرفتار کر لیا گیا اور ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔

۱۸۵۷ء تحریک آزادی کی ناکامی کے ساتھ ہی ایک حاجی یاد اللہ خاں ہی کیا بلکہ ہر وہ مسلمان جس نے انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تھا بدترین اور انسانیت سوز مظالم کا شکار بنا دیا گیا یہی نہیں بلکہ شبہات کے زمرے میں آنے والوں کو بھی نہیں بخشا گیا اور انھیں سنگین ترین سزائیں دی گئیں وہ علاقے جو حریت پسندوں کے مراکز سمجھے جاتے تھے معمولی شہری سہولتوں تک سے محروم کر دیئے گئے خاص طور پر مسلمانوں پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا گیا اس حقیقت کا اعتراف پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح میں ان الفاظ میں کیا

"ہندوؤں کی نسبت مسلمان برطانوی حکمرانوں کے مظالم کا زیادہ نشانہ بنے"

پی ہارڈی نے بھی اپنی کتاب "برطانوی ہند کے مسلمان" میں جو ۱۹۷۲ء میں کیمرج یونیورسٹی پریس سے چھپی ظاہر دہلوی کی کتاب "داستان غدر" کے حوالے سے لکھا ہے کہ برطانوی سپاہیوں نے ہر اس شخص کو گولی کا نشانہ بنانا شروع کر دیا جو سر راہ مل جاتا تھا میاں محمد امین پنجہ کش اور مولوی امام بخش صہبائی کو ان کے دو بیٹوں کے ساتھ گرفتار کر کے راج گھاٹ گیٹ لیجایا گیا اور وہاں انہیں گولی کا نشانہ بنانے کے بعد ان کی نعشوں کو دریائے جمنا میں بہا دیا گیا۔ یہ وہی مولوی امام بخش صہبائی عظیم شاعر و مصنف تھے جو گلا ؤ ٹھی کے محمد حسین یقین (صاحب دیوان) کے شاعری میں

اسناد تھے غرض افراتفری کا وہ بازار گرم ہوا کہ لوگوں نے ادھر ادھر بھاگ کر روپوش ہونے اور جان بچانے کی تدبیریں کرنا شروع کر دیں گلاؤٹھی کے متعدد خاندان اس دار وگیر سے بچ نکلنے کے لیے ترک سکونت کر کے ملک کے مختلف علاقوں میں چلے گئے انگریزوں کے خلاف بغاوت میں کیونکہ سادات گلاؤٹھی کا کردار خاصا نمایاں رہا تھا اس لیے ان کی وہ جائیدادیں جو انھیں مغل حکمرانوں سے اعتراف خدمات کے طور پر ملی تھیں نہ صرف ضبط کر لی گئیں بلکہ بیشتر خاندانوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا گیا اور وہ خوشحالی جو کبھی مسلمانوں اور خاص طور پر سادات کا مقدر تھی اسے بد ترین معاشی بد حالی میں تبدیلی کر دیا گیا چنانچہ گلاؤٹھی کے سادات میں سے کئی حضرات ترک سکونت کر کے گوشہ گمنامی میں چلے گئے ان میں سے بعض تو مختلف ریاستوں میں چلے گئے جہاں اپنی محنت و صلاحیت کی بنا پر بعد میں اہم مقام حاصل کئے اور بعض ہمیشہ کے لیے غریب الوطنی کی گرد میں روپوش ہو گئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب گرد بیٹھنا شروع ہوئی تو دوسرے علاقوں کی طرح گلاؤٹھی میں بھی زندگی معمول پر آنا شروع ہو گئی صورت حال کی سنگینی میں کمی آنے کا سبب سر سید احمد خاں کی کاوشیں تھیں جو انھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو نئے حالات سے سمجھوتہ کر لینے اور دوسری طرف انگریز حکمرانوں کو عام مسلمان رعایا کے بے گناہ ہونے کے بارے میں باور کرانے کے لیے انجام دیں انھوں نے ۱۸۵۹ء میں رسالہ "اسباب بغاوت ہند" اور ۱۸۶۰ء میں انگریزی تصنیف "ہندوستان کے وفادار مسلمانوں کا حوال (An Account of Layal Mohammadans of India) مرتب کر کے انگریزوں کے ہیجانہ غیض و غضب کو بڑی حد تک کم کیا اور اس کے نتیجے میں معاشرہ میں جو نئی تبدیلیاں آئیں ان کے طفیل مسلمانوں کو تمدنی برتری تو حاصل رہی لیکن معاشی خوشحالی میں نمایاں کمی آ گئی یہی حال گلاؤٹھی کا تھا کہ قصبہ میں تقریباً نصف نصف ہندو مسلم آبادی ہونے کے باوجود سماجی برتری اور تمدنی فضیلت مسلمانوں ہی کو حاصل تھی اور اس تمام منظر میں سب سے نمایاں اہل سادات تھے جن کی چھوٹی چھوٹی زمینداریاں ان کی تاریخی وضعداریوں کو قائم رکھے ہوئے تھیں ہم

ورجا کے اس ماحول میں وہ گھرانے جو غیر ملکی حکمرانوں کی نفرت کو دل سے نہ نکال سکے وہ کشمکش کا شکار رہے البتہ وہ خاندان جنھوں نے نوشتہ دیوار پڑھ لیا وہ زندگی کی دوڑ میں رواں دواں ہو گئے بعد کے ان خاندانوں کا سرخیل ہم گلاؤٹھی کے منشی سید مہربان علی کو کہہ سکتے ہیں جنھوں نے سرسید کی طرز پر اپنی حکمت عملی وضع کر کے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا جس کا سماجی و معاشی فائدہ بحیثیت مجموعی اہل گلاؤٹھی کو بھی حاصل ہوا۔ سرسید مرحوم نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں کے دینی عقائد اور پختہ مذہبی رجحانات انگریزوں کی حکمرانی کی حقیقت کو دل سے تسلیم کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں مذہبی عنوانات پر بھی تحریروں کا سلسلہ شروع کیا جس کا دوسرے علاقوں کی طرح اہل گلاؤٹھی نے بھی نوٹس لیا ان تحریروں میں سرسید کی تفسیر القرآن (۹۵-۱۸۸۰) سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے جس کے ذریعہ بین السطور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ اپنی ماہیئت کے اعتبار سے مغربی فکر تمام تر غیر اسلامی نہیں سرسید کی یہی کوشش ان کے رسالے "تہذیب الاخلاق" کی اکثر تحریروں سے واضح ہے چنانچہ یہ کہنا تو شاید بالکل درست نہ ہو کہ گلاؤٹھی کی حد تک مسلمانوں نے سرسید کی ان کوششوں کے اثرات قبول کر لیے تھے البتہ حالات سے مفاہمت کئے بغیر کیونکہ اور کوئی چارہ کار تھا ہی نہیں اس لیے انگریز کے خلاف دلوں میں نفرت کی چنگاری تو بدستور سلگتی رہی تاہم انگریز کی علی الاعلان مخالفت میں کمی آگئی اسی دوران ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو سرسید نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (Mohammadan Anglo Oriental College) کا آغاز کیا اور ۱۸۸۱ء میں سول سروس کی تربیتی کلاسیں شروع کیں تاکہ خواہشمند مسلمان سرکاری ملازمین استفادہ کر سکیں اسی طرح ۱۸۸۷ء میں علی گڑھ کالج میں انجینئرنگ کالج روڑکی میں داخلہ کے لیے مسلمان طلباء کو تیاری کرانا شروع کی گئی گلاؤٹھی سے راقم الحروف کے تایا قاضی سید سمیع اللہ پہلے مسلمان طالب علم تھے جو رڑکی کالج سے فارغ التحصیل ہوئے بعد میں دیکھتے ہی دیکھتے مغربی تعلیم سے استفادہ کا رجحان اہل گلاؤٹھی میں بڑھتا چلا گیا اور بیشتر نوجوان علی گڑھ کالج اور بعد میں مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل

ہوئے یہی نہیں بلکہ سر سید نے ۱۸۸۶ء میں جس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نامی تعلیمی اور سیاسی تنظیم کی بنیاد رکھی تھی اس کے اثرات بھی مسلمانوں میں محسوس ہونے لگے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں میں نئی اقدار حیات کا شعور بیدار ہونا شروع ہو گیا یہ علی گڑھ تحریک ہی کا فیضان تھا کہ اس کی آغوش میں تحریک پاکستان نے پرورش پائی جس میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا علی گڑھ میں گلاؤٹھی کے بیشتر طلبا تعلیم حاصل کر چکے تھے اور بعد میں آنے والوں نے بھی تحریک پاکستان کے لیے دن رات کام کیا ان میں سید اختر عالم واسطی پسر قاضی سید سمیع اللہ (راقم الحروف کے تایا) نے پاکستان کے موضوع پر متعدد کتابچے شائع کیے اور تحریک کے دوران تصور پاکستان کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا۔

دوسری طرف اہل گلاؤٹھی میں مذہب سے وابستگی کا احساس بدستور ترو تازہ رہا جس کو دہلی کے شمال مشرق میں نوے میل پر واقع ضلع سہارنپور میں قصبہ دیوبند کے مقام پر ۱۸۶۷ء میں قائم ہونے والی دینی و مذہبی درسگاہ نے اور بھی جلا بخشی جسے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ (۸۰۔۱۸۳۲ء) اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۹۰۵۔۱۸۲۸ء) کی گرانقدر کاوشوں اور عظیم مدبرانہ و عالمانہ صلاحیتوں کے نتیجہ میں ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ "دارالعلوم" کا مقام و منصب حاصل کرنے کا اعزاز نصیب ہوا۔ گلاؤٹھی کے بیشتر اصحاب نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور علم کی اس روشنی کو اپنے مولدومنشاء قصبہ گلاؤٹھی تک پہنچایا' چنانچہ گلاؤٹھی میں بھی "منبع العلوم " کے نام سے دینی درسگاہ قائم ہوئی جس کا افتتاح حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے مبارک ہاتھوں سے ہوا اورجسے گلاؤٹھی کی جامع مسجد (تعمیرشدہ ۱۲۶۷ھ) سے وابستہ کیا گیا ان اہم واقعات یعنی مسجد کی تعمیر نو اور دارالعلوم کے قیام کا سہرا بھی منشی مہربان علی کے سرہے جنھوں نے اور بھی متعدد فلاحی کام سرانجام دیئے۔

منبع العلوم گلاؤٹھی نے جس کی نشوونما دارالعلوم دیو بند کے خطوط پر کی گئی بلکہ جس کے استاد بھی دیوبند کے فارغ التحصیل جید علماء و فضلاء تھے دیکھتے دیکھتے شہرت

حاصل کر لی گلاؤٹھی میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان گھرانہ ہو جس کے نوجوان منبع العلوم میں زیر تعلیم نہ رہے ہوں بلکہ اس درسگاہ میں اقامتی سہولتیں ہونے کے باعث بیرونی ممالک کے طلباء بھی یہاں تسلسل سے تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں یہ دینی درسگاہ جو آج بھی قائم و دائم ہے بدستور مقامی و بیرونی طلباء کے لیے منبع فیضان بنی ہوئی ہے گلاؤٹھی میں اس دینی درسگاہ اور دیوبند کے دارالعلوم نے اپنے اثرات مقامی سیاست پر بھی مرتب کیے۔ علمائے دیوبند چونکہ انڈین نیشنل کانگرس سے وابستہ رہے اس لیے منبع العلوم گلاؤٹھی کے اساتذہ و طلباء بھی بالعموم اسی سیاسی فکر سے وابستہ رہے جس کے نتیجہ میں گلاؤٹھی میں سیاسی طورپر مسلمانوں میں دو واضح مکاتیب فکر پیدا ہوئے دینی مدارس سے وابستہ تعلیم یافتہ حضرات کانگریسی ذہن کے مالک تھے جب کہ باقی مسلم آبادی مسلم لیگی ہونے کے ناطے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر یقین و اعتماد رکھتی تھی اور جس نے پاکستان کے قیام کو اپنی منزل بنایا لیا تھا چنانچہ آنے والے وقت نے دیکھا کہ اہل گلاؤٹھی نے ہندوؤں اور خود مسلمانوں کے ایک طبقہ کی شدید مخالفت کے باوجود تحریک پاکستان کو اپنی شبانہ روز محنت سے پروان چڑھایا اور گلاؤٹھی کو میرٹھ کمشنری میں واقع ہونے کے باعث نواب زادہ لیاقت علی خاں کا حلقہ نیابت ہونے کا اعزاز حاصل ہوا جنھیں ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے گئے تھے بھرپور کامیابی حاصل ہوئی اور پھریہی نواب زادہ لیاقت علی خاں پاکستان کے پہلے وزیراعظم بننے کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔

معاشی اور معاشرتی حالات

قصبہ گلاؤٹھی کے بارے میں ہماری بیشتر معلومات ۱۸۵۷ء کے پس منظر و پیش منظر سے وابستہ ہیں یا مختصراً" وہ کچھ ہیں جو بچشم خود دیکھا یا سنا تحریری ذرائع سے بھی جو معلومات بہم پہنچی ہیں وہ بھی گلاؤٹھی کی معیشت و معاشرت کے بارے میں ایک دیہی یا یہ کہہ لیجئے کہ نیم دیہی منظر مہیا کرتی ہیں کچے پکے مکانوں سڑکوں گلی کوچوں اور درو دیوار پر مشتمل یہ بستی تقسیم ملک کے وقت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی جس کا

احوال انگریز مورخین نے بلند شہر کے ضلع گزٹ میں بیان کیا ہے۔ آبادی اب تو یقیناً" کئی گنا اضافہ ہو چکی ہو گی لیکن ۴۸-۱۹۴۷ء تک یہ دس بارہ ہزار سے کبھی متجاوز نہ ہوئی آبادی کا سب سے نمایاں حصہ مسلمانوں میں سادات پر مشتمل رہا ہے جنھیں جملہ آبادی میں ہمیشہ سب سے زیادہ معزز و محترم سمجھا گیا مسلمانوں میں دوسرے لوگ بھی تھے جو مختلف چھوٹی چھوٹی ذات برادریوں سے تعلق رکھتے تھے اور گلاؤٹھی کی بنیادی طور پر دیہی معیشت میں مختلف پیشوں سے وابستہ رہ کر مقامی معاشی و معاشرتی نظام کا ایک اہم جزو تھے اسی طرح غیر مسلموں میں ہندو برہمن طبقہ نمایاں حیثیت کا مالک تھا اور مقامی تجارت پر قریب قریب اسی کا قبضہ تھا سادات گلاؤٹھی کی معاش کا بنیادی ذریعہ چھوٹی بڑی زمینداریاں تھیں یا پھر تعلیم یافتہ افراد کو روزگار کی تلاش میں قصبہ سے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سادات کے بعض خاندان یا افراد انگریزوں کی داروگیر سے بچنے اور مقامی طور پر روزگار کے مواقع مفقود ہو جانے کے باعث ترک سکونت کر کے برصغیر کے دوسرے شہروں بالخصوص ریاستوں میں جن میں حیدر آباد دکن۔ جے پور۔ جودھپور۔ کپور تھلہ اور بہاولپور شامل تھیں چلے گئے تھے، وطن میں قیام جاری رکھنے والوں کا گزارہ زیادہ تر چھوٹی بڑی زمینداریوں پر تھا جب کہ وہ جائیدادیں جو مغل شہنشاہوں سے اعتراف خدمات و کمالات کے طور پر ملی تھیں انگریز سرکار نے ضبط کر لی تھیں۔ ان حالات میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اہل سادات کی معاشی حالت بالعموم قابل رشک نہیں تھی البتہ بعض خاندان یقیناً" آسودہ حال تھے جس کا سبب یا تو زمینداریوں سے معقول آمدن تھی یا چند وہ خاندان تھے جن کا شجرہ نسب منشی سید مہربان علی سے ملتا تھا جو ریاست بھرت پور سے بے اندازہ دولت ساتھ لائے تھے اور شہر کے کچے پکے مکانوں کے درمیان جو دو ایک محل نما تعمیرات نظر آتی تھیں وہ انہیں کی ملکیت تھیں

گلاؤٹھی کی معیشت کی بنیاد کیونکہ تمام تر دیہی انداز کی تھی اس لیے مختصر سے معاشرے کی تمام ضرورتیں مقامی طور پر ہی پوری ہو جاتی تھیں قصبے میں چھوٹے بڑے کئی بازار تھے جن میں غالب اکثریت ہندو دوکانداروں کی تھی چنانچہ روز مرہ کا

کاروبار قرض ادھار پر چلنا بھی ایک معمول تھا۔ کریانہ' کپڑا' مٹھائی وغیرہ کی دوکانیں اکثر ہندوؤں کی ملکیت تھیں اور سبزی' ترکاری' پان' بیٹری' درزی' لوہار اور بڑھئی جیسے کاروباری دھندے زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے۔ گلاؤٹھی کی ایک اہم کاروباری خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ایک بہت بڑی منڈی تھی جسے "گنج" کہتے تھے یہاں نزدیک و دور کے دیہات و قصبات سے زرعی اجناس فروخت کے لیے آتی تھیں اس طرح منڈی علاقے میں سب سے بڑے کاروباری مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی تھی البتہ اس پر بھی ہندو بنیوں کا تسلط تھا اور مسلمانوں کا عمل دخل برائے نام تھا "گنج" کا ایک عظیم الشان پختہ گیٹ تھا جو منشی مہربان علی نے تعمیر کرایا تھا دھنے جولاہے کوچوان اور محنت مزدوری کرنے والے لوگ چھوٹی چھوٹی ذات برادریوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان ہی تھے غرض معاشی میدان میں ہندوؤں ہی کو برتری حاصل تھی۔

قصبہ کی معاشرتی زندگی میں ایک خاص قسم کی رنگا رنگی پائی جاتی تھی تمام علاقے میں تہذیبی برتری سادات کو حاصل تھی جن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مغل کلچر کا اثر واضح نظر آتا تھا دوسری ذات برادریوں کے لوگ اپنا مخصوص تمدنی نظام رکھتے تھے جب کہ ذات پات میں تقسیم ہندو آبادی اپنے اپنے کلچر پر قائم تھی ان میں برہمنوں کی بالادستی نہایت واضح تھی البتہ ہندو مسلم آبادی ایک دوسرے کے رسم و رواج اور خصوصاً تہواروں میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کرتی تھی ہولی دیوالی کے ہندو تہوار مسلمانوں کے لیے خاص دلچسپی کا باعث تھے اور جیسا کہ ایک محدود و مختصر معاشرہ کا طریق ہے ہندو مسلمان اپنے اپنے تہواروں پر ایک دوسرے کو تحائف بھیجتے تھے محرّم کے ایّام میں البتہ ہندو مسلمانوں کے درمیان تناؤ کی فضا پیدا ہو جاتی تھی کیونکہ محرّم کی رسوم مسلمان اس کے باوجود کہ پورے قصبہ میں ایک متنفس بھی شیعہ عقیدے سے تعلق نہ رکھتا تھا بھرپور انداز سے انجام دیتے تھے الم یا تعزیوں کے جلوس جب گشت کے دوران کسی ایسی جگہ سے گزرتے جہاں پیپل کا درخت ہوتا جو ہندوؤں کی نظر میں مقدّس ہوتا تھا تو عموماً مقامی انتظامیہ کے لیے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا کیونکہ نہ تو مسلمان الم یا تعزیوں کو سرنگوں کرنے کو تیار ہوتے اور نہ

ہندو اس بات پر تیار ہوتے کہ مقدس پیپل کو تراشا جائے یا ہاتھ بھی لگایا جائے چنانچہ بعض اوقات فسادات بھی ہو جاتے بعض حالتوں میں مقامی انتظامیہ اور طرفین کے دانشمند لوگو خوش اسلوبی سے اس نازک مرحلے سے گزر جاتے محرّم کی سات تاریخ کو الم برآمد ہوتے آٹھ کو مہندی اور نو کو تعزیئے جب کہ دس کو یوم عاشور منایا جاتا تعزیہ نمامہندی جسے تیس اور چالیس کی دہائیوں میں گلاوٹھی کا ایک شخص مسمی نور محمد تیر گر تیار کرتا اس قدر خوبصورت ہوتی کہ اسے دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے گلاوٹھی آتے اور رات بھر مہندی کے جلوس میں شریک رہتے ان مواقع پر مرثیے پڑھے جاتے تھے البتہ ماتم نہیں ہوتا تھا مسلمان گھرانوں میں نذر نیاز کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے جاری رہتا اور حلیم کی نیاز کے علاوہ اگر موسم گرم ہوتا تو جگہ جگہ شربت کی سبیلیں لگ جاتیں جب کہ موسم سرما میں چائے کا اہتمام کیا جاتا۔ ایک خاص اور نمایاں پہلو محرّم کے پروگرموں کا یہ بھی تھا کہ الم اور تعزیوں کے جلوس کے ساتھ اکھاڑے بھی چلتے جن میں نوجوان کشتی وغیرہ کے علاوہ پٹا بنوٹ اور دیگر کمالات حرب کا زبردست مظاہرہ کرتے یہ شوق مسلمان نوجوانوں میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ سال کے دوسرے حصوں میں بھی ان کمالات کی مشق جاری رہتی اس جدت کے پس منظر میں محرّک کے طور پر ہندو مسلم آویزش کا ماحول کارفرما نظر آتا ہے ہندوؤں نے بھی چونکہ راشٹریا سیوک سنگھ جیسی مسلّح تنظیمیں قائم کر رکھی تھیں اس لیے مسلمانوں کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ بھی اپنے دفاع کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں چنانچہ خاکسار تحریک کو بھی ہندو مسلّح تنظیموں کا رد عمل کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ کہا گیا سادات گھرانوں کی زندگی میں مغل کلچر کی جھلک نظر آتی تھی خواتین پردہ کی اس قدر سختی سے پابندی کرتیں کہ دن کے وقت میں بھی کوئی خاتون برقع تک میں نظر نہ آتی خواتین کی مقامی آمدورفت کے لیے ڈولی کا رواج عام تھا ایک سے دوسرے محلے میں جانے کے لیے ڈولی لے کر کہار آتے اور وہ بھی اس طرح کہ ڈولی ڈیوڑھی میں رکھ دی جاتی اور کہار باہر نکل جاتے خاتون پردہ میں لپٹی ہوئی ڈولی میں جب بیٹھ جاتیں تو کہار ڈولی اٹھاتے تقسیم ملک کے قریب قریب البتہ ایسا ضرور ہو

گیا تھا کہ خواتین غروب آفتاب کے بعد برقع پہن کر ایک جگہ سے دوسری جگہ چلی جاتی تھیں یہ مقامی سفر تانگے میں بھی کیا جاتا تھا بلکہ قرب و جوار کے مقامات کے لیے جن میں نو میل کے فاصلے پر ہاپوڑ اور بارہ میل پر بلند شہر بھی شامل تھے تانگہ ہی استعمال ہوتا تھا اور پردے کی اس قدر سختی سے پابندی ہوتی تھی کہ تانگے کو نہ صرف ایک بڑی سی چادر میں لپیٹ دیا جاتا کہ جب خواتین تانگہ میں بیٹھتیں تو گلی میں تانگے کے آگے اور پیچھے چادریں تان کر پردہ کر لیا جاتا کہ کسی راہ گیر کی نظر بھی نہ پڑ سکے۔ زندگی نہایت سست رفتار تھی، عام آمد و رفت کے ذرائع بھی محدود اور دقیانوسی تھے، سفر عموماً پیدل گھوڑے پر بیل گاڑی رتھ اونٹ گاڑی اور یکہ ٹم ٹم اور حسب توفیق بگھی۔ فٹن۔ پالکی ڈولی۔ اونٹ یا ہاتھی پر کیا جاتا تھا انگریز حکومت نے ریل گاڑی کا اجراء کیا تو ایسٹ انڈیا ریلوے (ای۔ آئی۔ آر) کے خورجہ میرٹھ سیکشن پر گلاؤٹھی کے مقام پر ریلوے سٹیشن قائم کیا گیا بسیں اور لاریاں بھی چلنا شروع ہوئیں گلاؤٹھی سے گزرنے والی شاہراہ اعظم (گرینڈ ٹرنک روڈ) کے جس مقام پر یہ بسیں اور لاریاں ٹھہرتیں اسے ''اجنٹی'' کہتے تھے جو ایجنسی کی بگڑی ہوئی شکل تھی یہ بڑی پر رونق جگہ تھی جہاں ہر وقت مسافروں کی چہل پہل رہتی کھانے پینے کی چیزوں کے کچھ کھوکے اور سٹال بھی بن گئے تھے۔

گلاؤٹھی میں خصوصاً سادات کا معاشرہ مغل خدوخال کے ساتھ ساتھ بعض جاگیردارانہ اقدار بھی اپنا چکا تھا بلکہ بعض رسم و رواج تو ہندو معاشرہ سے بھی در آئے تھے جس کا اظہار روز مرہ کے رہن سہن اور بیاہ شادی کی رسومات سے ہوتا تھا گھروں میں جدّی پشتی ملازم ہوتے تھے جن کو تنخواہ یا مشاہرہ کی جگہ ربیع و خریف کی فصلوں کے موقع پر اناج دے دیا جاتا تھا اور یہ اس قدر مقدار میں ہوتا تھا کہ یہ لوگ بھی خوش اور مطمئن رہتے تھے بعد کے دِنوں میں بھنگی ماشکی وغیرہ کو "فصلانہ" کے علاوہ چار یا آٹھ آنے ماہانہ مشاہرہ بھی مل جاتا تھا یہ لوگ اپنے مالکان کے پوری طرح تابع فرمانبردار اور وفادار ہوتے تھے اور نسلاً بعد نسلاً ان کے یہی پیشے چلے آتے تھے بیاہ شادیوں سے پہلے رشتے طے کرنے کے لیے برسوں تگ و دو میں گزر جاتے عام رواج

یہی تھا کہ رشتے برادری میں ہی طے کیے جاتے لیکن اس میں بھی اونچ نیچ کا اس قدر خیال رکھا جاتا کہ فریقین کے شجرہ ہائے نسب پوری طرح کھنگالے جاتے خواتین کی آمد و رفت کا سلسلہ مدتوں جاری رہتا تب کہیں جا کر رشتہ طے پاتا' شادیوں میں مہمانوں کو مدعو کرنے کے لیے طبع شدہ دعوت ناموں کا رواج نہیں تھا بلکہ مدعوئین کی ایک فہرست لے کر میراثی گھر گھر جاتا اور لوگوں سے صاد کرا لیتا شادی والے گھروں میں شادی سے بہت پہلے ہی رونقیں شروع ہو جاتیں اور ایک میلے کا سماں لگنے لگتا طرح طرح کی رسمیں انجام دی جاتیں اور نائنیں اور مراثنیں شادی کے گیت گاتیں اور گھر گھر سوغاتیں تقسیم کرتیں' اس قبیل کے خادم اور خادماؤں کو ایسے مواقع پر خاص طور پر نوازا جاتا۔ اس طرح بیاہ شادیاں ان لوگوں کے لیے اچھی خاصی آمدن کا ذریعہ بن جاتی تھیں یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ گرمجوشی سے خدمات انجام دیتے ان مواقع پر جہاں رونق وشادمانی کا ماحول بن جاتا وہاں بعض قباحتیں بھی رسم و رواج کا حصہ بن گئی تھیں جس کا سبب غالباً" خود برادری سسٹم تھا ہوتا یوں کہ بیاہ شادی کے موقع پر رشتہ داروں میں سے ایک نہ ایک صاحب ضرور روٹھ جاتے تھے جس کے نتیجہ میں اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ان صاحب کے روٹھنے کا کوئی فوری سبب بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ برسوں پہلے ہو جانے والے کسی واقعہ یا بات کو بنیاد بنا کر یہ صاحب تقریب کا بائیکاٹ کر دیتے اور تقلید میں روایتاً" ساری برادری بھی ان کے ساتھ ہو لیتی یہاں تک نوبت پہنچتی کہ کھانا تیار ہے مگر کھانے والے تیار نہیں منتیں خوشامد ہوتیں اور جب دوپٹے اور پگڑیاں قدموں میں رکھ دی جاتیں تو تب کہیں جا کر یہ فسادی لوگ من پاتے بہرحال ایسے واقعات بھی اس عہد کی گلاوٹھی کے سماجی ماحول کا ایک حصہ تھے۔

گلاوٹھی کے مخصوص روایتی معاشرہ میں بزرگوں کا احترام ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ خورد و کلاں کے درمیان حفظ مراتب کی فضا قائم تھی۔ گھروں میں ہوں یا گلی کوچوں میں' چھوٹے بڑوں کو سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے۔ یہی نہیں بلکہ چھوٹوں کی فہمائش کرنے کیلئے اسی گھر' کنبہ کا بزرگ ہونا ضروری نہیں ہوتا تھا بلکہ برادری کا کوئی بھی بزرگ بچوں کی ڈانٹ ڈپٹ کر سکتا تھا' جس کا بچے کے والدین کبھی

برا نہیں مناتے تھے۔ زندگی پر دین اور اس کی اقدار خوش اخلاقی' دیانت' امانت' خدمت خلق اور وفاداری کی گہری چھاپ تھی۔ عصبیت اور تعصب مفقود تھے۔ کم آسودہ حال گھرانوں میں چکی پینے کا رواج تھا اور پو پھٹنے کے ساتھ ہی دستی چکی کی آوازیں اور قرآن پاک کی تلاوت کی مردانہ و زنانہ آوازیں عجب سماں پیدا کرتی تھیں۔ لوگ باقاعدگی اور کثرت سے نمازیں مسجد میں جاکر ادا کرتے تھے۔ رمضان میں تراویح مساجد میں ایک خاص ماحول پیدا کرتی تھیں۔ عید بقر عید اور شب برات کی رونقوں میں ہندو بھی شریک ہوتے اور اس طرح ہولی دیوالی میں مسلمان دلچسپی لیتے۔ ہندو مسلمانوں کو مٹھائیاں اور پھل وغیرہ بھجواتے اگر گھر کا کوئی شخص قصبہ سے باہر چلا جاتا تو اس کی غیرموجودگی میں اہل محلہ اس کے اہل خانہ کا خیال رکھتے اور سودا سلف وغیرہ لاکر دیتے۔ ضروریات زندگی بیحد ارزاں تھیں اور قوت خرید نہایت کم' پیسہ' دھیلا' دمڑی وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ اشرفی تانبے کے سکے اور کوڑیاں بھی چلتی تھیں۔ آموں کے باغات کثرت سے تھے اور پھل نہایت سستے مل جاتے تھے۔ موسم ذرا خوشگوار یا ابرآلود ہوتا تو لوگ گھروں سے نکل لیتے اور باغوں میں جھولے ڈالکر پکوان اور آموں سے نوروز (پکنک) منایا جاتا۔ زراعت اصل پیشہ تھا اس لئے ماحول دیہی انداز کا تھا۔ گنے کی کاشت' گڑسازی اور راب وغیرہ بنائی جاتی۔ بانس کے جنگلات بھی تھے۔ بیریوں کے باغات تھے۔ بیل' گائے' بھینس' بکری' گھوڑے عام طور پر پالے جاتے۔ لوگ نہایت بھولے اور سادہ لوح ہوتے تھے۔ چالاکیوں اور منافقتوں سے دور قناعت پسند' سادہ مزاج اور ایثار پیشہ تھے۔ اکثر گھروں میں دودھ' دہی اور گھی کی ریل پیل ہوتی تھی۔ اپلے ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے تھے غرضیکہ تمام ماحول تکلفات سے اس قدر مبرا و بے نیاز تھا کہ آسودہ سے آسودہ گھرانوں میں بھی ڈرائنگ روم نام کا کوئی گوشہ نہیں ہوتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے گھروں پر جاکر ضرور ملتے تھے لیکن چائے وغیرہ یا مشروبات کا تواضع کے طور پر رواج نہ تھا البتہ سادہ پانی اور پان وغیرہ پیش کیا جاتا تھا۔ اچھے اچھے گھروں میں بھی کوئی خاص فرنیچر نہیں ہوتا تھا۔ تخت اور چارپائیاں وغیرہ ہی جدید فرنیچر کا نعم البدل تھے۔ فرنیچر کا رواج تقسیم ملک کے قریب

قریب تیزی سے بڑھنا شروع ہو گیا تھااور جدید گلاوٹھی نے جنم لینا شروع کر دیا تھا لیکن پھر بھی ایسا نہیں کہ ماضی سے رشتہ منقطع ہو جائے' معاشرہ پر پھر بھی قدامت و روایت کی چھاپ باقی رہی جو آج تک ہے۔

نوجوانوں اور بچوں میں کھیل کود کے شوق کا انداز ایسا ہی تھا جیسا کہ دیہی معاشروں میں ہوتا ہے۔ تعلیمی سہولتوں کے اعتبار سے بھی گلاوٹھی ایک پرائمری اور ایک مڈل سکول تک محدود تھا۔ مسلمانوں کی جانب سے مفید عام سکول اور ہندوؤں کی طرف سے ڈی این (دیوناگری) سکول بعد میں قائم ہوئے جن میں سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سطح تک کی تعلیم کا انتظام کیا گیا لہٰذا ان سکولوں کے قائم ہو جانے سے بھی قصبہ میں کھیلوں کی نوعیت پر کوئی زیادہ اثر نہیں پڑا سوائے اس کے کہ محدود انداز میں فٹ بال اور والی بال جیسے کھیلوں کا اضافہ ہوا تاہم کبڈی پھر بھی سب سے نمایاں اور مقبول کھیل تھا۔ اس کھیل میں بچے بڑے سب ہی دلچسپی لیتے تھے اور اس میں چھوٹے بڑوں کی ٹیموں نے زبردست مہارت حاصل کرلی تھی۔ انٹر سکول ٹورنامنٹ ہوتے یا کبڈی کے پرائیویٹ مقابلے' ان میں گلاوٹھی کی ٹیمیں اکثر جیتا کرتیں اور انعامات حاصل کرتیں۔ گلاوٹھی کے ایک کھلاڑی سید ابرار حسن کو تو اس کھیل میں وہ مہارت حاصل تھی کہ ایک مرتبہ ضلعی سطح کے مقابلوں میں ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ان کا کھیل دیکھ کر انہیں پولیس کے محکمے میں ملازمت دیدی۔ دوسرے اہم کھیلوں میں تیراندازی اور پیراکی شامل تھے۔ اس کے علاوہ پتنگ بازی کا شوق بھی خاصا عام تھا۔ تیراندازی کے کھیل میں تیر بغیر کمان کے چلائے جاتے تھے یعنی نوجوان یہ کھیل سرکنڈوں اور تیلیوں سے کھیلتے تھے جنہیں ہاتھ میں لیکر زمین پر رگڑتے ہوئے پوری طاقت سے پھینکا جاتا تھا اور سرکنڈے جنہیں تیر کہتے تھے اور تیلیاں اس طرح فضا میں لہراتے ہوئے جاتے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ مقابلوں میں جیتنے کا معیار یہی ہوتا تھا کہ جس کا تیر سب سے دور جاکر گرا وہی فاتح ٹھہرایا گیا۔ پیراکی کے کھیل کا سبب گلاوٹھی میں ایک وسیع و عریض جھیل نما تالاب کی موجودگی تھی جسے لال ڈگّی کہا جاتا تھا۔ لال ڈگّی کے متوازی ایک نہایت کشادہ سڑک تھی اور تالاب کے کنارے

ایک قدیم بڑھ کا درخت تھا جسے **پلکھن** کہتے تھے اور اسی مناسبت سے وہاں جو ایک مسجد تھی، **پلکھن** والی مسجد کے نام سے مشہور ہوگئی تھی۔ کشادہ سڑک پر تیر بھی کھیلے جاتے تھے اور بڑھ کے سائے میں عموماً" بچے کھیل کود میں مصروف رہتے۔ گلاؤٹھی کے لوگوں میں پیراکی کا شوق ہی لال ڈگی کی وجہ سے پیدا ہوا اور اس فن میں لوگوں نے کمال حاصل کیا۔ سادات کے ایک بزرگ منشی سید رحیم الدین کو تو پیراکی پر ناقابل یقین حد تک کمال حاصل تھا۔ وہ لیٹ کر اور بیٹھ کر بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے تیرنے پر قادر تھے بلکہ عینی شاہدین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ وہ ایک ہاتھ میں حقہ لیکر سطح آب پر بیٹھ جاتے اور حقہ پیتے رہتے۔ بعض اوقات ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر لیٹتے اور بہ آواز بلند مثنوی مولانا رومؒ پڑھتے جاتے۔ بہرحال لال ڈگی اور اس کا ملحقہ علاقہ ہر خُورد و کلاں کیلئے بیحد دلچسپی کا باعث تھا۔ پاکستان آنے کے بعد بھی وہ بزرگ جو لال ڈگی اور اس کی رونقیں دیکھ چکے ہیں گزرے ہوئے ایّام کو ہرگز فراموش نہیں کرسکتے۔ سنتے ہیں کہ یہ تالاب اب خشک ہوگیا ہے لیکن بقول کسے:

جب کلفٹن پر کوئی موج ہوا بل کھائے گی
لال ڈگی آپ کو بے ساختہ یاد آئے گی

گلاؤٹھی کے شب و روز کا یہی ایک پہلو نہیں تھا بلکہ روزمرہ زندگی میں علم و حکمت کو بھی دخل حاصل تھا۔ یہ ایک علماء، فضلاء، ادباء اور شعراء کی بستی بھی تھی۔ مقامی جامع مسجد سے وابستہ دارالعلوم کے باعث بلند پایہ اساتذہ اور علمائے کرام کی موجودگی نے قصبہ کی معاشرتی فضا کو ایک پروقار متانت و سنجیدگی عطا کر دی تھی اور تمام معاشرہ پر دینی اقدار کا اثر واضح طور پر محسوس ہوتا تھا۔ مقامی طور پر چونکہ رسمی تعلیم کے حصول کے ذرائع محدود تھے۔ اس لئے تقریباً" ہر گھرانے سے نوجوان مزید تعلیم کے لئے بلند شہر، میرٹھ، علی گڑھ اور دہلی وغیرہ جاتے تھے چنانچہ قصبہ میں ان لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا اور مقامی معاشرہ میں نئے نئے خیالات و رجحانات سے تازگی کا احساس پروان چڑھتا رہتا۔ گھروں میں خواتین میں بھی

پڑھنے لکھنے کا شوق بےحد عام تھا اور مجلسی زندگی بڑی پر رونق تھی۔ قومی موضوعات کے حوالے سے تو اجتماعی غور و فکر کے مواقع ملتے ہی رہتے تھے۔ خواتین کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ خاص طور پر محافل میلاد کا اہتمام نہایت عقیدت و احترام سے کیا جاتا تھا۔ ان تمام سرگرمیوں کی وجہ سے بستی میں ایک نہایت خوبصورت مجلسی فضا قائم ہوگئی تھی۔ دوسری طرف مردوں میں شعر و شاعری کے شوق کا اظہار وقتاً فوقتاً منعقد کی جانے والی شعری نشستوں کی صورت میں ہوتا۔ مشاعرے خاص طور پر اس وقت منعقد ہوتے جب فدا صاحب' خیال صاحب یا ناطق صاحب جیسے استادان فن وطن آتے۔ فدا صاحب بسلسلہ ملازمت بیشتر وقت مین پوری میں رہے۔ خیال صاحب ریاست رامپور کے دربار میں شاعر اور وکیل تھے جبکہ ناطق صاحب ناگپور میں اہم سیاسی اور سماجی شخصیت تھے۔ طرحی مشاعرے بھی ہوتے۔ غرض سادات کی بستی گلاؤٹھی قدیم زمانے کے علم و ادب کا گہوارہ تھی جہاں ملک کے مسلم الثبوت اساتذہ' شعراء' علماء' فضلا' قراء' حفاظ' ادبا' صوفیاء اور خوش نویس موجود تھے۔ جو لوگ ان پڑھ تھے ان میں بھی کوئی نہ کوئی چونکا دینے والی خصوصیت ہوتی تھی۔

یہاں ایسے ہی ایک بزرگ میر اہتمام علی کا ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ میر صاحب پستہ قامت تھے مگر روایتاً طاقت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی درخت کا ایک گدّھا اپنے ایک ہاتھ سے جھکا کر بکریاں چرا رہے تھے کہ کوئی طاقت کے نشہ میں مست جاٹ ادھر سے گزرا اور انہیں سے پوچھ بیٹھا کہ میں نے سنا ہے کہ گلاؤٹھی میں کوئی میر اہتمام علی مُل ہے جو بہت زور آور ہے اور کسی نے آج تک اسے نہیں پچھاڑا۔ میں اس سے کشتی لڑنے کے ارادے سے آیا ہوں' مجھے اس کا پتہ بتا دو۔ میر اہتمام علی مُل شوخ طبیعت کے آدمی تھے۔ بڑی سادگی سے کہا کہ تم ذرا میری بکریاں چراؤ میں ابھی اسے یہیں بلائے لاتا ہوں۔ یہ کہکر درخت کا گدّھا جاٹ کے ہاتھ میں تھما دیا اور اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ہاتھ ہٹاتے ہی گدّھا اپنی اصل بلندی پر پہنچ گیا اور جاٹ ٹنگ کر رہ گیا اور گھبرا کے کہنے لگا کہ یار مجھے تو تو ہی اہتمام علی مُل معلوم ہوتا ہے۔ نابھیّا میں ہار مانتا ہوں' تجھ سے لڑنا میرے بس کا روگ نہیں۔ ایک اور روایت کے

مطابق میر اہتمام علی ٹل اپنے کھیتوں کو پانی دینے کیلئے رات میں جنگل میں جا رہے تھے کہ آپ نے ایک جگہ بنجاروں کا قافلہ دیکھا جو دن بھر کے سفر کے بعد آرام کر رہے تھے اور آگ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ اس زمانے میں گنا پیلنے اور رس نکالنے کیلئے پتھر کے کئی کئی من کے وزنی کولھو ہوتے تھے جن کا اٹھانا تو کیا سرکانا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ میر اہتمام علی کی طبیعت میں شوخی تو تھی ہی انہوں نے بنجاروں سے کہا تم یہاں گپ شپ کر رہے ہو اور تمہارے کولھو اندھیرے میں پڑے ہیں' چوری ہوگئے تو کیا کروگے۔ بنجارے اس بات پر ہنسنے لگے اور بولے کہ کولھو کو کوئی ہلا بھی نہیں سکتا چوری تو کیا کرے گا۔ یہ سن کر میر صاحب خاموش ہوکر چلدیئے۔ دوسرے دن صبح جب بنجاروں کا قافلہ تیار ہوکر جانے لگا اور اپنے گھوڑے گدھے لادنے لگے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ انکے کولھوں میں سے ایک کولھو گم ہے۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ان میں سے ایک سیانے نے کہا۔ یہ کارستانی رات والے میرصاحب کی معلوم ہوتی ہے۔ آخرکار وہ میرصاحب کا پتہ پوچھتے ہوئے ان کے گھر پہنچ گئے اور میر صاحب کے قدموں میں گر گئے اور کہنے لگے سرکار ہمارے کولھو کا پتہ بتا دیں ورنہ ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ میر اہتمام علی کو ان پر ترس آگیا' کہنے لگے دیکھو جس میدان میں تمہارا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا اس کے سرے پر ایک اندھا خشک کنواں ہے' تمہارا کولھو اس میں پڑا ہوا ہے جاؤ اور جاکر نکال لو۔ بنجاروں نے ہزار تدبیریں کیں مگر کولھو نہ نکال سکے۔ آخر یہ لوگ پھر میرصاحب کے پاس پہنچے اور میر صاحب کو گریہ و زاری کرکے کنویں پر لے آئے۔ وہ ایک مضبوط رسّا لیکر کنویں میں اترے اور کولھو کو رسّے سے اچھی طرح باندھا اور باہر آکر ڈول کی طرح رسّے کے ذریعے کولھو کو کنویں سے باہر نکال لیا۔

گلاؤٹھی کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں قرب و جوار کے ماحول و واقعات کو بھی بڑا دخل حاصل تھا چنانچہ ان میں اہل گلاؤٹھی کیلئے سب سے زیادہ دلچسپی کا مرکز و محور بلند شہر کی سالانہ نمائش تھی جو میرٹھ کی نوچندی کے بعد اکثر فروری کے مہینے میں منعقد ہوتی تھی۔ نمائش میں گھوڑوں' مویشیوں اور دوسرے جانوروں کی خرید و

فروخت کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے سامان کی دکانیں بھی سجائی جاتیں۔ چکّی کے پاٹ کے برابر پرت والا پراٹھوں کا افغانی ہوٹل، موت کا کنواں، عجائب گھر اور اونٹ کا تماشا بھی ہوتا تھا اور بچوں کی دلچسپی کے جھولے، سکیٹنگ کا چھوٹا سا میدان اور لوہے اور بانس کی کھپچیوں پر موم کے چہرے سجائے دنیا کے بادشاہوں اور لیڈروں کا تماشا گھر بھی ہوتا تھا۔ یہ مجسمے اکثر ترک سلاطین اور نوجوان ترکوں کے ہوتے تھے جنہیں دیکھ کر مسلمان مردوزن، بچے اور جوان بیحد خوش ہوتے تھے اور فخر محسوس کرتے تھے۔ نمائش میں مینار پر سے حوض میں کپڑے جلتے ہوئے آدمی کے چھلانگ لگانے کا منظر بھی دیکھا جاتا اور ایک خیمہ میں بظاہر ایک سربریدہ بولتا چالتا بھی نظر آتا۔ نمائش میں کھیلوں اور گھوڑ دوڑ وغیرہ کے مقابلے بھی منعقد کرائے جاتے۔ مشاعرہ اور محفل موسیقی برپا ہوتی۔ مشاعروں میں گلاوٹھی کے شعراء اکثر شرکت کرتے۔

شخصیات

گلاؤٹھی اپنے جغرافیائی سیاق و سباق کے اعتبار سے ہر چند کہ ایک چھوٹی بستی قرار پاتی ہے لیکن ہر دور میں یہاں گوناں گوں شخصیات کا وجود اس کی عظمت و اہمیت کا گواہ رہا ہے۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کا یہ کہنا کہ اگر گلاؤٹھی کے سادات عظام منصب و جاہ کے طلبگار ہوتے تو قلمدان وزارت عظمیٰ ہمیشہ ان کے پاس رہتا۔ ایک ایسا خراج تحسین ہے جس کی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں۔ درویشی و خاکساری سادات گلاؤٹھی کا مستقل مسلک رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی سے بڑی ہستیوں نے بھی اپنے منفرد کمالات و فضائل کے باوجود گوشہ ء گمنامی میں رہنا پسند کیا۔ آج ہماری معلومات ان بزرگوں کے بارے میں انتہائی محدود و ناقص اسی لئے ہیں کہ نمود و نمائش کی خواہش کبھی ان حضرات کی شخصیتوں سے وابستہ نہیں رہی:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

گلاؤٹھی کی حیات افروز اور مردم خیز سرزمین سے بے شمار رشک آفتاب و ماہتاب ذرے ابھرے اور سپہر علم و دین و ادب پر جلوہ بار رہ کر تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہوگئے۔ انہیں دینی و دنیوی فضائل کی حامل شخصیتوں میں راقم الحروف کے جدّ امجد قاضی سید فضل اللہ صدر الصدور علاقہ میرٹھ و برن (بلند شہر)' سید فیض الحسن صوفی باشریعت و طریقت جو ریاست بہاولپور کے وزیراعظم بھی رہے۔ منشی سید مہربان علی جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد اہل وطن کیلئے ایک بہت بڑا سہارا

ثابت ہوئے اور ریاست بھرت پور کے وزیر مالیات رہے۔ صوفی محمد حسنؒ، صوفی احمد حسنؒ، صوفی عبدالوحیدؒ، الحاج صوفی مولوی محمد محسنؒ، صوفی کرم حسین، مولوی و صوفی عبدالعزیزؒ(نومسلم)، مولوی سید محی الدینؒ اور مولوی سید حمید الدینؒ مہتمم مدرسہ منبع العلوم و خطیب امام جامع مسجد گلاؤٹھی کے علاوہ دنیائے شعرو ادب کی باکمال ہستیاں مثلاً مولانا سید عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی، سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی، شمس الحق خیال، مشتاق حسین مضطر گلاؤٹھوی، امیر حسن امیر گلاؤٹھوی، امیر حسن شوق گلاؤٹھوی اور علامہ سید قابل گلاؤٹھوی شامل ہیں۔ اطباء و حکماء میں حکیم سید محمد ارشد، حکیم سید مقصود علی، حکیم سید محمد صالح، حکیم سید محمد مصلح اور حکیم سید عظمت اللہ ہی چند ایسے معلوم اسمائے گرامی ہیں جن کی اپنے شعبہ میں مہارت و دسترس مسلّم تھی اور جن کا فیضان نزدیک و دور عام تھا۔ بہرحال شخصیتوں کے ضمن میں معلومات کی انتہائی کمیابی کے باوجود جن چند خواتین وحضرات کے بارے میں جو "مشتے از خروارے" کوائف میسر آئے ہیں انہیں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

منشی سید مہربان علی

منشی سید مہربان علی گلاؤٹھی کی واحد شخصیت ہیں جن کا ذکر قدرے تفصیل سے انگریزوں کے عہد میں مرتب شدہ بلند شہر کے ضلع گزٹ میں ملتا ہے۔ آپ پلول سے گلاؤٹھی آئے اور یہاں آباد ہوئے۔ ابتداء میں آپ کا وقت تنگدستی اور عسرت میں گزرا تاہم کوئی شخص آپ کے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوا اور آپ کو کسی طرح مہاراجہ بھرت پور کے دربار میں پہنچا دیا۔ وہاں ملازمت کے زینے طے کرتے ہوئے منشی مہربان علی وزیر خزانہ کے منصب پر فائز ہوئے اور نہایت عزت و احترام سے دیکھے جانے لگے۔ بھرت پور میں آپ نے اپنے نام سے منسوب "مہربان پورہ محل" تعمیر کرایا اور گلاؤٹھی میں ایک محل اور کوٹھی تعمیر کی۔ آپ کے ایک بیٹے کی ولادت پر جو زیادہ زندہ نہ رہا مہاراجہ بھرت پور نے برات جیسی دھوم دھام کے ساتھ "کرتہ ٹوپی" کی سوغات بھیجی جو سونے کے برتنوں اور کھلونوں پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد چار

منشی سید مہربان علی

بیٹیاں پیدا ہوئیں جن کے نام فاطمہ بیگم، عائشہ، صغیر فاطمہ اور محفوظ فاطمہ تھے تاہم آپ اولاد نرینہ سے محروم رہے۔ سب سے بڑی بیٹی فاطمہ بیگم کے نام سے گلاؤٹھی کو بڑی شہرت ملی۔ لوگ انہیں کوٹھی والی فاطمہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ گلاؤٹھی کی تقریباً تمام دکانیں فاطمہ بیگم کی ملکیت تھیں جو ہندوؤں نے کرایہ پر لی ہوئی تھیں۔ گلاؤٹھی کی مشہور گنج منڈی بھی انہیں کی ملکیت تھی جس کے دروازہ پر ان کے نام کا پتھر آج بھی نصب ہے۔ ہر کوئی ان کا بیحد احترام کرتا تھا۔ انگریز افسران کھڑے ہو کر استقبال کرتے تھے۔ منشی سید مہربان علی کی ایک اور بیٹی صغیر فاطمہ نے گلاؤٹھی میں طالبات کیلئے پہلا مدرسہ قائم کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ آپ کے شوہر سید شفقت اللہ جنہوں نے بی اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا آنریری مجسٹریٹ تھے اور گلاؤٹھی کی ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ آخری دختر محفوظ فاطمہ کے تین بیٹوں میں سے ایک سید انتظام الدین پاکستان آ گئے تھے۔ وہ ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ اپنے وقت کے ہاکی اور کرکٹ کے بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے۔

جب مہاراجہ بھرت پور کا انتقال ہوا تو مہارانی کے دیور کی نیت خراب ہوئی اور اس نے مہارانی سے شادی کرنا چاہی مگر چونکہ ہندوؤں میں اور وہ بھی اس زمانے میں "ودھوا" کی شادی کی سخت ممانعت تھی اس لئے مہارانی سخت پریشان تھی اور کسی قیمت پر دیور سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خود بھی کسی مہاراجہ کی بیٹی تھی۔ اس نے سید مہربان علی سے بڑی عاجزی سے استدعا کی کہ مجھے کسی طرح محل سے نکال کر بحفاظت میرے ماتا پتا کے پاس پہنچا دیا جائے تو میں آپ کو اتنی دولت سے نوازوں گی کہ آپ کی سات پشتیں چین سے زندگی بسر کر سکیں گی۔ سید مہربان علی کو مہارانی پر بڑا ترس آیا اور انہوں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے مہارانی کو بحفاظت اس کے والدین تک پہنچا دیا۔ مہارانی نے حسب وعدہ بے انتہا مال و دولت، زر و جواہر اور وہ کچھ دیا جو انسانی تصور سے بڑھ کر تھا۔ اس نے ایک خزانہ کا نقشہ بھی دیا جو باوجود تلاش کے آج تک کسی کو نہیں مل سکا۔

اس کے بعد منشی مہربان علی گلاؤٹھی آ گئے اور انہوں نے ایسے ایسے تعمیری

اور نیکی کے کام کئے جو صدقہ جاریہ میں شمار ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے چوبیس گاؤں خریدے اور گلاؤٹھی کی عظیم الشان جامع مسجد کی تعمیر نو کرائی جو ۱۲۶۷ھ میں مکمل ہوئی۔ مسجد سے ملحق ایک عربی مدرسہ منبع العلوم کے نام سے تعمیر کرایا جس کی رسم افتتاح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہاتھوں سے ادا ہوئی۔ یہ مدرسہ آج بھی قائم ہے جس میں طلباء صرف برصغیر ہی سے نہیں بلکہ بیرونی اسلامی ممالک سے آ کر حصول علم کی سعادت حاصل کرتے رہے ہیں۔ مسجد کی تعمیر نو کے دوران وہاں موجود دو قبروں کو منشی صاحب نے منتقل کرانا چاہا لیکن خواب میں دیکھا کہ یہ اشخاص ان سے نمازیوں ہی کے قدموں میں رہنے کی استدعا کر رہے ہیں چنانچہ قبریں وہیں رہنے دی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دو اشخاص محمود غزنوی کی آمد کے سلسلہ میں کسی جنگ میں شہید ہوگئے تھے۔ سید مہربان علی کی بیگم کے خالہ زاد بھائی مولوی محی الدین مسجد اور مدرسہ کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ان کے بیٹے مولوی حمید الدین' پھر نسیم الدین مہتمم مقرر ہوئے۔ آج کل ان کے بیٹے ندیم الدین یہ فرض انجام دے رہے ہیں۔

منشی سید مہربان علی نے رفاہی مقاصد کے تحت زبردست تعمیراتی کام کرائے۔ آپ نے نو سو کنویں اور سرائیں بنوائیں اور کعبہ شریف میں بھی ایک کنواں اور سرائے خانہ تعمیر کرایا۔ اسی قسم کا ایک کنواں اور سرائے علی گڑھ میں تعمیر کرائی۔ نیز علی گڑھ کالج میں کمرے تعمیر کرائے۔ گلاؤٹھی میں ہر سال کالی ندی میں برسات کے دنوں میں سیلاب آجاتا اور ہزاروں لوگ اور گاؤں سیلاب کی نذر ہو جاتے تھے چنانچہ سید مہربان علی نے کالی ندی پر پل بنوایا' جس پر ان کا نام کندہ ہے۔ یہ پل آج بھی قابل دید ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے دہلی میں جب پہلا دربار لگایا تو بیشتر روساء و امراء کو مدعو کیاگیا۔ سید مہربان علی نے بھی اس دربار میں شرکت کی۔ جہاں انہیں کے سی آئی ای (K.C.I.E) کا خطاب عطا کیا گیا۔ گلاؤٹھی میں ان کے تعمیر کردہ کوٹھی باغ اور محل آج بھی اسی طرح قائم ہیں۔ محل کے مردانہ اور زنانہ حصے
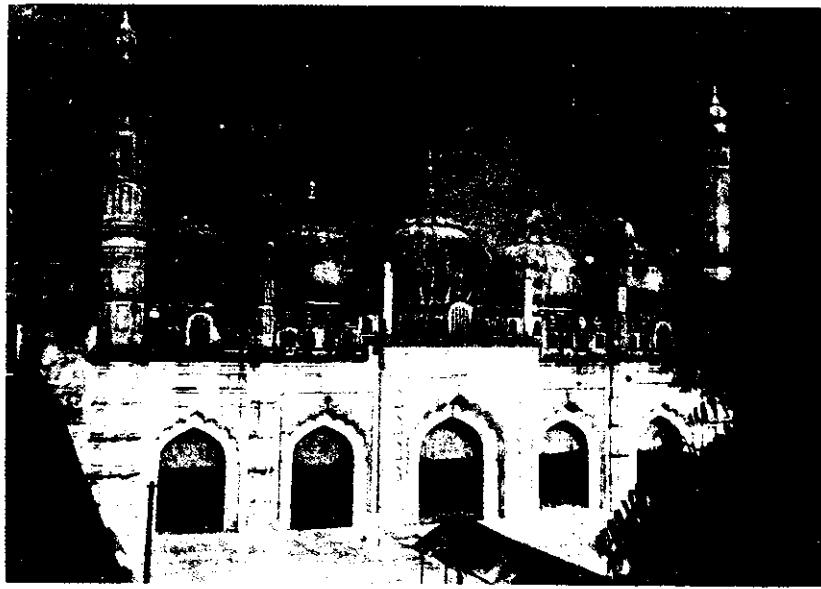
منشی مہربان علی کے تعمیر کرائے ہوئے محل کی برجیاں

جی ٹی روڈ پر واقع منشی مہربان علی کا مقبرہ

پائیں باغ اور بارہ دریاں دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی مہربان علی نے ایک بڑا شفاخانہ بھی تعمیر کرایا جو ان کی وفات کے بعد جاری نہ رہ سکا۔ یہ عمارت اب ویران پڑی ہے۔ آپ نے ایک نہایت خوبصورت عمارت بلند شہر میں بھی تعمیر کرائی جس کا ذکر ڈسٹرکٹ گزٹ میں ملتا ہے۔ اس عمارت کی تعمیر پر مولانا الطاف حسین حالی نے فارسی میں قطعہ تاریخ کہا جو دیوان حالی مطبوعہ انوارالمطابع لکھنؤ مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۲۲ء میں شامل ہے۔ قطعہ ہے۔

علی آں سید والا کہ باشد — بنا مش مہرباں جزوے ز اجزا
بود باذات او تو ام سیادت — چناں کز نام او مہراست پیدا
چوں ایں کاشانہ رابنیاد بنہاد — بعہد حاکم بیدار و دانا
گروس آں فیض گستر کز وجودش — شد ایں معمورہ چوں گلشن سراپا
چنیں گفتمش حالی سال تعمیر — مکانِ بینظیر آباد بادا

"مکانِ بینظیر" سے عمارت کا سال تعمیر ۱۲۹۹ھ نکلتا ہے۔ منشی مہربان علی نے گلاوٹھی ہی میں انتقال کیا۔ آپ کا مقبرہ بستی سے باہر جی ٹی روڈ پر واقع ہے اور ساتھ ہی ان کی تعمیرکردہ ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔

حافظ سید رحمت اللہ

آپ کے والد گرامی سید نعیم اللہ دہلی کے نزدیک ایک بستی بدرپور کے ساکن تھے اور بعد میں گلاوٹھی میں آکر آباد ہوئے۔ آپ کے دادا کا نام سید محمد یوسف تھا جو گردیز افغانستان سے آ کر ملتان میں آباد ہوئے' جن کا مزار ملتان میں حرم دروازے پر آج بھی باقی و قائم ہے۔ حافظ سید رحمت اللہ کے مورث اعلیٰ اور سید محمد یوسف کے والد حضرت امام موسیٰ رضا تھے جن سے سادات گردیزی و سالاری کا سلسلہ منسوب ہے۔

حافظ سید رحمت اللہ ایک برگزیدہ شخصیت تھے اور دین کی خدمت کا بے پناہ

جذبہ رکھتے تھے چنانچہ آپ نے گلاؤٹھی میں ایک عیدگاہ اور ایک مسجد تعمیر کرائی جو مسجد رحمت کے نام سے موسوم ہے۔ آپ آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ تھے اور معلم کے عہدہ پر فائز تھے۔

آپ کے بارے میں سید محمد حسینی اپنے فارسی رسالہ "تذکرہ الاقرباء و شجرۃ الاولیاء" میں لکھتے ہیں:

"سید رحمت اللہ بڑے جلیل القدر، عالی ہمت اور ذی جاہ شخص تھے، کم ایسے بھائی ہونگے جنہیں ان سے کسی نہ کسی طرح کوئی فیض نہ پہنچا ہو اور مراعات حاصل نہ ہوئی ہوں۔ آپ ہر سال کئی بار لنگر کرتے جس میں قصبہ کا ہر آنے جانے والا مہمان ہوتا، آپ نے چند پختہ کنویں تیار کرائے تھے اور ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ میر غلام حسین مفتون نے جس کی تاریخ تعمیر لفظ "رحمت خدا" (۱۲۵۳ھ) سے نکالی۔ یہ مسجد انتہائی مضبوط بنیادوں پر تعمیر کی گئی، آپ کی تعمیر کردہ عمارتوں میں ایک جدید عیدگاہ بھی ہے، اپنی رہائش کیلئے آپ نے ایک انتہائی خوبصورت وسیع و عریض، پختہ اور گچ کاری کا ایسا مکان تعمیر کرایا کہ اس قصبہ میں اور کوئی دوسرا اس جیسا نہیں ہے، انتہائی نیک نامی کے ساتھ زندگی گزارنے کے بعد اس جہان فانی سے آپ نے ۱۲۶۵ھ میں عالم باقی کی طرف کوچ کیا، آپ کی قبر کے گرد چار دیواری اور اوپر گنبد بنا ہے

نمرد آنکہ ماند پس از وی بجائی
پل و مسجد و چاہ و مہماں سرائی

آپ نے دو بیٹے یادگار چھوڑے سید برکت اللہ اور سید شرافت اللہ، اپنے ہم عصروں میں دونوں ممتاز سید برکت اللہ کے چند

صاحبزادے ہیں ان میں سید اللہ اور کرم اللہ کلام پاک حفظ کر رہے ہیں۔" (اردو ترجمہ)

سید برکت اللہ

آپ حافظ سید رحمت اللہ کے فرزند تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شہادت کے عظیم رتبے سے مشرف ہوئے۔ آپ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی فوج میں ملازم تھے۔ جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو آپ نے انگریزوں کے خلاف نہایت بہادری سے جنگ میں حصہ لیا۔ جب بہادر شاہ معزول ہوئے تو انگریزوں نے ان تمام لوگوں کو جنہوں نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا گرفتار کرلیا' انہیں گرفتار شدگان میں سید برکت اللہ بھی تھے' چنانچہ آپ کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی اور اس سزا پر عملدرآمد ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کو بلند شہر میں کالا آم کے مقام پر پھانسی دیکر کیا گیا۔ آپ کا مزار بلند شہر ہی میں واقع ہے۔ آپ کی تمام جائیداد ضبط کرلی گئی لیکن آپ کی بیوی نے ضبط شدہ جائیداد میں سے ایک مکان جو گلاؤٹھی میں محل کے نام سے موسوم ہے اپنے زیورات فروخت کرکے خرید لیا اور اس طرح جنگ آزادی کے ایک سپاہی کی بیوہ کو سر چھپانے کیلئے جگہ میسر آئی۔

صوفی سید محمد حسن نقشبندی

آپ ۱۸۴۰ء کے قریب گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ شاہ عبدالعزیز دہلی میں حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ پھر جب منشی سید مہربان علی اور شاہ ولایت علی کی کوششوں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے گلاؤٹھی میں مدرسہ منبع العلوم کا افتتاح کیا تو حضرت صوفی سید محمد حسن نقشبندی کو اس کا پہلا مہتمم مقرر کیا گیا۔ آپ نے مہتمم کی حیثیت سے جب کوئی تنخواہ لینا قبول نہ کیا تو آپ کو مدرسہ میں استادِ فارسی کا منصب تفویض کیا گیا تب آپ نے مدرسہ سے تنخواہ لینا منظور کیا۔ آپ حضرت شاہ عبدالغنی کے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ سے منسلک تھے اور ذکر و فکر و شب بیداری میں مصروف

رہتے تھے۔ آپ کے شاگردوں میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد اور مشہور بزرگ پیر جی عبداللہ کے صاحبزادے میاں محمد منصور (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بھانجے) نے بڑا نام پایا۔ میاں صابر شاہ نقشبندی آپ کے شیخ طریقت تھے۔ حضرت شیخ مہاجر مکی سے بھی آپ کو اجازت حاصل تھی۔ آپ اخفائے حال کا بڑا اہتمام فرماتے تھے اور عام بیعت سے اجتناب برتتے تھے اسی لئے تقریباً پندرہ افراد سے زیادہ آپ کے مرید نہ ہوئے۔ آپ نے اپنی تمام زمین بیچ ڈالی تھی اور دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ آپ کے والد میر عنایت علی کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شرکت کی پاداش میں پھانسی کا حکم ہوگیا تھا لیکن آپ نے کبھی ایک انگریز فوجی افسر کی جان بچائی تھی اس نے آپ کو چھپا دیا اور شہادت دی کہ آپ بے قصور ہیں۔ چنانچہ پھانسی کا حکم منسوخ ہوا اور آپ کی جان بچ گئی تاہم جائیداد کی ضبطی کا حکم ہوا۔ آپ کو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔

صوفی سید محمد حسن کی اولاد میں نامور شخصیات پیدا ہوئیں جن میں آپ کے فرزندان اور یگانہ روزگار اطباء حکیم محمد ارشد اور حکیم محمد صالح شامل تھے۔ دوسرے بیٹوں میں سید فخر الحسن، سید ابوالحسن اور سید شمس الحسن تھے۔ سید فخر الحسن کے فرزند سید راغب حسن واسطی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور قیام پاکستان کے بعد کراچی میں انتقال ہوا۔ ایک اور بیٹے سید شاہد حسن واسطی پاکستان ائرفورس سے بحیثیت ونگ کمانڈر ریٹائر ہوئے۔ ان کا انتقال بھی کراچی ہی میں ہوا۔ منجھلے بیٹے سید محمود حسن واسطی نہایت دل آویز شخصیت کے مالک تھے جن کے ایک فرزند سکواڈرن لیڈر خالد واسطی کو پاکستان فضائیہ کی خدمات کے دوران شہادت کا اعزاز نصیب ہوا جب ان کا سی ۱۳۰ طیارہ راولپنڈی اور گلگت پرواز کے دوران فضائی حادثہ کاشکار ہوگیا۔ سید ابوالحسن انگریزی عہد میں پولیس میں ملازم تھے اور تقسیم ملک سے قبل ہی گلاؤٹھی میں انتقال کرگئے تھے ان کے بڑے فرزند سید بدرالحسن واسطی نے بھی پولیس ہی کی ملازمت اختیار کی اور پاکستان آکر ریٹائر ہوئے۔ ان کی اہم ترین خصوصیت گلاؤٹھی سے محبت تھی اور عزیز و اقارت کا احترام۔ سید بدرالحسن جنہوں

نے کراچی میں انتقال کیا آخر وقت تک اعزاء کی تنظیم اخوان السادات گلاؤٹھی کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا اور عزیزوں کیلئے حصول مفادات میں پیش پیش رہے۔ دوران ملازمت بھی ایک ذہین اور قابل پولیس آفیسر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ شعر و ادب کا خاص ذوق رکھتے تھے۔

حکیم محمد ارشد کی اولاد میں حکیم محمد ارشاد نے طبابت میں بزرگوں کے نام کو زندہ رکھا۔ پاکستان آنے کے بعد بھی انہوں نے جہانگیر روڈ پر مدتوں مطب کیا جس سے ہزاروں افراد فیضیاب ہوئے۔ ان کا انتقال کراچی ہی میں ۱۹۹۸ء کے اوائل میں ہوا۔ سید شمس الحسن کی اولاد میں سید محمد نے ایک مذہبی سکالر اور عالم دین کی حیثیت سے اپنے عہد میں عزت و احترام کا مقام حاصل کیا۔ وہ ایک وسیع النظر اور بذلہ سنج شخصیت کے مالک تھے، جس بزم میں بیٹھ جاتے اس کی رونق دوچند ہو جاتی۔ پاکستان کے قیام کے بعد محکمہ پولیس پنجاب میں معلم دینی کے منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۵۸ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ حکیم محمد صالح کی اولاد میں حکیم محمد مصلح بلند پایہ طبیب تھے جبکہ مولانا محمد اصلح الحسینی ایک جامع الصفات شخصیت کے مالک ہیں اور عظیم المرتبت مذہبی سکالر ہیں۔ ان کا ذکر قدرے تفصیل سے آگے کیا جائے گا۔ تیسرے بھائی مفتی محمد اکمل تھے جنہوں نے کراچی میں انتقال کیا اور بحیثیت عالم دین شہرت حاصل کی۔

قاضی سید فضل اللہ

اپنے عہد کی ایک جیّد اور مقتدر شخصیت تھے۔ شاہان مغلیہ دہلی سے ذاتی مراسم تھے۔ گلاؤٹھی اور نواح کے مواضعات کے جو اضلاع میرٹھ اور بلند شہر میں شامل ہیں قاضی القضات بھی رہے۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد شہزادہ جواں بخت کی شادی مالاگڑھ کے نواب ولیداد خاں کی بھانجی سے ہوئی تو دہلی سے آئی ہوئی شاہی برات نے گلاؤٹھی میں قیام کیا اور قاضی القضات قاضی سید فضل اللہ کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ آج بھی گلاؤٹھی کا ایک بہت بڑا محلّہ قاضی سید فضل اللہ کے نام سے منسوب ہے۔ ایک بڑے علاقے میں قاضی خاندان کی موروثی جائیداد

پر مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مثلاً" تیلی' دھوبی' کوہلی' لوہار' بھرجی اور راجپوت چھوٹے سکونت پذیر ہیں۔

قاضی سید سمیع اللہ

قاضی خاندان کی ایک اور نمایاں شخصیت قاضی سید سمیع اللہ تھے۔ آپ رڑکی کالج کے سند یافتہ انجینئر' ماہر قانون اور سیاست و تدبر میں یگانہ روزگار تھے۔ آپ نے کچھ عرصہ حکومت ہند کی ملازمت کی اور بطور انجینئر مختلف مقامات پر تعینات رہے لیکن جلد ہی نوکری سے جی بھر گیا اور ملازمت ترک کرکے زمینداری کے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ مغل فرماں رواؤں کی عطا کردہ جاگیریں تو جنگ آزادی کی پاداش میں ضبط کرلی گئی تھیں لیکن بعد میں اکابر خاندان نے سات دیہات میں کافی رقبہ جات خرید کر زمینداری ایک حد تک بحال کرلی تھی۔ ان دیہات میں سوھن پور' ہربند پور' عبداللہ پور موڑی (خورد و کلاں) مٹھے پور اور سروندھن شامل تھے۔ گلاؤٹھی میں سکنی مکانات' احاطے' دوکانیں اور مختلف لوگوں کے زیرقبضہ ایک موروثی بستی اس کے علاوہ تھی۔

قاضی سید سمیع اللہ سر سید احمد خاں کے ہم خیال تھے اور نئی روشنی کا اثر قبول کرچکے تھے۔ وہ مسلمان بچوں کیلئے ابتدائی اسلامی تعلیم کے بعد انگریزی سکول اور کالج کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جب خلافت کی تحریک شروع ہوئی تو انہیں ضلع بلند شہر کی خلافت کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے عوام نے اتفاق رائے سے منتخب کیا۔ وہ اکثر گلاؤٹھی سے بلند شہر' ہاپوڑ' میرٹھ یا علی گڑھ جاتے اور مقدمات کے سلسلہ میں یا ازراہ دلچسپی عدالتوں میں وکلاء سے ملاقاتیں کرتے۔ مشہور وکیلوں سے ان کے قریبی روابط تھے۔ بلند شہر کے مشہور قانون داں ملا نجیب اللہ خاں ان کے ہم جماعت' دلی رفیق اور عزیز دوست تھے۔ بلند شہر ہی کے سید افضال الرحیم (نو بیٹوں والے) اور سید حسن برنی وکیل ان کے خاص دوستوں میں تھے۔

قاضی سمیع اللہ کے اکلوتے فرزند سید اختر عالم واسطی نے بھی بھرپور زندگی

گزاری اور تعلیم کے شعبہ میں اپنے والد کے نظریات کو آگے بڑھاتے ہوئے اہم خدمات انجام دیں انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے گریجویشن کیا اور تحریک پاکستان کے دوران ایک طالب علم رہنما کی حیثیت سے حصول پاکستان کیلئے دن رات کام کیا۔ علی گڑھ ہی میں طالب علمی کے دوران پاکستان کے موضوع پر ایک پمفلٹ چھپوایا جو بہت پسند کیا گیا اور تحریک کے دوران طالب علموں کے دوروں میں بہت کام آیا۔ اختر واسطی نے پاکستان آکر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے' ایل ایل بی کیا اور لاہور میں ایک قابل وکیل کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ان کی طبیعت میں مروت اور دوست نوازی کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں جن سے بے شمار اپنے اور پرائے فیضیاب ہوئے۔ اختر واسطی کا سب سے بڑا کارنامہ کراچی میں ایک مونیسٹری کا قیام تھا۔ یہ تعلیمی ادارہ آج بھی قائم ہے اور ان کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اختر عالم واسطی کا انتقال کراچی میں ہوا اور وہ اپنے ہی تعلیمی ادارے کے احاطے میں مدفون ہیں۔ جبکہ قاضی سید سمیع اللہ نے پاکستان آنے کے بعد لاہور میں انتقال کیا۔

قاضی سید حبیب اللہ

آپ قاضی سید امین اللہ کے فرزند اور قاضی سید سمیع اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ طبیہ کالج کے سند یافتہ حکیم' حافظ قرآن اور قاری تھے۔ اجداد کو شاہان دہلی سے باون علاقے بطور جاگیر عطا ہوئے تھے۔ یہ علاقے تو جنگ آزادی میں انگریزوں کی مزاحمت کی پاداش میں ضبط کر لئے گئے تھے لیکن آپ ان علاقوں کے قاضی تھے۔ انگریزی' اردو اور فارسی زبانوں اور ان کے ادب سے خاص شغف تھا جس کے نتیجہ میں آپ کے ذاتی اثاثوں میں ایک بہت بڑا کتب خانہ شامل تھا جس میں موجود نادر کتب اور قلمی نسخہ جات کو دیکھنے کیلئے دور دراز مقامات سے اکثر محققین اور سکالرز آتے رہتے تھے۔ آپ کو درس و تدریس سے خصوصی لگاؤ تھا چنانچہ گلاؤٹھی کے وہ نوجوان جو میرٹھ' علی گڑھ یا دہلی کے کالجوں اور یونیورسٹی میں پڑھتے تھے جب گلاؤٹھی آتے تو قاضی صاحب سے علمی استفادہ کرتے۔ آپ کو

انگریزی ادب پڑھانے میں خصوصی دلچسپی تھی اور ایک طبیب کی حیثیت سے بھی خدمت خلق میں مصروف رہتے تھے۔ قصبہ کے صاحب بصیرت لوگوں میں شمار ہوتا تھا اور بے حد احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اگست ۱۹۴۸ء میں لاہور میں اپنے اہل خانہ کے پاس لاہور آگئے لیکن اپنے ذخیرہ کتب سے محرومی کا صدمہ ساتھ لائے۔ صحت دن بدن گرتی گئی اور جسے آخری ضرب کاری قائداعظمؒ کی رحلت نے لگائی۔ چنانچہ آپ نے قائداعظمؒ کی رحلت سے ایک ہفتہ بعد ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

قاضی سید حبیب اللہ کو عظیم شاعر اور داغ دہلوی کے شاگرد خاص حضرت فدا گلاؤٹھوی کے داماد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ آپ کی اہلیہ سیدہ تمیز فاطمہ بھی ایک خوش فکر شاعرہ تھیں۔ زوجہ اول سے ایک فرزند سید رحیم اللہ قابل نے اردو و فارسی شاعری، صحافت، ادب اور خطابت میں بڑا نام پیدا کیا۔ آپ قابل گلاؤٹھوی کے نام سے برصغیر کے علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں جانے پہچانے گئے۔ آپ کا ذکر قدرے تفصیل سے آگے کیا جائے گا۔ راقم الحروف (سید منصور عاقل) کو بھی قاضی سید حبیب اللہ کے فرزند ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہ انہیں کا فیضان تربیت تھا کہ ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہو جانے کے بعد حالات کی نامساعدت کے باوجود اعلیٰ تعلیم کے حصول سے سرخرو ہوا اور پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ اور سیاسیات میں ماسٹرز ڈگریاں حاصل کیں اور پنجاب کی جامعات میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے علاوہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہنے کا اعزاز حاصل کیا اور جون ۱۹۹۴ء میں حکومت پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل نیشنل سیونگز کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ اللہ کے فضل و کرم سے بیرون ملک جانے اور ملک کی نمائندگی کرنے کے متعدد مواقع ملے اور یہ توفیق بھی ارزانی ہوئی کہ امور ملازمت کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے متعلق نصف درجن کتب کی تصنیف و تالیف کا اعزاز حاصل کیا۔

سید محمد حسین یقین

سادات پلولیان کے مستند علمی گھرانے سے آپ کا تعلق تھا۔ مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی جسے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے قائم فرمایا اس کے قیام کی مساعی میں منشی مہربان علی کی طرح آپ کے تایا سید ولایت علی کی مساعی کو بھی کافی دخل تھا۔ آپ کے والد سید فدا علی صاحب اپنے دور کے مشہور بزرگوں میں سے تھے اور ولایت کے مختلف خانوادوں سے آپ کے گہرے روابط تھے چنانچہ سید محمد حسین یقین نے ایسے پاکیزہ ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کے نامور استادوں میں حضرت امام بخش صہبائی شامل ہیں جنہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران انگریزوں نے نہایت سفاکی سے قتل کیا۔ جناب یقین فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے مستند شاعر تھے۔ فارسی میں ہجر تخلص فرماتے اور اردو شاعری میں یقین آپ کا تخلص تھا۔

سر سید احمد خاں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''آثار الصنادید'' میں سید محمد حسین یقین کا ذکر کیا ہے اور آپ کو امام بخش صہبائی کے ارشد تلامذہ میں سے بتایا ہے۔ آپ کا نمونہ کلام بھی سرسید نے پیش کیا ہے۔ سید عبدالرشید واسطی (برادر سید عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی) نے حضرت یقین کی صاحبزادی کی تاریخ وفات لکھتے ہوئے حضرت یقین کو یادگار صہبائی اور ان کے والد بزرگوار سید فدا علی کو سید السادات کہا ہے۔

والدش یادگار صہبائی ۔ جدّ او بود سیّد السّادات

قصبہ گلاؤٹھی کے عظیم شاعر سید عبدالوحید فدا اور ان کے برادر خورد سید عبدالرشید واسطی دونوں حضرت یقین کے شاگرد تھے۔ ممکن ہے حضرت فدا نے ابتدائی ذوق سخن میں بھی حضرت یقین سے رہنمائی حاصل کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت فدا کا تخلص حضرت یقین کے والد سید فدا علی کے قرب کو ظاہر کرتا ہو کہ ان کے والد کے نام جیسا تخلص اختیار فرمایا۔ یقین گلاؤٹھوی فدا صاحب کے پہلے خسر بھی تھے اور صاحب دیوان تھے۔ ان کے چار صاحبزادگان تھے شمس الحق خیال، انوار الحق

کمالی (کنیت ابوالفرح)' منظور الحق جود اور افضال الحق۔ اول الذکر تینوں بیٹے بہت اچھے شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ حضرت یقین داغ کی ٹکر کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ علم الحساب اور اقلیدس میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ طلباء راستے میں چلتے ہوئے ان سے حساب و اقلیدس کے مشکل سوال پوچھتے اور یہ چلتے چلتے انہیں حل کرتے جاتے تھے۔ حضرت محمد حسین یقین کامل اطباء میں سے تھے۔ شیخ الرئیس کی کتاب قانون شیخ پر انہوں نے حاشیہ بھی لکھا ہے۔

سید عبدالوحید فدا گلاوٹھوی

دو آبہ گنگ وجمن کی سرسبز و شاداب سرزمین میں واقع سادات کی معزز و معروف بستی گلاوٹھی نے جن جلیل القدر ہستیوں کو جنم دیا ان میں جناب فدا گلاوٹھوی بحیثیت شاعر سرفہرست نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو جو ہمہ گیر اعتراف حاصل ہوا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نہ صرف ان کے عہد کی معروف و مستند علمی و ادبی شخصیات نے ان کے افکار اور فن کو خراج عقیدت پیش کیا بلکہ بعد کے ممتاز اہل قلم' دانشور اور نقادوں نے بھی فدا صاحب کی شاعری کو موضوع اظہار بنایا اور اپنے ناقدانہ تبصروں میں ان کے اوصاف فکر و فن کا اعتراف کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر سید سبط حسن فاضل زیدی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں فدا صاحب کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں :

> "عبدالوحید نام فدا تخلص قصبہ گلاوٹھی ضلع بلند شہر کے ایک ممتاز حسنی الواسطی خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ والد بزرگوار مولوی سید حیات اللہ نقشبندیہ و قادریہ سلسلہ کے ایک برگزیدہ صاحب طریقت بزرگ تھے جن کا انتقال ضلع فتح پور ہسوہ میں ہوا۔ جہاں وہ تحصیلدار تھے۔ مولانا احسن مارہروی نے ان کا سن ولادت ۱۲۷۸ھج لکھا ہے ان کی ملازمت کا زمانہ اپریل ۱۸۹۴ء میں ضلع مین پوری میں شروع ہوا اور مارچ ۱۹۲۵ء میں
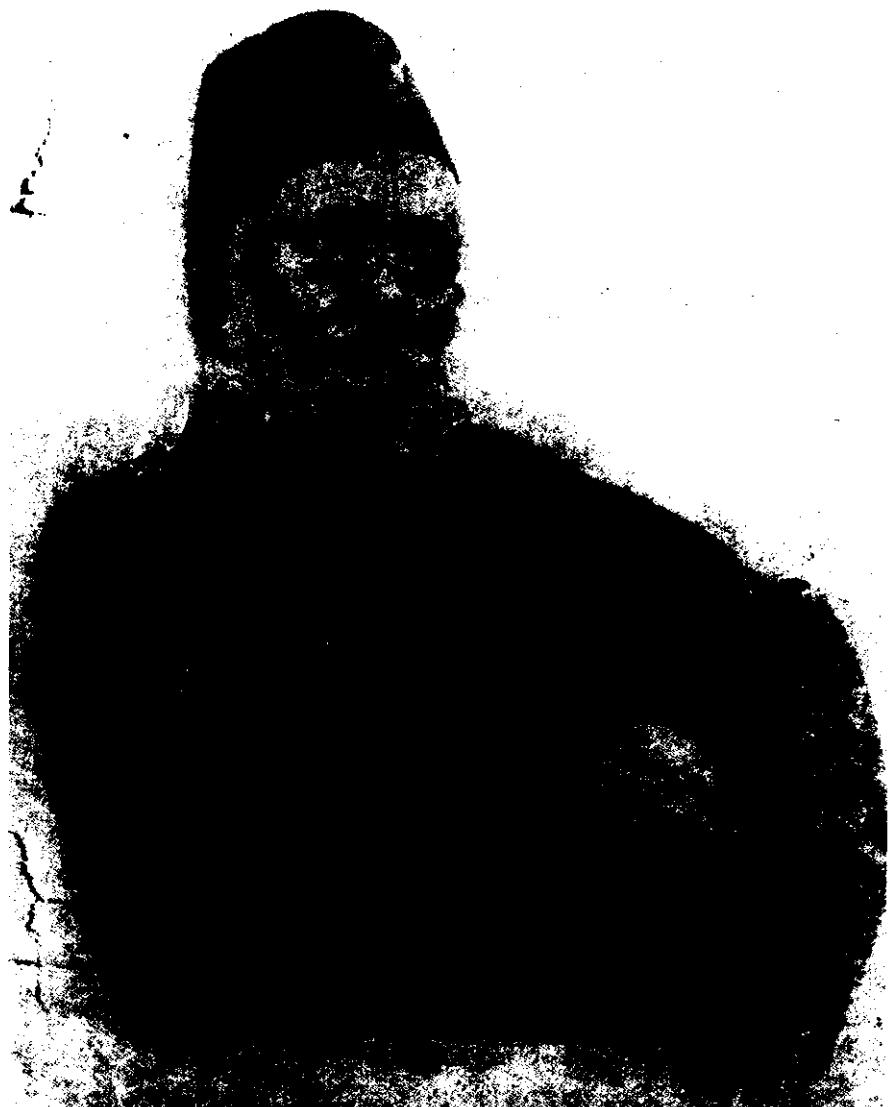
سید عبدالوحید فدا گلاوٹھوی

وہیں ختم ہوگیا۔ شاعری کا شوق عنفوان شباب ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں اپنا کلام مولوی سید کفایت علی ہاپوڑی کو دکھاتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت داغ دہلوی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ نوح ناروی نے ان کو داغ کے ممتاز تلامذہ میں شمار کیا ہے اور مولانا احسن مارہروی نے ان کا شمار داغ کے نورتنوں میں کیا ہے"۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی جن کا شمار اس صدی کے ممتاز ترین نقادوں میں ہوتا ہے۔ جناب فدا کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فدا صاحب اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں ان کے دم سے بڑی رونق تھی اور اس عہد کی ادبی دنیا میں ان کا بڑا احترام تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے غزل گو شاعر تھے اور اس زمانے میں ان کی شاعری کی شہرت آسمان پر پہنچ چکی تھی جن لوگوں نے بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کا ماحول دیکھا ہے وہ اس حقیقت کی تصدیق کریں گے کہ اس زمانے کے مشاعرے ان کے بغیر کچھ پھیکے پھیکے نظر آتے تھے۔ فدا صاحب کو فارسی زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ فارسی کے بھی اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ فارسی کی مزاج دانی نے ان کی اردو شاعری میں بڑا رچاؤ پیدا کیا ہے اور اس میں ایسی رنگینی و رعنائی، شگفتگی و شادابی پیدا کی ہے جو شاعری کی جان اور شعریت کی پہچان ہے۔ فدا صاحب نے فارسی اور اردو کی روایت کو شیر و شکر کرکے اپنی شاعری میں ایک ایسا سنگم پیدا کیا ہے جو انہیں ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر ثابت کرتا ہے"۔

ممتاز مذہبی سکالر فاضل دیوبند اور گلاؤٹھی ہی کی ایک صاحب بصیرت شخصیت

حضرت مولانا اصلح الحسینی جنہیں فدا صاحب سے قربت کا شرف بھی حاصل رہا ہے اپنے ایک مطبوعہ مقالے میں فرماتے ہیں:

> "فدا مرحوم نے گلاؤٹھی کے مشہور عربی مدرسہ منبع العلوم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے قائم کیا تھا۔ فدا صاحب نے صوفی محمد حسین نقشبندی کے علاوہ محمد حسین یقین سے بھی تعلیم حاصل کی تھی جو امام بخش صہبائی کے ارشد ترین تلامذہ میں سے تھے۔ گلاؤٹھی میں فدا صاحب کے معاصرین میں شمس الحق خیال، انوارالحق کمالی اور منظور الحق جود صاحب دیوان شعراء تھے۔ یقین، صہبائی اور نواب مرزا داغ کی ادبی تربیت سے استفادہ کرکے وہ تسلیم و اعتبار کی اس بلندی تک پہنچے کہ داغ کے نورتنوں میں شمار ہوئے اور ان کے جانشین تسلیم کئے گئے۔ فدا کے شاگرد اور استفادہ کرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ پنشن کے بعد گلاؤٹھی آئے تو یہاں کی اداس اور افسردہ فضا میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ گلاؤٹھی کے علاوہ ہاپوڑ، بلند شہر، خورجہ اور میرٹھ، قرب وجوار کے قصبات اور شہروں میں شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میں نے انہیں بیک وقت دس دس شعراء کے کلام کی اصلاح کرتے دیکھا ہے"۔

نوح ناروی نے اپنے دیوان "طوفان نوح" میں ۲۶ دسمبر ۱۹۲۴ء کو گلاؤٹھی میں منعقد ہونے والے اس کل ہند مشاعرہ کا ذکر کیا ہے جس کا اہتمام حضرت فدا نے اپنی بیٹی سیدہ نوازی خاتون کی سید رحیم اللہ قابل گلاؤٹھوی کے ساتھ شادی کے موقع پر کیا

تھا اور جس کے سبب گلاؤٹھی کو ادبی و شعری تاریخ میں ایک ناقابل فراموش مقام حاصل ہوگیا تھا۔ اس عظیم الشان محفل شعروسخن میں اردو شاعری کی تاریخ کو مزین و منور کرنے والے نہ صرف عظیم شعرائے کرام نے برصغیر کے طول و عرض سے شرکت کی تھی بلکہ برطانوی عہد کی اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز علم دوست اور سخن پرور شخصیات کی بھی شرکت سے پتہ چلتا ہے کہ فدا صاحب کا اثر و احترام صرف ہم عصر شعراء ہی میں نہیں تھا بلکہ حکومتی حلقوں میں بھی وہ واجب التعظیم سمجھے جاتے تھے۔

برصغیر پاک و ہند کے افق شاعری پر نمودار ہونے والی کہکشاں کا یہ کوکب تابندہ یقیناً اہل وطن کا سرمایہ افتخار ہے جس کا برملا اعتراف جب غیروں کو ہے تو اپنوں کو کیوں نہ ہو۔ راقم الحروف (منصور عاقل) کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ جناب فدا گلاؤٹھوی کا انتخاب کلام "برگ سبز" کے نام سے ان کے سوانحی خاکوں اور نقد و نظر کے جائزوں کے ساتھ جنوری ۱۹۹۲ء میں کتابی شکل میں مکتبہ اتحاد المصنفین اسلام آباد کی جانب سے شائع کیا ورنہ عین ممکن تھا کہ یکم مئی ۱۹۴۳ء کو گلاؤٹھی میں داعی اجل کو لبیک کہہ جانے والا یہ عظیم شاعر جس نے اردو اور فارسی میں غزل، رباعی، قصیدہ، مثنوی، حمد، نعت اور سلام و منقبت میں اپنا لوہا منوایا تاریخ کی گرد میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے روپوش ہوکر رہ جاتا۔

فدا گلاؤٹھوی کی اولاد میں پانچ بیٹے سید نواب حسن شمیم، سید ابن حسن، سید شبیر حسن، سید عزیز حسن اور سید اقبال حسن قسیم اور دو بیٹیاں سیدہ تمیز فاطمہ اور سیدہ نوازی خاتون تھیں۔ نواب حسن شمیم اور اقبال حسن قسیم خوش فکر شاعر تھے جبکہ سید شبیر حسن نے نثرنگاری میں ایک خاص اسلوب کو اپنایا اور حسن نیازی کے قلمی نام سے شہرت پائی۔ بیٹیوں میں سیدہ تمیز فاطمہ شاعرہ تھیں اور سماجی خدمات کے شعبہ میں خاص طور پر سرگرم رہتی تھیں۔ انہوں نے گلاؤٹھی میں تحریک پاکستان کے دوران خواتین میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کیلئے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

سید ابوالحسن ناطق گلاوٹھوی

آپ سید ظہور الدین کے فرزند تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب بغداد کے سادات گیلان سے ملتا ہے۔ آپ کے اجداد سید امین الدین و سید منہاج الدین اٹھارویں صدی عیسوی میں احمد شاہ ابدالی کی فوج کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آپ کے دادا سید غلام غوث نے گلاوٹھی میں کافی جائیداد اور زمین خریدی۔ آپ کے والد سید ظہور الدین بغرض تجارت رائے پور چلے گئے۔ موضع الدن ضلع میرٹھ کے سید حسین علی کی دختر سے ان کی شادی ہوئی۔ جن سے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ بڑے بیٹے سید ابوالحسن تھے جو بعد میں ناطق گلاوٹھوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ چھوٹے بیٹے سید حسن جو شاعر تھے اور حسن تخلص کرتے تھے، ۱۹۲۵ء میں طاعون کے باعث وفات پا گئے۔ والد کا انتقال ۱۹۰۵ء میں رائے پور میں ہوا جبکہ والدہ ۱۹۴۵ء میں گلاوٹھی میں فوت ہوئیں۔

سید ابوالحسن ناطق گلاوٹھوی ۱۱ نومبر ۱۸۸۶ء کو محلّہ وارث پورہ کامٹی (ناگپور) میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیمی زندگی کے تین مختلف ادوار اس طرح ہیں کہ پیدائش کے بعد سات سال کامٹی (ناگپور) ہی میں رہے اور یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ دوسرے دور میں آپ کامٹی سے ۱۸۹۴ء میں گلاوٹھی آئے اور ۱۸۹۹ء تک یعنی پانچ سال گلاوٹھی میں قیام کیا۔ اس دوران مولانا عبدالعزیز بزاز سے فارسی کتب پڑھیں اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے قائم کردہ مشہور دینی مدرسہ منبع العلوم گلاوٹھی میں عربی کتب کا درس لیا۔ تیسرے دور میں ۱۹۰۰ء میں آپ نے دینی تعلیم کی تکمیل کی اور دورۂ حدیث کیلئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ اس دور کے عظیم المرتبت بزرگوں اور اساتذہ سے آپ نے حدیث پڑھی اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں آپ کے اساتذہ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا)، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا محمد حسن مراد آبادی، مولانا محی الدین گلاوٹھوی، مولانا ماجد علی جونپوری، مولانا عبداللہ امبیٹھوی اور حکیم احمد حسن (عرف حکیم بڈھن) جیسے عظیم اہل علم شامل تھے۔

باطنی تعلیم اور تزکیہ ء نفس کیلئے آپ نے وقت کے عظیم المرتبت شیخ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی طرف رجوع کیا اور ان سے بیعت ہوئے۔ حضرت شیخ کے خلیفہ صوفی کرم حسین گلاؤٹھوی کے ساتھ بھی آپ نے خاصا وقت گزارا۔ دہلی میں کچھ عرصہ آپ نے طبابت بھی کی۔ ۱۹۰۰ء میں کم عمری میں اپنے تائے کی بیٹی سے آپ کی شادی ہوئی جن سے آپ کے چھ بچے ہوئے جو سب آپ کی زندگی ہی میں انتقال کرگئے۔ ناگپور میں آپ نے ایک بیوہ سے بھی شادی کی۔ اس بیوہ کے پہلے شوہر سے دو بچے تھے جن کی آپ نے پرورش کی۔

دیوبند میں شیخ معشوق حسین اطہرہاپوڑی کی تحریک پر آپ نے شاعری شروع کی۔ ابتدا" حضرت بیاں یزدانی میرٹھی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کے انتقال کے بعد نواب مرزا داغ دہلوی کی طرف رجوع کیا اور ان سے بذریعہ خط و کتابت اپنے کلام کی اصلاح لینے لگے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت داغ بھی انتقال فرما گئے تو اپنی طبع رسا کو رہنما بنایا۔ آپ کو حضرت داغ سے بے پناہ عقیدت تھی اور ان کا کافی کلام حفظ ہوگیا تھا۔

اگرچہ آپ کی زندگی کا زیادہ حصہ رائے پور اور ناگپور وغیرہ میں گزرا مگر آبائی وطن ہونے کے ناطے گلاؤٹھی سے آپ کو خاص انس تھا۔ گلاؤٹھی کے علمی' ادبی ماحول اور فارسی و عربی تعلیم کے دور کی خوشگوار یادیں اس قصبہ سے وابستہ تھیں۔ اس لئے خود کو آپ نے گلاؤٹھی سے منسوب کیا اور ناطق گلاؤٹھوی کہلانا پسند کیا۔ طب اور شعروادب کے علاوہ صحافت و سیاست کے میدان میں بھی آپ سرگرم عمل رہے۔ ناگپور کے اخبارات و جرائد میں بہت کچھ لکھا۔ "امید" "اردو اخبار" اور "جدوجہد" میں حالات حاضرہ پر لکھتے رہے۔ متعدد مزاحیہ قطعات بھی رقم کئے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۰ء تک ناگپور میونسپلٹی کے ممبر رہے۔ کچھ عرصہ مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں سی پی برابر کی نمائندگی بھی کی۔

آپ کی پانچ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں جن میں "نطق ناطق"

نظموں کا مجموعہ مطبوعہ میرٹھ ۱۹۱۲ء۔ "کلیل میں غلیل" شاعری اور بعض جدید شعراء سے متعلق طویل مکتوب مطبوعہ بنگلور ۱۹۵۰ء۔ "سبع سیارہ" مکاتیب و مضامین مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۰ء۔ "کنزالمطالب" دیوان غالب کے تقریباً چوتھائی حصہ کی شرح مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۸ء اور "دیوان ناطق" مطبوعہ ناگپور ۱۹۷۶ء شامل ہیں۔ بعض تصانیف ابھی تک غیرمطبوعہ ہیں جن میں "تصریحات اردو" کے نام سے مجموعہ مضامین اور ایک اور کتاب بعنوان "استفسارات و جوابات" شامل ہیں۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد خاصی ہے جن میں سید امیر حسن امیر گلاؤٹھوی، مولانا عبدالباری آسی الدنی، شاکر ناطقی، ڈاکٹر خوشتر کھنڈوی، ظفر ناگپوری، زخمی راجنا ندگانوی، مظفر حسین غافل، رفعت بریلوی، آغا حسین آغا، عبدالصمد اختر اور ابراہیم خلیل وغیرہ ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

۱۹۶۸ء سے آپ کی صحت بگڑنا شروع ہوئی۔ ناگپور میموریل ہسپتال میں بھی داخل رہے۔ بالآخر ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء نصف شب کے قریب راہی ملک عدم ہوئے اور ناگپور مومن پورہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ انا للہ و انا علیہ راجعون۔ ناگپور میونسپل کارپوریشن نے ایک چوک کو مولانا ناطق چوک اور ایک شاہراہ کو مولانا ناطق روڈ کے نام سے موسوم کیا۔

حکیم سید مقصود علی

آپ خاندانی حکیم اور مشہور نباض ہونے کے علاوہ عالم دین بھی تھے۔ حکیم صاحب نے مراد آباد کے دینی مدرسہ سے سند حاصل کی تھی اور وہیں آپ کی باقاعدہ دستار بندی بھی ہوئی تھی۔ سادگی، شرافت و نجابت اور اخلاص و محبت کا پیکر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں ایسی شفا عطا فرمائی تھی کہ ہزاروں بندگان خدا اپنی زندگیوں سے مایوس ہوجانے کے باوجود صحت یاب ہوئے اور اس طرح آپ کی شہرت نزدیک و دور پھیلتی گئی۔ حکیم سید مقصود علی اپنی زندگی ہی میں ایک روایت بن گئے تھے اور یہ نام اہل گلاؤٹھی کیلئے آج بھی قابل فخر سمجھا جاتا ہے۔ ہر طرح کے طمع اور لالچ سے بے نیاز حکیم صاحب عزیز و اقارب ہی نہیں بلکہ ہر کس و ناکس کے لئے زخم

کے مرہم کا درجہ رکھتے تھے۔ عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ ان کے ایک عقیدت مند موضع اوسترہ کے رئیس انہیں لانے لیجانے کے لئے اپنا ہاتھی بھیجتے۔ ہاتھی اور فیل بان حکیم صاحب کے دروازہ پر انتظار میں کھڑے ہوتے اور حکیم صاحب روانگی سے قبل اپنے ہاتھوں سے نمک مرچ کی چٹنی پیس کر اور زمین پر بیٹھ کر روٹی کے نوالوں سے لگا لگا کر کھاتے حالانکہ ان کے ارادت مندوں کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ اگر وہ چاہتے تو اپنے لئے ہی نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کیلئے بھی دولت کے انبار لگا سکتے تھے۔ اورنگ آباد کے نواب حاتم علی آپ کے خاص شیدائی تھے۔ یہی استغنا اور درویشی تھی کہ ہر کوئی حکیم صاحب کی دل سے عزت کرتا تھا۔ چھوٹا قد تھا۔ ایڑیاں اونچی کرکے چلتے تھے اور بات کرتے وقت ڈاڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے رہتے۔ سردی ہو یا گرمی سوائے عید بقر عید کے شیروانی نہ پہنتے۔ البتہ سردیوں میں روئی بھری صدری پہنا کرتے۔ اکثر رضائی اوڑھ کر بھی باہر نکلتے تھے۔ سر ڈھانپنے کیلئے پگڑی استعمال کرتے تھے۔ ان کے ایک بھائی سید عابد علی تھے جو شاعری کا شوق بھی رکھتے تھے۔

سید عابد علی کے فرزند اور حکیم سید مقصود علی کے بھتیجے سید حامد علی بھی اپنے تایا کے فیضان نظر کے نتیجہ میں حکیم ہوئے۔ قدرت نے انہیں بھی سچے جذبات اور اخلاص کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ سادات کے سماجی اور معاشرتی معاملات میں اس قدر دخیل تھے کہ بزرگوں کی روایات کی پاسداری میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو جاتے۔ تحریک پاکستان میں بھی حکیم سید حامد علی نے بھرپور حصہ لیا اور گلاؤٹھی کی سطح پر مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ میں پیش پیش رہے۔ آپ کے فرزند اکبر ڈاکٹر سید سعید اختر جنہوں نے پاکستان آنے کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ نارتھ ناظم آباد کراچی میں مقیم ہیں۔ جہاں حکیم سید حامد علی کا انتقال ہوا اور ایک قابل' وضعدار اور اخلاص پیشہ معالج کی حیثیت سے اپنے بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

حکیم سید عظمت اللہ

عظیم المرتبت اطباء میں ایک اور نام جس پر اہل گلاوٹھوی فخر کرسکتے ہیں وہ نام حکیم سید عظمت اللہ کا ہے۔ آپ بھی ایک بلند پایہ طبیب اور نباض تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بھی جب آپ راولپنڈی منتقل ہوگئے تو طبابت کے شغل کو انسانی خدمت کے جذبہ کے ساتھ جاری رکھا اور یہاں بھی بحیثیت حکیم و طبیب شہرت و عزت حاصل کی۔ آپ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ آپ جنگ آزادی کے شہید مولوی سید برکت اللہ کے پوتے تھے۔ آپ کے والد کا نام عطاء اللہ تھا جو حافظ قرآن بھی تھے۔ حکیم سید عظمت اللہ نے بھی حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی اور اس کے بعد عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کوشعر وادب سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ حکمت و طبابت کی تعلیم کیلئے اپنے عہد کی معروف شخصیت حکیم محمد احمد خاں کی شاگردی اختیار کی۔ جن کی وساطت سے آپ کو کئی ریاستوں مثلاً کپور تھلہ اور جودھپور وغیرہ میں رہنے کا موقع ملا۔ آپ نے اپنے فرزند اکبر سید تحسین احمد سالاری کو انگریزی تعلیم دلائی جنھوں نے ایم اے' ایل ایل بی کیا اور جی ایچ کیو میں ایک سولین آفیسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ یہیں سے راولپنڈی میں ایک سینئر عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ سید تحسین احمد سالاری بھی اپنے والد کی طرح ایک وضعدار اور ملنسار شخصیت تھے۔ اس روایت کو اب حکیم سید عظمت اللہ کے چھوٹے بیٹے سید ممتاز اللہ سالاری نباہ رہے ہیں۔ آپ نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایم ایس سی کرنے کے بعد حکومت پاکستان کے ایک اہم شعبہ ڈیفنس سائنس آرگنائزیشن میں ملازمت اختیار کی اور یہیں سے ایک اعلیٰ عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ حکیم سید عظمت اللہ صاحب کی ایک پوتی سیدہ یاسمین سالاری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ راولپنڈی کی پہلی خاتون ایڈووکیٹ بنیں۔ ان کی چھوٹی بہن سیدہ سلطنت سالاری نے بھی ایم ایس سی کیا اور کچھ عرصہ حکومت پاکستان کی ملازمت میں رہیں۔ اب یہ دونوں بہنیں شادی کے بعد کئی برسوں سے لندن میں مقیم ہیں۔ ایک بھائی سید اسد اللہ کراچی میں اور دو بھائی سید ظفر اللہ اور سید مزمل اللہ راولپنڈی میں ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کا شمار بہ حیثیت ایڈووکیٹ راولپنڈی

کے ممتاز قانون دانوں میں ہوتا ہے۔

حکیم سید عظمت اللہ کے والد بزرگوار سید عطاء اللہ کے بارے میں ایک بات جو نہایت اہم اور قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ انہیں مختلف مسلمان فرقوں کے علماء کے درمیان مناظروں سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ وہ الدن' سراوا' ہاپوڑ' میرٹھ' بلند شہر اور سکندر آباد وغیرہ سے علماء کو گلاؤٹھی مدعو کرتے اور مناظرے منعقد کراتے۔ ان مناظروں پر منعقد ہونے والے اخراجات بھی وہ خود ہی برداشت کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک مناظرہ کی روداد کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی جو مختلف فرقوں کے نظریات پر نہایت معلوماتی دستاویز تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب بلند شہر یا میرٹھ کی بعض لائبریریوں میں آج بھی محفوظ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا کوئی نسخہ سید عطاء اللہ مرحوم کے اعزاء میں سے کسی کے پاس پاکستان میں بھی موجود ہو۔

فاطمہ بیگم

منشی سید مہربان علی کی بڑی صاحبزادی فاطمہ بیگم ایک جید اور دلیر شخصیت تھیں۔ وہ کوٹھی والی فاطمہ کے نام سے مشہور تھیں۔ علاقے کے تمام لوگ ان کا بیحد احترام کرتے تھے اور وہ بھی اپنے والد کی طرح سماجی کاموں میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔ اس وقت کی انتظامیہ بھی ان کا احترام کرتی تھی اور انہیں اہمیت دیتی تھی۔ وائسرائے' گورنر اور دیگر اعلیٰ حکام جب اس علاقے میں آتے تو ان کے مہمان ہوتے تھے۔ فاطمہ بیگم کے سب سے بڑے بیٹے سید ریاض الدین جب تک زندہ رہے گلاؤٹھی کی ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین رہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سید محمد احمد اس منصب پر فائز رہے اور آج کل بھی ان کے پوتے سید سیف الدین عرفان ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں لیاقت علی خاں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر جس حلقہ نیابت سے انتخاب لڑا اس میں گلاؤٹھی بھی شامل تھا۔ ان کی کامیابی میں اہل قصبہ خصوصاً فاطمہ بیگم نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان کے نواب اسمٰعیل خاں اور بیرسٹر اشرف کے ساتھ جو اس وقت مسلم لیگ کے صدر اور جنرل سیکرٹری

تھے گھریلو مراسم تھے۔ وہ فاطمہ بیگم کا بیحد احترام کرتے تھے۔

ریاض فاطمہ

منشی مہربان علی کی نواسی یعنی فاطمہ بیگم کی صاحبزادی تھیں۔ وہ نہایت اعلیٰ صفات کی مالک تھیں۔ ان کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑکتا تھا۔ رئیس زادی ہوتے ہوئے بھی کبھی غرور نہیں کیا۔ ہمیشہ بھائی چارے کا سبق دیتی تھیں۔ غریبوں کے کام آتیں۔ ان کی بچیوں کی شادی کا اہتمام کرتیں اور ان میں نامور شخصیتوں کو مدعو کرتیں اور ان بچیوں کو اپنی کوٹھی سے رخصت کرتیں۔ انہوں نے بعض بچیوں کو گود بھی لیا اور پاکستان لاکر شادیاں کیں چنانچہ وہ گھرانے پاکستان میں پھل پھول رہے ہیں۔

ریاض فاطمہ اعلیٰ صفات کی حامل ایک سوشل خاتون تھیں۔ جلسے جلوسوں کا اہتمام کرتیں اور مینابازار وغیرہ منعقد کراتیں اور اس کی آمدنی نادار بچیوں کی شادی پر خرچ کرتیں۔ ان کے ملازموں کی تعداد بھی کافی تھی جنہیں وہیں زمین اور گھر دیکر آباد کیا گیا تھا البتہ وہ لڑکیوں کی بے جا آزادی کی سخت مخالف تھیں۔ مشرقی شرم و حیا کی قائل تھیں اور بڑی ملنسار اور خلوص و محبت کا پیکر تھیں۔ ان سے قریبی روابط رکھنے والوں میں لیڈی ہارون، رعنا لیاقت علی خاں اور بیگم نواب اسمٰعیل خاں جیسی معروف و بلند مرتبت خواتین شامل تھیں۔ تحریک پاکستان کے دوران انہوں نے ایک مسلم لیگی کارکن کی حیثیت سے کام کیا اور خواتین کے جلسے اور جلوس منعقد کرائے۔ وہ ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں اور ریاض تخلص کرتی تھیں تاہم شاعری میں ان کا کوئی استاد نہ تھا۔ طرز بیان سلیس، دلکش اور شگفتہ تھا۔ جذبات حقیقت پر مبنی ہوتے تھے۔ انہوں نے نظموں، غزلوں، سہروں، رخصتی اور نعت کی اصناف میں طبع آزمائی کی مگر زیادہ تر نعتیں ہی لکھیں کیونکہ ان کا دل عشق رسولؐ سے معمور تھا۔ انہوں نے میلاد شریف کی ایک کتاب ''تاجدار مدینہؐ'' کے نام سے لکھی اور شائع کرائی اس میں متعدد نعتیں، مستند روایتیں اور سلام و دعا شامل ہیں۔ اس کتاب نے بڑی شہرت پائی اور محافل میلاد میں اکثر پڑھی جانے لگی۔

سیدہ ریاض فاطمہ کے اکلوتے بیٹے سید ساجد علی آصف اپنی والدہ کے ہمراہ پاکستان آئے اور نجی شعبہ میں صنعت و حرفت سے وابستہ رہے ان کے ایک فرزند سید ندیم آصف کراچی میں اور دوسرے سید سہیل آصف جو الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں اور اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

حافظ شفیع الدین

ایک ایسی شخصیت جس نے تعمیر ذات کے ساتھ ساتھ اجتماعی فلاح و بہبود کے کاموں میں مثالی کردار ادا کیا وہ حافظ شفیع الدین تھے۔ اہل وطن کیلئے تعلیم کے شعبہ میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ نجابت و شرافت اور حلم و تدبر کے پیکر حافظ صاحب نے سیاست کے میدان میں بھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اہل وطن کو قیادت و رہنمائی فراہم کی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم عربی مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں ہوئی۔ آپ مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئے ہی تھے کہ آپ کے والد سید شہاب الدین اچانک انتقال کر گئے جس کے باعث ان کے کاندھوں پر ماں' بہنوں اور بھائیوں کی ذمہ داری آ پڑی۔ آپ خود بھی شادی شدہ تھے۔ پہلے تو ضلع بلند شہر میں تلاش معاش کیلئے سرگرداں رہے اور جب کئی سال تک تلاش بسیار کے باوجود کوئی کامیابی نہ ہوئی تو اپنے ایک عزیز کی وساطت سے ریاست بہاولپور کا رخ کیا چنانچہ سراج الدین صاحب جو ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بہاولپور میں جج کے منصب پر فائز تھے' حافظ صاحب ان کے بچوں کو حفظ قرآن کرانے پر مامور ہوئے۔ تنخواہ کے علاوہ قیام و طعام کی پیش کش بھی ہوئی لیکن حافظ صاحب کی خود داری نے اس کو پسند نہ کیا اور صرف تنخواہ قبول کی۔ تقریباً" دو ڈھائی سال کی مدت میں انہوں نے اپنے اعلیٰ اخلاق اور خاندانی شرافت سے اپنے لئے اعلیٰ مقام پیدا کرلیا اس کے نتیجہ میں جج صاحب سے مراسم نہایت قریبی اور مخلصانہ ہوگئے اور جج صاحب نے چیف کورٹ کے محافظ خانہ میں آپ کو ملازمت دلوا دی جہاں آپ ترقی کرکے ریڈر آف چیف کورٹ کے منصب تک پہنچے۔ آپ نے اپنی قابلیت' ذہانت اور شرافت سے لوگوں کے دلوں

حافظ شفیع الدین

میں گھر کر لیا اور نہایت تکریم کے مستحق قرار پائے۔ عدالتی امور میں اسقدر مہارت حاصل کی کہ جج اور منصف صاحبان تک اہم مقدمات میں آپ سے مشورہ کرتے چنانچہ جب بہاولپور میں ہائی کورٹ کا قیام عمل میں آیا تو آپ ریڈر ہائی کورٹ مقرر ہوئے۔ آپ کی قانون فہمی اور قانونی معاملات میں ژرف نگاہی سے چیف جسٹس سر عبدالقادر بھی بیحد متاثر تھے۔ آپ ریٹائر ہوکر گلاوٹھی آگئے۔ حسن اخلاق کا یہ عالم تھا کہ دشمنوں تک سے مروت سے پیش آتے۔ مسلم لیگ سے وابستہ رہے اور گلاوٹھی میں تحریک پاکستان کی علامت بن گئے تھے۔ اس حلقہ سے لیاقت علی خاں کی کامیابی میں آپ کی خدمات کو بڑا دخل حاصل تھا۔ فلاحی مزاج پایا تھا۔ ضرورت مندوں کے ہمیشہ کام آتے۔ مسلمانوں کی تعلیم کی آرزو رکھتے تھے جس کی درخشاں مثال گلاوٹھی میں مفید عام سکول کا قیام تھا جو مڈل سے شروع ہوکر اب کالج بن چکا ہے۔ یہ سکول ان کی عطا کردہ زمین اور بلڈنگ میں قائم ہوا۔ اولاد کی تعلیم و تربیت میں مثالی کردار ادا کیا۔ بیٹوں میں سید شمیم الدین نے کینیڈا سے نفسیات میں پی ایچ ڈی کیا۔ ایک اور بیٹے سید فصیح الدین نے لندن سے سی اے کیا اور اب وہ جنوبی امریکہ کی کسی ریاست میں مستقل سکونت اختیار کرچکے ہیں۔ دوسری اہلیہ سے بیٹوں سید رضی الدین اور سید نسیم الدین نے بھی سی اے کیا اور بیٹی سیدہ فیروز بیگم نے انگریزی ادبیات میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی۔ بڑے بیٹے سید ریاض الدین نہایت ذہین و زیرک انسان تھے وہ ایک ماہر تعلیم کے علاوہ اچھے شاعر بھی تھے۔

سید الطاف حسین

عظیم انسان وہ ہوتے ہیں جو کسی قیمت پر بھی اپنے مقاصد سے دستبردار نہیں ہوتے اور بڑے سے بڑا کوئی بھی دنیوی لالچ انہیں اس راستے سے نہیں ہٹا سکتا جس کا تعین وہ اپنے لئے کر لیتے ہیں ایسے لوگ واقعی سچے درویش اور قناعت پسند انسان ہوتے ہیں چنانچہ سید الطاف حسین بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ گلاوٹھی کے ایک ایسے ہی اولالعزم اور مایہ ناز فرزند تھے جنہوں نے اپنے گرد بے شمار ترغیبات

سید الطاف حسین

کا حامل تھا ہونے کے باوجود مدت العمر تک نہ صرف ایک ہائی سکول کا ہیڈماسٹر ہونا پسند کیا بلکہ نونہالان قوم کی تعلیم و تربیت اور ادارہ کی فلاح و بہبود کیلئے اپنی گراں مایہ زندگی وقف کر دی۔ برصغیر کے ان تعلیمی اداروں میں جن میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور و پشاور، فیض عام انٹر کالج میرٹھ اور مسلم ہائی سکول بلند شہر جیسے ممتاز ادارے مسلمان طلباء کی ذہنی و فکری نشوونما اور تحریک پاکستان کو نوجوان خون کی حرارت مہیا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ انہیں اداروں میں اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ بھی شامل تھا جسے سید الطاف حسین جیسے مثالی اور ضرب المثل ہیڈماسٹر میسر آگئے تھے۔ انہیں انگریزی زبان پر جو دسترس اور عبور حاصل تھا وہ انگریز اہل زبان کیلئے بھی قابل رشک تھا۔ ان کی مقصد سے لگن اور نصب العین سے والہانہ وابستگی کا یہ عالم تھا کہ نوجوان الطاف حسین نے جب انڈین سول سروس (آئی سی ایس) کے مقابلے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی تو ان کی زندگی کا یہ لمحہ جو اس وقت اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی فکر اور خواہشات کا نقطہ عروج سمجھا جاتا تھا ان کے لئے لمحہ فکریہ بن گیا اور انہوں نے برطانوی سامراج کے ایک بلند و بالا اور بااختیار افسر بن جانے کی نسبت ایک معلم کے منصب کو ترجیح دی۔ اس کے بعد انہیں نظام دکن نے سلطنت عثمانیہ حیدر آباد کے وزیر تعلیم کا عہدہ پیش کیا جسے قبول کرنے سے سید الطاف حسین نے یہ کہکر معذرت کرلی کہ ریاست حیدر آباد کو کوئی بھی قابل وزیر تعلیم مل سکتا ہے لیکن اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ کو ابھی الطاف حسین کی ضرورت ہے۔

سید الطاف حسین کی زندگی کا ایک ایک لمحہ سکول کیلئے وقف تھا وہ ہاسٹل کی نگرانی بھی خود ہی کرتے تھے تاکہ مسلمان طلباء کی ذہنی و عملی نشوونما اور انفرادی توجہ و نگہداشت میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اٹاوہ کے مسلم ہائی سکول کی آغوش تربیت سے پروان چڑھ کر جو طلباء عملی زندگی میں داخل ہوئے انہوں نے اپنی خوبیوں سے ایک دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ ڈاکٹر سید ذاکر حسین جو بھارت کے صدر اور سربراہ مملکت بنے انہیں بھی ہیڈماسٹر الطاف حسین کے شاگرد ہونے پر فخر تھا۔ یہی کیفیت ان کے بھائی سید محمود حسین کی تھی جو کراچی یونیورسٹی کے وائس

چانسلر اور حکومت پاکستان کے وزیر رہے کہ تمام عمر سید الطاف حسین کی شاگردی پر نازاں رہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب پاکستان کے قیام کے بعد کراچی تشریف لے آئے لیکن یہاں آخری وقت عسرت و تنگدستی کے عالم میں گزرا اور اس کے باوجود کہ ان کے شاگردوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہندو پاکستان کی حکومتوں اور نجی شعبوں میں اعلیٰ مناصب پر فائز تھی۔ سید الطاف حسین مرحوم کی خودداری نے شاگردوں کے اصرار کے باوجود کوئی احسان قبول کرنا گوارا نہ کیا۔ لیاقت علی خاں کی کابینہ میں ان کے شاگرد ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر بحالیات تھے انہیں جب علم ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب پاکستان آکر کراچی ہی میں مقیم ہیں تو وہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن الطاف حسین نے وزیر بحالیات کی نیازمندانہ پیش کش کے باوجود اپنی جھگی سے کسی محل نما رہائش گاہ میں منتقل ہونا پسند نہ کیا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

ہمیں افسوس ہے کہ جناب الطاف حسین کی زندگی اور شخصیت پر ایک جامع مطبوعہ کتاب ہونے کے باوجود اور مرحوم کے اوصاف حمیدہ پر ان کے شاگردان رشید کے مضامین ہند و پاکستان کے اخبارات و جرائد میں شائع ہونے کے باوصف ان کے بارے میں مزید معلومات ہماری دسترس میں نہ آسکیں جنہیں ہم نذر قارئین کرسکتے۔ بہرحال اہل گلاؤٹھی کیلئے الطاف حسین جیسی شخصیت سے ہم وطن قرار پانے کی نسبت بھی یقیناً باعث افتخار ہے۔

سید عبدالواسع

سرکاری ملازمت میں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر گلاؤٹھی کے جن لوگوں نے اپنا ہی نہیں بلکہ قصبہ کا بھی نام روشن کیا ان میں سید عبدالواسع بھی تھے۔ آپ کو صوبائی سول سروس کا رکن ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور آپ ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ گلاؤٹھی میں ڈپٹی عبدالواسع کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے

بعد آپ ریاست مالیرکوٹلہ اور ریاست باوانی میں وزیر رہے۔ برٹش گورنمنٹ نے آپ کو دوران ملازمت اعلیٰ کارکردگی پر سورڈ آف آنر (Sword of Honour) کے اعزاز سے نوازا تھا۔ آپ کی اولاد میں نہایت باصلاحیت شخصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے کلاؤٹھی کا نام روشن کیا۔ انہیں میں آپ کے فرزند ڈاکٹر سید نفیس احمد شامل تھے جن کا شمار دنیا کے ممتاز جغرافیہ دانوں میں ہوتا تھا۔ دوسرے بیٹے ڈاکٹر رئیس احمد اعلیٰ پایہ کے ماہر تعلیم تھے جنہیں ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے اعتراف میں بھارت کا اعلیٰ ترین اعزاز ''پدم بھوشن'' ملا۔ یہی اعزاز ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے جوش ملیح آبادی کو بھی ملا تھا۔ آپ کے تیسرے بیٹے سید حسیب احمد تھے جنھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ علی گڑھ میں ہاکی ٹیم کے کپتان بھی تھے۔ ڈپٹی عبدالواسع کا انتقال علی گڑھ میں ہوا۔ آپ وہیں مدفون ہیں۔

ڈاکٹر سید نفیس احمد

آپ ڈپٹی سید عبد الواسع کے سب سے بڑے صاحبزادے عالمی شہرت یافتہ سکالر اور جغرافیہ داں تھے آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے جغرافیہ میں بی اے (آنرز) اور پھر ایم اے کیا اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر مقرر ہوئے بعد میں کلکتہ اسلامیہ کالج میں شعبہ جغرافیہ کے سربراہ رہے انگلینڈ سے جغرافیہ میں پی ایچ ڈی کیا اور دنیا کے مشہور جغرافیہ دان پروفیسر ڈوڈلے سٹیمپ کا شاگر ہونے کا اعزاز آپ کو حاصل ہوا ایک اور اعزاز جو آپ کو حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ تقسیم ملک کے وقت آپ کو باؤنڈری کمیشن کا رکن نامزد کیا گیا

ڈاکٹر نفیس احمد قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبہ جغرافیہ کے چیئرمین مقرر ہوئے اور ڈین آف فیکلٹی کے منصب پر بھی فائز رہے آپ قائداعظم یونیورسٹی میں بھی ارتھ سائنسز ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین رہے' آپ مشہور کتاب اکنامک جیوگرفی آف ایسٹ پاکستان کے مصنف تھے' آپ کی مرتبہ اٹلس آج بھی برصغیر کے سکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر نفیس احمد کا انتقال ۱۹۸۴ء میں ڈھاکہ

میں ہوا آپ نے شیر بنگال مولوی فضل حق کے خاندان میں شادی کی تھی آپ کی اولاد امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کر چکی ہے۔

ڈاکٹر رئیس احمد

آپ ڈپٹی کلکٹر سید عبدالواسع کے دوسرے بیٹے اور نامور ماہر طبعیات تھے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فزکس میں ایم ایس سی کیا ۱۹۴۶ء میں پرنسٹن یونیورسٹی سکالر شپ کے لیے تمام ہندوستان کے ہندو مسلمان امیدواروں میں مقابلہ کے بعد منتخب ہونے کا اعزاز حاصل کیا چنانچہ امریکہ گئے اور مشہور عالم سائنس داں پروفیسر آئن سٹائن کی زیر نگرانی جو پرنسٹن یونیورسٹی میں استاد تھے ماسٹرز کیا بعد میں انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فزکس کے ریڈر رہے پھر چیئرمین فزکس ڈیپارٹمنٹ ہوئے اور آخر میں فیکلٹی آف سائنس کے ڈین بن گئے ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۷ء تک ڈائریکٹر این سی ای آر ٹی رہے سرینگر انجینئرنگ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے پھر کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے اقوام متحدہ کی طرف سے آپ کو ایگزیکٹو ڈائریکٹر آف ایجوکیشن بنا کر ماریشس بھیجا گیا' آپ ہندوستان کے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین بھی رہے آپ کو ایک ممتاز ماہر تعلیم کی حیثیت سے ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا گیا آپ کی شاندار علمی خدمات کے پیش نظر حکومت ہندوستان نے آپ کو "پدم بھوشن" کے اعزاز سے نوازا۔ انتہائی مہمان نواز تھے دستر خوان وسیع تھا اور ہر دل عزیز تھے آپ نے مارچ ۱۹۹۰ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا اور وہیں اپنے والد و والدہ کے ساتھ مدفون ہیں۔

سید حامد علی جعفری

گلا ڈھی کی نہایت خوش شکل اور وجیہ شخصیتوں میں سے تھے اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ اخلاق اور اعلی تعلیم دونوں سے نوازا تھا خوش پوشاکی نے اور بھی جاذب نظر بنا دیا تھا آپ سید زاہد علی جعفری کے فرزند تھے اور حافظ شفیع الدین کے داماد ایم اے ایل

ایل بی کیا پاکستان بحریہ میں افسر تعلقاتِ عامّہ رہے، کچھ عرصہ سرگودھا میں بھی رہے بعدازاں واہ آرڈیننس فیکٹری میں لیبر ویلفیئر آفیسر مقرر ہوئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ واہ میں آپ نے بے شمار فلاحی کام سرانجام دیئے جس کے سبب آپ لیبر میں بے حد مقبول ہوئے، واہ میں بستی کاریگر کے نام سے ایک کالونی کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

سید حامد علی جعفری آخر میں واہ سے حیدآباد (سندھ) منتقل ہو گئے لیکن یہاں سے کچھ عرصہ بعد ہی کراچی کے لیے رختِ سفر باندھا اور وہیں انتقال کیا آپ کو عزیز و اقارب سے خاص تعلق تھا اور ان کی بہبود کے متمنی رہتے تھے آپ کے فرزند سید نصرت کمال باپ کی بہت سی خوبیوں کے امین ہیں اور سٹیٹ بینک آف پاکستان میں ڈائریکٹر کے منصب پر فائز ہیں۔

سید احمد علی

آپ گلاؤٹھی کی مشہور شخصیت سید صادق علی کے فرزند تھے جو بلند شہر میں اس وقت تحصیل دار رہے جب یہ منصب بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا تھا۔ سیداحمد علی صوبائی سول سروس (پی۔ سی۔ ایس) کے رکن تھے اور ترقی کر کے جب ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بنے تو آئی۔سی۔ایس (انڈین سول سروس) کے اعزاز سے نوازے گئے آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی جہاں ایک ہونہار اور تابناک طالب علم کی حیثیت سے آپ نے علم و ادب کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کے پسندیدہ کھیل کرکٹ میں مہارت اور شہرت حاصل کی آپ ایس۔ایس ہال علی گڑھ میں نواب سرحمید اللہ خان آف بھوپال اور ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کے روم میٹ رہے اور ان حضرات کے گہرے دوستوں میں سے تھے سید احمد علی کے دوسرے دوستوں میں چوہدری خلیق الزماں اور جنرل عتیق الرحمان کے والد کرنل رحمان بھی شامل تھے۔

سید احمد علی کے والد تحصیل دار سید صادق علی منشی سید مہربان علی کی بہن

شریف انساء کے صاحبزادے تھے۔ سید احمد علی کلکڑ کے منصب سے ریٹائر ہوئے آپ کے اکلوتے بیٹے سید محمد احمد خسرو بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے جج کے منصب پر فائز ہوئے او ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

سید مشتاق علی مضطر گلاوٹھوی

آپ سید اشفاق علی کے فرزند تھے اور ایک شاعر کی حیثیت تھے جانے پہچانے جاتے تھے خوبصورت قدو قامت کے مالک تھے اور اپنے اخلاق و اخلاص کے سبب اہل قصبہ میں تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے معاش کا ذریعہ محکمہ مال کی ملازمت تھی چنانچہ ریٹائرمنٹ کے بعد گلاوٹھی ہی میں مستقل قیام کیا آپ کو شاعری میں امیر مینائی سے شرف تلمند حاصل تھا اور شعر گوئی پر مکمل عبور حاصل تھا دور دراز تک مشاعروں میں مدعو کیے جاتے تھے اور کلام میں سلاست و روانی اور برجستگی کے اوصاف کے باعث خوب داد حاصل کرتے تھے طبعیت میں یک گونہ شاخی بھی تھی جس کا اظہار اشعار میں نہایت خوبصورتی سے کرتے۔ فلسفیانہ مضامین نظم کرنے میں آپ کو خاص مہارت حاصل تھی آپ کا ایک شعر اتنا مشہور ہوا کہ زبان زد خاص و عام ہو گیا

بشر بھی آ کے دنیا میں عجب شانیں دکھاتا ہے
کھلونا بن کے آتا ہے تماشا بن جاتا ہے

مضطر گلاوٹھوی کی طبعیت میں جو شوخی تھی اس کا اظہار بھی ان کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے

کیا بتاؤں کہ تمہیں آج کہاں دیکھا ہے
ابھی کہہ دوں تو اسی بات پہ جھگڑا ہو جائے

آپ کے حضرت فدا گلاوٹھوی سے خصوصی مراسم تھے چنانچہ آپ کی بڑی بیٹی شبیہ فاطمہ کی شادی فدا صاحب کے بیٹے سید عزیز حسن سے ہوئی چھوٹی بیٹی صابرہ

خاتون الدن میں الحاج سید ممتاز علی کے صاحبزادے سید احمد سے بیاہی گئیں سنا ہے مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام چھوٹی بیٹی کے پاس ہے جو تا حال شائع نہیں ہوسکا لیکن مضطرگلاؤٹھوی کی شاعری ورثہ میں ان کے نواسے سید سجاد احمد تک پہنچی جو ایک میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے باوجود ایک نہایت خوش فکر اور ہونہار شاعر ہیں ان کا ایک شعری مجموعہ دہلی سے شائع ہو چکا ہے ہو سکتا ہے کہ سجاد کو شاعری ورثہ میں نانا کے علاوہ اپنے چچا سید مظفر ضیاء سے بھی ملی ہو جو ایک صاحب دیوان شاعر ہیں۔

سید امیر حسن امیر گلاؤٹھوی

آپ کا اصل وطن تو گلاؤٹھی ہی تھا لیکن پیدا بھوپال میں ہوئے وہاں آپ کے والد سید نظیر حسین بسلسلہ ملازمت مقیم تھے پھر گلاؤٹھی آگئے وہیں قرآن ختم کیا فارسی عربی پڑھی مڈل پاس کیا اور اس کے بعد کسی تعلق سے بلرام پور اور بہرائچ پہنچ گئے وہاں سے میٹرک پاس کیا اور بھوپال پولیس میں بھرتی ہو گئے خلافت کی تحریک میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پھر گھر آگئے شعر و شاعری ورثہ میں ملی تھی خاندان قاضیوں کا تھا لیکن مذاق و مزاج رندانہ تھا ۱۹۳۰ء کے بعد سے کورٹ آف وارڈز میں ملازمت کر لی اور میرٹھ میں رہے ۱۹۵۲ء میں کراچی آ گئے شعر و شاعری پر ساری توجہ مرکوز کردی اور کراچی کی ادبی دنیا میں اپنے لیے جلد ہی ایک منفرد مقام پیدا کر لیا۔

ہر صنفِ شاعری پر سید امیر حسن کو عبور حاصل تھا لیکن غزل اور تاریخ گوئی میں بلند مقام حاصل کیا' ان کی فارسی شاعری میں بھی وہی گداز ہے جو ان کی اردو غزل کو انفرادیت بخشتا ہے' غزلیں کی غزلیں سہل ممتنع میں ہیں اور بلا مبالغہ سینکڑوں اشعار ایسے ہیں جو زباں زد خاص و عام ہونے کی کامل اہلیت رکھتے ہیں۔

کرم تمام ہی سہی صلائے عام ہی سہی ‏ ‏ ‏ ‏ برائے نام ہی سہی حساب پھر حساب ہے

میکدے میں پاؤں رکھتے ہی چھنا کا سا ہوا ‏ ‏ ‏ ‏ جام تو سالم نظر آتے ہیں تو بہ ہو تو ہو

آنکھیں ساقی کی مخمور ‏ ‏ ‏ ‏ شیشے ہو گئے چکنا چور

طبعیت بڑی بزلہ سنج اور مرنجاں مرنج پائی تھی' یگانگت و اخلاق ان کا وظیفہ حیات تھا بہت اچھے دن دیکھے ہوئے تھے اور بڑے بڑے استاد و اہل کمال کی صحبت میں بیٹھے تھے۔ اس امتزاج نے ان کی ذات میں ایک بڑے محبوب اور دلنواز دوست ایک قادر الکلام اور طبّاع شاعر ایک انجمن فروز محفل نواز کی خصوصیات کو یکجا کر دیا تھا گو پاکستان میں ان کی معاشی حالت کچھ ویسی نہ تھی جیسی ہندوستان میں تھی لیکن وضعداری کی بنا پر ان کے ہر درجہ کے شعراء اور ادیبوں سے تعلقات گرمجوشی پر مبنی تھے اس میں بڑا دخل خود ان کے رکھ رکھاؤ کو تھا نرم خو نرم مزاج شیریں کلام سعیدالفطرت ہر ایک کے ساتھ وہ ایسے لبھاؤ سے ملتے کہ وہ ان کا بندہ بے دام ہو جاتا اور پھر جب ان کے شعر سنتا تو ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا ۲۰ مئی ۱۹۷۹ء کو صبح اٹھے اور وضو کرنے کے لیے غسل خانہ میں گئے وہیں وضو کرتے کرتے گرے اور روح پرواز کر گئی۔

گلشن بکف رہے وہ رہے جب تک اے امیر
اور جب گئے تو ساتھ بہاروں کو لے گئے

علاّمہ سیّد قابل گلاؤٹھوی

کسی بھی خطہ ء زمین کو عزت و سرفرازی از خود حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ یہ ان شخصیتوں کا فیضان ہوتا ہے جو اس سرزمین سے نسبی اور معاشرتی تعلق رکھتی ہیں اور جو اپنے افکار و اعمال اور اوصاف حمیدہ کے باعث اسے عظمت واحترام اور شہرت دوام عطا کرتی ہیں چنانچہ اس اعتبار سے گلاؤٹھی کو معاشرتی اور جغرافیائی تحدید و اختصار کے باوصف آغوش گنگ و جمن میں پروان چڑھنے والی تاریخی عظمتوں کی امین ایک بستی قرار دیا جا سکتا ہے جس کے فرزندان اولعزم نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں علم و حکمت ذہانت و بصیرت اور عزم و ہمت کے انمٹ نقوش ثبت کئے ایسی ہی ہستیوں میں علامّہ سید قابل گلاؤٹھوی بھی تھے جنھیں ان کی زندگی ہی میں اہل بصیرت نے ذہانت و دانائی اور علم و حکمت ہی کے شعبوں میں نہیں بلکہ ادب و شعر اور

علامہ سید قابل گلاؤٹھوی

صحافت و سیاست کے میدانوں میں بھی سند اعتراف سے نوازا۔

قابل صاحب نے ۱۹۲۸ء میں صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تو دیکھتے دیکھتے ہر منزل معلوم کو گرد سفر بناتے چلے گئے یہاں تک کے بیسوی صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اردو اور انگریزی جرنلزم ہی نہیں بلکہ ادبی صحافت اور سیاست نگاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا اور دہلی کو جو ادب و سیاست اور تہذیب و ثقافت کا منبع و مرکز تھا اپنی سرگرمیوں کا بھی محور بنا لیا۔

وہ اس مدت میں دو درجن سے زائد انگریزی و اردو زبان کے معروف و مقتدر اخبارات ورسائل کے یا تو چیف ایڈیٹر یا ایڈیٹر رہے یا سب ایڈیٹراور نامہ نگار رہے اور اپنے رشحات قلم سے ثابت کر دیا کہ تاریخ ہو یا ادب ہو یا مذہب ان کی دسترس سے باہر نہیں ان اخبارات اور رسائل کے اگر نام گنوائے جائیں تو ان میں سر فہرست دہلی اور کلکتہ سے شائع ہونے والا انگریزی روز نامہ سٹیٹسمین (Statesman) ہے جس کے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک نامہ نگار رہے ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء کے دوران بی بی سی لندن کی نمائندگی بھی کی اس کے علاوہ اردو اخبارات وحدت وطن الامان جنگ اور قومی گزٹ کے ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر رہے اور ایک اعزاز جو قابل صاحب کے حصہ میں آیا وہ کیبنٹ مشن کے ارکان سر اسٹیفرڈ کرپس مسٹر پیتھک لارنس اور مسٹر وی اے الیگزینڈر کا وہ سیاسی انٹرویو تھا جو تنہا ان کی ذات سے منسوب ہوا اور برصغیر ہی نہیں بلکہ عالمی میڈیا کی زینت بنا جن لوگوں نے قابل صاحب کی صحافت کا یہ دور دیکھا ہے وہ اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی ان کی مضبوط گرفت کے معترف بھی ہیں اور شاہد بھی کہ وہ ان تینوں زبانوں کے انشاء پرداز ہی نہیں بلکہ چونکا دینے والے خطیب بھی تھے۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۶ء تک برصغیر کے جن رسائل و جرائد انگریزی و اردو میں ان کی نگارشات زینت بنیں ان میں سنڈے ٹائمزمدراس بو مبے کرانیکل بمبئی اوریئنٹ کلکتہ کے علاوہ خلافت بمبئی پیام حیدآباد (دکن) عصر جدید کلکتہ آزاد کلکتہ عالمگیر لاہور، قوس قزح لاہور، ادبی دنیا لاہور، شاعر آگرہ، ایشیا میرٹھ، نگار بھوپال اور کپور تھلہ گزٹ شامل ہیں۔

سیاسی تحریکوں سے قابل صاحب کی دلچسپی اور امت مسلمہ سے والہانہ عشق زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہا اور قوم کے زوال و عروج اور عروج و زوال کے حقائق پر تمام عمر نہایت درد مندی سے نہ صرف غور و فکر کرتے رہے بلکہ مشاہیروزعماء سے جن میں حضرت قائداعظم بھی شامل تھے اپنی ملاقاتوں میں مختلف تدابیر اور اسباب و علل پر گفتگو کرتے رہے اور آخر کار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

قابل ہے میرے قوم کی تاریخ مختصر
ساغر ملا تو ہاتھ سے تلوار گر گئی

سیاحت کے شوق نے قابل صاحب کو تمام عمر محو سفر رکھا برصغیر کے چپہ چپہ سے آگاہی انکی سفر دوستی ہی کا صلہ تھی بلکہ اکثر و بیشتر مسلم ممالک کا بھی سفر کیا اور سقوط ڈھاکہ کا جاں گسل لمحۂ تاریخ جب زہر آلود تیر بن کر پاکستان کے دل میں پیوست ہو گیا تو اس وقت قابل صاحب مشرقی پاکستان ہی میں تھے اور ان کی آنکھوں نے اسلامی تاریخ میں پہلی بار نوے ہزار فوج کو ہتھیار ڈالتے اور مشرقی پاکستان کو کافر بھارت کی آغوش منافقت میں بنگلہ دیش کی صورت میں منتقل ہوتے دیکھا انھوں نے اپنا قلمی جہاد وہاں بھی جاری رکھا اور دو سال قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد بچے کچے پاکستان واپس آئے اور یہ صدمہ بھی ساتھ لائے کہ بنگلہ دیش کی پولیس اور بھارت نواز انتظامیہ نے انھیں ان کے ستّر مسودات نظم و نثر سے محروم کر دیا تھا۔

لٹ گئے ستّر دواوین ادب بنگال میں
جو ہر قابل فقط ہے کچھ نہیں قابل کے پاس

اللہ تعالے نے قابل صاحب کے قلم میں بلا کی روانی عطا کی تھی اور ابلاغ و اظہار پر ایسی قدرت کہ ناقابلِ یقین ڈان اخبار کو اردو میں اس روانی سے پڑھتے کہ دیکھنے اور سننے والے دونوں زبانوں پر ان کی دسترس کے قائل ہو جاتے یہی عالم شعر گوئی کا تھا کہ کم و بیش سو اشعار روز کہہ لینا ان کا معمول تھا بلکہ ان کی بدیہہ گوئی

کاایک واقعہ تقسیم ملک سے قبل کپور تھلہ میں ایک کل ہند مشاعرہ کے ضمن میں احسان دانش مرحوم نے اپنی سوانح "جہان دانش" میں رقم کیا ہے اور دوسرے شعرا پر ہی نہیں بلکہ خود پر بھی قابل صاحب کی برتری کو تسلیم کیا ہے ان کی ذہانت ان کی شاعری میں نکتہ آفرینی کے حسن کو نہایت واضح کر دیتی ہے' فرماتے ہیں۔

بہ اقلیم سخن تنہاہوں قابل　　سخن ورھم زباں کوئی نہیں ہے
مرے ھم پا یہ ہیں کچھ لوگ لیکن　　مراہمسر یہاں کوئی نہیں ہے

لیکن وقت کی سرد مہری اور زمانہ کی غلط بخشی کے ہاتھوں آزردہ ہو کر آخری عمر میں یہ بھی کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

مٹی میں ملایا مجھے ناقدرئی فن نے
شرمندہ ہوں قابل میں بہت اپنے ہنر سے

کسے خبر تھی کہ ۱۹۰۶ء میں گلاؤٹھی میں قاضی سید حبیب اللہ کے گھر پیدا ہونے والا بچہ مقامی پرائمری اور مڈل سکول کا طالب علم اور منبع العلوم گلاؤٹھی سے فیض یافتہ نوجوان جسے اہل خاندان نے سید رحیم اللہ کا نام دیا قابل بن کر برصغیر میں اپنی ذہانت و ذکاوت اور مطالعہ و محنت سے صحافت و ادب اور اردو شاعری میں ہلچل مچادے گا اور بحیثیت شاعر اپنے استاد حضرت فدا گلاؤٹھوی کے کمال سخن کی نہ صرف لاج رکھے گا بلکہ گلاؤٹھوی کے لاحقہ کو اپنے نام کا مستقل حصہ بنا کر اپنے مولد و مسکن کا نام بھی روشن کرے گا یہ چراغ جس نے ربع صدی سے زیادہ شعرو ادب اور صحافت کے ماحول کو منوّر کیے رکھا ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سے ٹمٹانے لگا تاہم روشنی کی اس نحیف لو میں تمام سرمایہ فکر و فن لٹ جانے کے باوجود گرمی باقی رہی جس نے پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے جوار میں واقع واہ کینٹ میں جولائی ۱۹۸۲ء تک اپنے آخری سانسوں کی حرارت کو بھی باقی رکھا اور دین کے نام پر قائم ہونے والی مملکت کی محبت کو دل کی گہرائیوں میں سمو کر ماضی کے تمام رشتوں کو خیر باد کہہ دیا۔

اب منزل وصال دل و جاں ہے ارض پاک
قابل کے دل میں اب غم ہندوستان نہیں

مولانا سید محمد اصلح الحسینی

○ ۲۵ دسمبر ۱۹۱۳ء کو گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد ماجد حکیم سید محمد صالح قصبہ کے معروف طبیب تھے مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی سے جس کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے آپ نے مشکوۃ شریف سے پہلے تک کی کتابیں پڑھیں ۱۹۲۹ء میں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی کے بھی طالب علم رہے پھر مزید تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند چلے گئے جہاں ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۴ء میں دورہ حدیث کیا اور سند الحدیث والا جازۃ حاصل کی ۱۹۳۵ء میں دہلی اورینٹل کالج سے مولوی فاضل کیا ۱۹۳۲ء میں بھوپال کی شرعی عدالت (مجلس علماء) کے رکن رہے آپ کو سرسید کے پوتے سرراس مسعود کا مستقل تعاون حاصل رہا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک ہی سال میں منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ۱۹۳۸ء میں آپ نے میٹرک کیا ۱۹۳۹ء میں مشہور عالم مولانا احمد سعید دہلوی کے ادارہ موتمر المصنفین دہلی کے ساتھ منسلک ہو گئے مشہور اخبار الجمعیت کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے ندوہ المصنفین کے رکن رہے جب سہ روزہ اخبار الجمعیت ضبط ہو گیا تو اخبار "الہلال" پٹنہ کے ایڈیٹر ہو گئے اور ۱۹۴۱ء تک اس سے وابستہ رہے پھر سہ روزہ زمزم لاہور اور "مدینہ" اخبار بجنور کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے ۱۹۴۳ء میں آپ کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا تو آپ نے بجنور کو الوداع کہا اور دیوبند چلے آئے جہاں آپ نے اشاعتی ادارہ شباب بمبئی کے لیے عربی کورس کی پانچ کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا وہ کتابیں یہ تھیں۔

۱۔ فجرالاسلام ۲۔ التصوف الاسلامی العربی ۳۔ فقہ المذاہب الاربعۃ
۴۔ امام شافعی کی رحلت علمی ۵۔ خلفاء راشدین

۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۸ء آپ دارالعلوم دیوبند میں فارسی اور ابتدائی عربی کے استاد

رہے فروری ۱۹۴۹ء میں آپ پاکستان آ کر ابتداً ایک ہائی سکول میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۴۹ء کو ریڈیو پاکستان کی ایکسٹرنل سروس میں بحیثیت سٹاف آرٹسٹ (ایڈوائزر) مقرر ہوئے ریڈیو پاکستان سے آپ کی مسلسل تقاریر کا سلسلہ قرآن حکیم اور ہماری زندگی ۱۹۵۱ء سے شروع ہوا دیگر موضوعات مثلاً حکماء اسلام برصغیر میں تفسیر قرآن کا ارتقا پر بھی آپ کی تقاریر ہوئیں مصر کے سفیر عبدالوہاب نے بھی آپ سے بعض کتب اور اشعار کے ترجمے کرائے۔ ۱۹۸۱ء میں آپ ریڈیو پاکستان سے ریٹائر ہوئے اور تاحال مختلف علمی و ادبی خدمات میں مشغول ہیں اور مستقلاً کراچی میں مقیم ہیں۔

حکیم سید تہور علی زیدی

ایک جید طبیب اور صاحب دیوان شاعر۔ تعلق گلاؤٹھی سے متصل موضع سینٹھ کے ایک ایسے سید خانوادے سے جس کے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے دینی و دنیوی اوصاف اور ظاہری و باطنی علوم کے خزینوں سے نوازا تھا حکیم سید تہور علی اپنے بزرگوں کی جملہ صفات کے امین تھے درویشی باطنی عظمت کی دلیل اور حکمت و تدبر ان کے اوصاف حمیدہ تھے والد بزرگوار حکیم سید انوارالحق کے فیضان تربیت نے صلاحیتوں کو اور بھی جلا بخشی اور دادا سید فرزند علی کی ممتاز و منفرد شخصیت کا عکس ان کی اپنی زندگی کا حسین پہلو بن گیا آپ ۱۹۱۱ء میں اپنے آبائی موضع سینٹھ میں پیدا ہوئے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم مورخ اسلام آغاز رفیق بلند شہری کے والد مولوی احمد اللہ سے حاصل کی جو اپنے عہد کی ایک جیّد اور نہایت معتبر علمی شخصیت تھے عربی تعلیم مدرسہ قاسمیہ بلند شہر سے حاصل کی ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بلند شہر سے میٹرک پاس کرنے کے بعد طبیّہ کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا وہاں حکیم عبداللطیف لکھنوی اور ڈاکٹر عطاء اللہ جیسے فاضل اساتذہ سے استفادہ کیا اور فارغ التحصیل ہو کر بلند شہر میں اپنے والد حکیم سید انوارالحق کے زیر سایہ مطب شروع کیا جس کا آغاز انھوں نے ۱۹۰۱ء میں کیا تھا۔

علی گڑھ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ اور قائداعظم سے والہانہ

لگاؤ پیدا ہوا اور بلند شہر کے مسلمانوں کی صفوں میں مسلم لیگ کے سٹی معتمد کی حیثیت سے تنظیم و اتحاد کے لیے اہم کردار ادا کیا اپنی شبانہ روز محنت اور لگن سے بلند شہر میں قائداعظم کی تشریف آوری کو یادگار اور تاریخی بنادیا اور کانگرس کے امیدوار بیرسٹر کاظمی کے مقابلے میں ۱۹۴۶ء کے مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کو بلند شہر سے دو ہزار سات سو ووٹوں میں سے دوہزار ووٹ دلا کر اپنی اور اپنے مسلم لیگی ساتھیوں کی فاتحانہ حکمت عملی اور نتیجہ خیز کاوشوں کا لوہا منوا لیا۔ قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں کے مفادات اور حقوق کے لیے ذاتی مصائب ونقصانات کی پروا کئے بغیر اس طرح سینہ سپر رہے کہ اس وقت کے حالات کا تجزیہ کرنے والا کوئی بھی شخص ان کی قربانیوں کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آکر حیدر آباد (سندھ) کو اپنا مسکن بنایا اور خاندان سے ورثہ میں ملی ہوئی قناعت و درویشی اور استغنا و سادگی کے شعار کو اپنی زندگی کی بنیاد بنائے رکھا اور ہرگز ان بے لوث سیاسی خدمات کا کوئی صلہ نہ چاہا جو وہ تحریک پاکستان کے دوران انجام دے چکے تھے ۱۹۵۶ء میں جب سندھ طبیہ کالج کی حالت سقیم ہوئی تو اپنی اعزازی خدمات پیش کر دیں اور اپنی جانفشانی سے اسے ایک متحرک و فعال ادارہ بنا دیا کالج کے اعزازی پرنسپل بھی رہے اور ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۶ء تک پاکستان طبی بورڈ کے رکن کی حیثیت سے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

حکیم سید تہور علی کی جامع الصفّات شخصیت اپنی تمام باریکیوں' نزاکتوں اور گوناگوں جہتوں کے ساتھ اپنی پوری رعنائی اور تابناکی کے ساتھ ان کی شاعری میں جلوہ فگن ہے ان کا یہ شعر اس نقطہ نور کا ایک حوالہ ہے جو ان کی زندگی کو جگمگائے ہوئے تھا۔

اس کی رفعت کا تصور نہیں ممکن کہ جسے
اپنی ہستی میں میسّر ہو فنا ہو جانا

وہ واقعی ایک بڑے شاعر بھی تھے جس کا نہ انھوں نے کبھی دعویٰ کیا نہ اظہار خوش قسمت ہیں۔ ان کی صاحبزادی ڈاکٹر مہ جبیں زیدی اور ان کے لائق فرزند

ڈاکٹر ظفر زیدی جنھوں نے ۱۹۸۸ء میں ان کا مجموعہ کلام "نمود صبح" کے نام سے شائع کرنے کا اہتمام کیا اور اس طرح اردو ادب کو ایک ذکی الحس اور حقیقت پسند شاعر کے کلام سے محروم رہ جانے سے بچالیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی نے بجا طور پر ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے

"میں نے جناب تہور علی زیدی کو ان کے دو بچوں کے آئینے اور ان کی شاعری کی دنیا میں دیکھا ہے اور ہر اعتبار سے انہیں بامراد پایا ہے جو احتیاط اور سلیقہ وہ اپنے شعروں میں الفاظ کے انتخاب میں برتتے ہیں وہی ثقافتی وضعداری ڈاکٹر ظفر زیدی اور ڈاکٹر مہ جبیں زیدی کے کردار و گفتار میں بھی ہے"

سید تہور علی زیدی کی شاعرانہ فکر میں سب سے نمایاں عنصر ان کا حضور کریمؐ سے والہانہ عشق ہے جس کے اظہار کے لیے انہوں نے جو بھی پیرا یہ اختیار کیا ہے وہ نہایت حسین اور دلکش ہے مثلاً

ایک ربّ العالمیں اک رحمت اللعالمیںؐ
وہ کمالِ کبریا ہے یہ کمالِ مصطفےٰؐ

چنانچہ ڈاکٹر اسلم فرخی بھی ان کے شعری مجموعہ نمود صبح پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی نعتوں اور غزلوں میں خلوص اور محبت کا نور ہے اور جذبات و واردات کا ایک ایسا وفور ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے حکیم سید تہور علی زیدی چونکہ ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے علم و حکمت کے اوصاف ان کے دیگر افراد خاندان میں بھی ایک گر انقدر خاندانی ورثہ بن کر نمایاں ہوئے ان کے فرزند اکبر ڈاکٹر ظفر زیدی کو ان کی علمی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر جامعہ کراچی کا رئیس مقرر کیا گیا ہے جو ایک منفرد اعزاز ہے آپ کے ایک چھوٹے بھائی سید سرفراز علی زیدی جو پاکستان سے ایم۔بی۔بی۔ایس کر کے بیرون ملک چلے گئے تھے میڈیکل ایجوکیشن کے شعبہ میں اعلیٰ تعلیم اور گراں قدر سندات و

اعزازات سے سرفراز ہوئے ہیں اور کچھ سال انگلینڈ میں قیام کے بعد اب وہ امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کر چکے ہیں ایک اور بھائی سید محبوب علی زیدی حیدر آباد میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر رہے وہ ایک نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے والے اہل قلم اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔

سید ناصر الدین

گلاؤٹھی کی ممتاز و معروف شخصیتوں میں حاجی سید ریاض الدین کا شمار ہوتا تھا وہ بڑے صاحب بصیرت بزرگ تھے اور پانچ بار حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ مند ہو چکے تھے ان کی اولاد میں سید ناصر الدین سب سے زیادہ معتبر گردانے گئے گلاؤٹھی کے دوسرے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرح انھیں بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا موقع ملا اور وہیں سے لاء گریجویٹ ہوئے لیکن سید ناصر الدین کا علی گڑھ سے صرف اسی قدر تعلق نہ تھا بلکہ وہ یونیورسٹی کی مخصوص روایات کی علامت بن گئے تھے بے حد ذہین و طباع تو تھے ہی اپنی منفرد شوخی طبع کے باعث طالب علمی کے دور میں ہی کافی شہرت حاصل کر لی تھی اور نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں میں ان کے جونیئر سینئر سب ہی ان کی ذہانت آمیز شوخیوں کے معترف تھے فارغ التحصیل ہوئے تو وکالت میں اپنی ذہانت کا لوہا منوایا بلکہ ان کی شہرت ان کی معاشرتی سرگرمیوں کی زیادہ مرہون منت تھی۔

پاکستان بنا تو کراچی آگئے اور اپنا لا چیمبر قائم کر لیا اپنی صلاحیتوں کے باعث دیکھتے دیکھتے وکلاء کے درمیان وہ ایک ایسی شخصیت بن گئے جن کے نام سے ہر کس و ناکس متعارف تھا اسی دوران انہوں نے کراچی کے وکلاء کی شیرازہ بندی کا کام انجام دیا جس کے نتیجہ میں حکومتی حلقوں میں بھی ان کی شخصیت کو وزنی محسوس کیا جانے لگا آخر کار وہ کراچی بار ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہو گئے جسے ملک میں سب سے بڑا بار ہونے کا اعزاز حاصل ہے حکومت کی نگاہ انتخاب سید ناصرالدین پر پڑی اور انہیں حکومت مغربی پاکستان کے ایڈوکیٹ جنرل کے اعلیٰ منصب سے نوازا گیا بحیثیت ایڈوکیٹ

جنرل ان کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی اور ایک قانون دان کی حیثیت سے ہر سطح پر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔ انہوں نے اپنے دور کے بعض مشہور و معروف ایسے مقدمات کی پیروی کی جو پاکستان کی قانونی تاریخ کا اہم حصہ سمجھے جاتے ہیں۔

سید ناصر الدین اپنے عزیزواقارب کا بے حد لحاظ کرتے تھے اور وہ عزیزوں میں ابھرتے ہوئے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کا انتقال کراچی ہی میں ہوا جہاں ان کے پس ماندگان مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔

سید شبیر حسن نیازی

آپ گلاوٹھی میں ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے آپ عظیم المرتبت شاعر سید عبدالوحید فدا گلاوٹھوی کے تیسرے فرزند تھے فدا صاحب کا شمار داغ دہلوی کے نور تنوں میں ہوتا تھا ان کا فیضان تربیت اس قدر ہمہ گیر تھا کہ اس سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد لامحدود ہے جن میں سے متعدد جو ہر قابل ایسے ہوئے کہ انہون نے دنیائے شعر وادب میں نام پیدا کیا فدا صاحب کے بھانجے ظفر نیازی ایس ہی ایک درخشاں مثال تھے جن کے رشحات قلم نے تقسیم ملک سے قبل دہلی سے جاری ہونے والے ماہنامہ ،کامیاب کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اور قیام پاکستان کے بعد کراچی سے جاری ہونے والے ماہانہ نقاد کے مدیر کی حیثیت سے برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں سے زبردست خراج تحسین حاصل کیا ظاہر ہے کہ فدا صاحب کی تربیت کا یہ فیضان ان کی اولاد میں بھی اثر پذیر ہوا ان کے تیسرے فرزند سید شبیر حسن نیازی نے جنھوں نے حسن نیازی کا قلمی نام اختیار کیا اردو انشاء پردازی میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے وہ اگرچہ شاعر تو نہ تھے لیکن ان کی نثر اپنے اسلوب و معانی اور محاسن سخن کے اعتبار سے شاعری ہی کی ایک صنف معلوم ہوتی تھی آپ کا اسلوب نگارش مولوی محمد حسین آزاد سے کافی مشابہ تھا عبارت رنگین اور مقفیٰ و مسجع ہوتی تھی اور نثر میں شعر کی تمام تر لطافت و رنگینی جھلکنے لگتی تھی قدرتی مناظر کی تصویر کشی میں ان کا قلم خوب جوہر

دکھاتا تھا

سید شبیر حسن نیازی ایک درویش صفت بزرگ تھے اپنے والد حضرت فدا سے بھی کسب فیض کیا اور حضرت شاہ نیاز بریلوی سے بیعت ہوئے قرآن حکیم کثرت سے ان کے زیر مطالعہ رہتا تھا قاری تو نہیں تھے لیکن تلاوت کلام کا ان کا اپنا ایک منفرد انداز تھا جو نہایت دل پذیر تھا اور سننے والوں کے قلوب پر گہرا اثر کرتا تھا اردو کے مشہور انشاء پرداز خواجہ حسن نظامی کے ساتھ آپ کی کافی رفاقت رہی' پاکستان آنے کے بعد لاہور سے اپنے والد مرحوم حضرت فدا گلاؤٹھوی کی یاد میں ماہنامہ "فدائی" جاری کیا اس کے بعد آپ کراچی منتقل ہو گئے جہاں ۱۹۵۳ء میں انتقال کیا اور لیاقت آباد کے قبرستان میں مدفون ہوئے آپ کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں بڑے بیٹے سید مشیر حسن واسطی مدۃ العمر ادارہ روزنامہ جنگ سے وابستہ رہے اور دوسرے سید محبوب حسن واسطی ایک عالم دین سکالر اور متعدد کتب کے مصنف و مولف ہیں۔

سید کفیل احمد

آپ سید ضامن علی کے صاحبزادے تھے جو برطانوی عہد میں تحصیلدار کے منصب پر فائز رہے ہندوستان میں انگریزوں کی حکمرانی کا یہ وہ دور تھا جب بہت کم ہندوستانی تحصیلداری کے منصب پر پہنچ پاتے تھے سید کفیل احمد نے آنکھ کھولتے ہی والد کا دور اقتدار دیکھا جس میں قدرت نے انہیں بہترین تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم کیے ان کی تین بہنیں اور دو بھائی اور بھی تھے جن میں سے ایک بہن شہربانو سید عبدالواسع سے منسوب ہوئیں جو صوبائی سول سروس کے رکن تھے اور ڈپٹی کلکٹر کے منصب سے ریٹائر ہونے کے بعد ایک ریاست میں وزیر بھی رہے اس طرح سید کفیل احمد کا تعلق ایک اور مقتدر گھرانے سے بھی استوار رہا آپ کے ایک بھائی سید طفیل احمد اور دوسرے سید جمیل محمد تھے جو پولیس کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر گلاؤٹھی ہی میں قیام پذیر ہوئے اور داروغہ جمیل محمد کے نام سے جانے پہچانے گئے۔

سید کفیل احمد کو ان کے والد تحصیلدار سید ضامن علی نے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور وہ قانون کی ڈگری لے کر بلند شہر میں وکالت کرنے لگے اور اس حیثیت میں وہ گلاوٹھی کی آبادی سے پہلے وکیل کے طور پر متعارف ہوئے سید کفیل احمد نہایت خوبصورت شخصیت کے مالک تھے آپ کے حسن اخلاق کے ساتھ ساتھ آپ کی وجاہت بھی آپ کی شہرت کا سبب بنی شرافت کا پیکر اور تہذیب و شائستگی میں منفرد خیال کیے جاتے تھے آپ کا شمار بلند شہر کے قابل ترین وکلاء میں ہوتا تھا اور اپنے مجلسی اوصاف کے باعث تمام حلقوں میں نہایت عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے دل میں اہل گلاوٹھی کے لیے اور خصوصاً" عزیز واقارب کے لیے محبت کا ایک خاص گوشہ رکھتے تھے جس نے ان کی شخصیت کو اور بھی دل پذیر بنا دیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے اور یہیں انتقال کیا آپ کی اولاد میں دو بیٹے سید شکیل احمد اور سید خلیل احمد کے علاوہ دوبیٹیاں شکیلہ اور آصفہ ہوئیں خوش قسمتی سے آپ کی اولاد بھی اپنے والد کی خوبیوں سے متصف ہوئی۔

سید محمود مورّخ

آپ ایک صاحب طرز ادیب افسانہ نگار اور اردو انگریزی کے بلند پایہ صحافی تھے آپ گلاوٹھی کی محترم شخصیت سید عبدالعلیم کے لائق اور ذہین فرزند تھے آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ محمودہ بیگم سید جعفر علی کی دختر نیک اختر تھیں جو مہاراجہ کپور تھلہ کے خصوصی طبیب تھے چنانچہ سید محمود مورخ نے تعلیم کپور تھلہ ہی میں حاصل کی آپ کی والدہ کے انتقال کے بعد آپ کے والد سید عبدالعلیم نے دوسری شادی قاضی سید حبیب اللہ کی دختر سیدہ شاہ جہانی بیگم سے کی جو علامہ سید قابل گلاوٹھوی کی حقیقی بہن تھیں اس طرح ایک اور علمی خانوادے سے تعلق نے سید محمودمورخ کی فکر وفن کی صلاحیتوں کو اور بھی جلا بخشی۔

سید محمود مورخ متعدد انگریزی اردو اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے جن

میں انگریزی روزنامہ نیشنل کال خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کے وہ اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے ان کی انگریزی میں ایسی ہی روانی ہوتی تھی جیسی اردو میں انہوں نے ۳۱-۱۹۳۰ء میں خود بھی ایک اردو روزنامہ "مسلمان" کا اجراء کیا جس کے وہ خود ایڈیٹر تھے اس کے علاوہ ہفت روزہ "گلفروش" بھی ان کی زیر ادارت نکلتا رہا جس میں شائع ہونے والی ان کی ادبی نگارشات نے انہیں بام شہرت تک پہنچا دیا ان کے افسانے بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے جن کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا سید محمود مورخ کا انتقال تقسیم ملک سے کچھ قبل ہی ہو گیا تھا پاکستان میں ان کے پرانے ساتھیوں اور رفقائے کار میں جناب زیڈ اے سلہری ہیں جو ایک بلند پایہ صحافی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

منشی رحیم الدین

گلاؤٹھی کی معاشرتی زندگی میں ایک خاص قسم کا تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی تھی اس قصبہ کو جہاں اپنی آغوش میں جید علماء صوفیاء' مشائخ' ادباء' شعراء اور دیگر ماہرین علوم و فنون پروان چڑھانے کا شرف حاصل ہے وہاں ایسی شخصیتیں بھی اس کے دامان تربیت سے وابستہ نظر آتی ہیں جنہیں علم و فضل کا کوئی دعویٰ نہ تھا لیکن انہوں نے قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کا جس شعبہ میں بھی اظہار کیا وہ اس میں منفرد ٹھہرے ایسے ہی لوگوں میں گلاؤٹھی کی ایک ناقابل فراموش شخصیت منشی رحیم الدین بھی تھے جن کی ایک ٹانگ میں لنگ تھا اور جو ظرافت بذلہ سنجی مثنوی خوانی اور پیراکی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے برسات کی پھوار پڑتے ہی بستی کے اور پیراکوں کے ساتھ لال ڈگی جو قصبہ کے وسط میں ایک خوبصورت جھیل تھی پہنچ جاتے اور فن پیراکی کے کمال دکھاتے منشی رحیم الدین لیٹ کر تیرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ڈیڑھ دو فٹ گہرے پانی میں بھی لیٹ کر تیرنے کا کمال دکھاتے ٹانگ پر ٹانگ اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس طرح سطح آب پر دراز ہو جاتے گویا کسی آرام دہ مسہری پر لیٹے ہیں اور جب دل موہ لینے والی آواز اور لحن داؤدی سے مثنوی مولانا رومؒ پڑھتے تو سننے

والوں پر کیف طاری ہو جاتا جس کے کانوں میں یہ آواز پڑتی جھوم جھوم اٹھتا منشی رحیم الدین گلاؤٹھی کی ایک اہم اور دلچسپ شخصیت تھے قصبہ کی جامع مسجد کے مدرسہ منبع العلوم میں ابتدائی فارسی اور اردو کے معلم تھے خوش الحانی کے سبب ان کی میلاد خوانی کو بہت پسند کیا جاتا تھا اعلیٰ درجہ کے تاریخ گو بھی تھے بات بات پر تاریخ نکالتے تھے اور رنگ اکثر ظریفانہ ہوتا تھا آپ کثیر العیال تھے بیٹوں کے نام انشاء اللہ ماشاء اللہ اور سبحان اللہ رکھے بستی میں ان کے تعلقات ہندو مسلمان سبھی سے تھے اور سب ان کا احترام کرتے تھے۔

ابرار حسن

گلاؤٹھی میں پیراکی کے علاوہ جس کھیل کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی وہ کبڈی تھی اور ابرار حسن اس کھیل کی علامت بن گئے تھے وہ نہ تو کوئی اعلی تعلیم یافتہ شخص تھے اور نہ صاحب حیثیت لیکن ایک تو کبڈی کے کھیل میں دور دور شہرت حاصل کی اور روایت کا درجہ حاصل کیا دوسرے طبیعت میں بے پناہ اخلاص اور گلاؤٹھی اور اس کی روایات سے بے لوث محبت نے انہیں ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں کوئی بھی شخص ان کا ذکر کیئے بغیر گلاؤٹھی کے معاشرتی خدوخال بیان نہیں کر سکتا تھا وہ ہر سال محرّم کے موقع پر ایک سبیل کا اہتمام کیا کرتے اور اس روایت کو برقرار رکھنے میں دور دراز سے ملازمت کی پابندیوں کے باوجود بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر گلاؤٹھی پہنچتے اور سبیل لگاتے کبڈی کے کھیل میں ان کی حیرت ناک مہارت پولیس کے محکمے میں انہیں ملازمت مل جانے کا سبب بنی ان کا کھیل اتنا حسین اور پھرتی سے بھرا ہوا تھا کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے تھے وہ جب کبڈی دینے مخالف پالے میں جاتے تو ڈو ڈو یا کبڈی کبڈی کہتے ہوئے دیر تک اپنا سانس برقرار رکھتے اور اکثر اپنی مخالف ٹیم کے گرد کئی چکر لگاتے اور کسی کو ہمت نہ ہوتی کہ ان پر ہاتھ ڈالے اگر کوئی پکڑنے کی کوشش کرتا تو ان کی فطری پھرتی ان کا دفاعی اور حفاظتی ہتھیار بن جاتی اور وہ صاف بچ کر تیز دوڑتے ہوئے اپنے پالے میں آ جاتے کبڈی کے بے نظیر

ماہر ہونے کے ساتھ ہی وہ انتہائی شوخ اور ظریف بھی تھے۔

بلند شہر کی ایک نمائش میں گلاؤ ٹھی کی کبڈی ٹیم نے ابرار حسن کی قیادت میں سالانہ کھیلوں کے مقابلے میں شرکت کی ضلع کے حکام عمائد و روساء بڑے شوق سے ہر سال نمائش میں اپنا اپنا کیمپ لگاتے تھے کبڈی کا میچ دیکھنے والوں میں ضلع کے اعلی حکام بھی شامل تھے' انہیں ابرار کا کھیل اس قدر پسند آیا کہ انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انہیں پولیس میں ملازمت کی پیش کش کر دی ایک اور واقعہ جو ابرار حسن کی حب الوطنی اور سادات دوستی کی مثال ہے یہ ہے کہ انہیں دنوں کسی شخص نے گلاؤ ٹھی کے ایک سید گھرانے کے خلاف بلند شہر کے انگریز حکام سے یہ مخبری کر دی کہ اس گھر میں ملک المعظم کی حکومت کے خلاف لٹریچر اور اسلحہ وغیرہ ہے وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ گھرانہ تحریک خلافت سے خاص دلچسپی رکھتا تھا اور ذہنی طور پر انگریزوں کے خلاف تھا چنانچہ ان کے یہاں ایسا لٹریچر موجود ہونے کا امکان تھا۔ انگریز حال ہی میں جرمنی اور ترکی کے خلاف پہلی جنگ عظیم سے فارغ ہوا تھا اور اپنے زخم چاٹ رہا تھا انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کے مشورہ سے یہ پروگرام بنایا گیا کہ شب کے آخری حصہ میں طلوع سحر سے قبل اس گھر پر چھاپہ مارا جائے چنانچہ جب چھاپہ مار پولیس پارٹی کا انتخاب کیا گیا تو ابرار حسن کو بھی پتہ چل گیا کیونکہ وہ ان دنوں پولیس لائن میں متعین تھے یہ معلوم ہونے پر کہ علی الصبح گلاؤ ٹھی کے سید گھرانے پر چھاپہ پڑے گا اور پوری سادات کی تذلیل ہو گی ابرار حسن کی رگ حمیت پھڑک اٹھی عشاء کے وقت سپاہیوں کی آخری حاضری دینے کے بعد وہ بلند شہر سے چودہ میل فاصلہ پر واقع گلاؤ ٹھی کیلئے پیدل چل پڑے اور چھاپہ ڈالے جانے والے گھر گئی رات پہنچ کر دستک دی وہ لوگ ابرار حسن کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور چھاپے کی خبر سنتے ہی گھر سے ہر قابل اعتراض چیز ہٹا دی گئی اور راتوں رات کہیں سے حاصل کر کے ملک معظم اور ملکہ معظمہ کا فوٹو آویزاں کر دیا گیا' ابرار حسن راتوں رات ہی پیدل واپس بلند شہر پہنچے اور علی الصبح کی حاضری کے وقت پولیس لائن میں موجود تھے چھاپہ پڑا تو انگریز افسر کے ہاتھ کچھ نہ آیا بلکہ وہ دیکھ کر حیران تھا کہ ملکہ اور بادشاہ کی

تصاویر گھر میں نہایت عقیدت کے ساتھ آویزاں کی گئی تھیں۔ چنانچہ وہ انگریز جو دشمن بن کر آیا تھا صاحب خانہ کا دوست بن گیا اور ان کے میٹرک پاس فرزند کو پولیس میں بحیثیت انسپکٹر ملازمت دلانے کا ذریعہ بھی بن گیا۔

حافظ بہادر خان

گلاؤٹھی کی معاشرتی زندگی میں مختلف اوقات میں کچھ ایسی ہستیوں کا بھی عمل دخل نظر آئے گا جن کا تعلق اگرچہ سادات سے تو نہ تھا لیکن ان کے فیضان سے اہل قصبہ مستفیض ہوئے اور ان کی خدمات کے اثرات خاصے دوررس تھے ایسی ہی ہستیوں میں حافظ بہادر خان کا نام سرفہرست نظر آتا ہے وہ دہلی کے قریب ایک بستی بہادر گڑھ کے رہنے والے تھے لیکن مستقل طور پر گلاؤٹھی میں سکونت پذیر ہو چکے تھے وہ لال ڈگی کے متصل پلکھن والی مسجد میں مدرس تھے اور نہایت سخت گیر ہونے کے باوجود مقبول و محترم سمجھے جاتے تھے ان کے درس قرآن کے شاگردوں کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ سادات کے گھرانوں میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کے بچے حافظ بہادر خان سے نہ پڑھے ہوں چنانچہ حافظ بہادر خان کا نام گلاؤٹھی کے ماحول میں اپنی جملہ صفات کے ساتھ ایک ایسا عنصر بن گیا تھا جسے کوئی بھی نظرانداز نہیں کر سکتا تھا ان سے درس قرآن حاصل کرنے والوں میں ایسے طلباء کی کثرت تھی جنہوں نے آگے چل کر زندگی کے مختلف شعبوں میں نام پیدا کیا اور وہ آخری وقت تک حافظ صاحب کی شاگردی پر فخر محسوس کرتے رہے۔

حافظ بہادر خان پانی پت سے فیض یافتہ فنون قرات و تجوید کے ماہر حافظ و قاری تھے بلند و بالا قامت' کشادہ پیشانی' سفید دراز ریش بھاری بھرکم باوقار بارعب ادھیڑ عمر انسان تھے اور ناظرہ و حفظ قرآن کی معلمی ان کی زندگی کا نصب العین ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی تھی وہ مزاج کے سخت بااصول اور کم سخن تھے' ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے سر جھکائے آنکھیں بند کئے طلباء سے قرآن سنتے رہتے تھے اگر کسی سے پڑھنے میں سہو ہو جاتا اور کسی لفظ کی ادائیگی غلط ہوتی تو معاً" آنکھیں

کھول کر دیکھتے' پڑھنے والا لرز جاتا اور صحیح پڑھنے لگتا ان کے ممتاز طلباء میں سید رحیم اللہ قابل' حکیم سید محمد مصلح' سید فصیح اللہ' سید سبحان اللہ اور سید احمد علی شامل تھے۔

حکیم اللہ رکھا

ایسے ہی ایک اور شخص جن کا سادات سے تو تعلق نہ تھا لیکن اپنی خدمات کی وجہ سے صرف اہل قصبہ ہی نہیں بلکہ مضافات کے لوگوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے حکیم اللہ رکھا تھے جو بنیادی طور پر ایک جراح تھے بلکہ انہیں یہ پیشہ اپنے اجداد سے ورثہ میں ملا تھا گلاؤٹھی ایک چھوٹی جگہ ہونے کی حیثیت سے جدید طبی سہولتوں سے تقریباً" محروم ایک قصبہ تھا جید اور ماہر اطباء کی یقیناً" کوئی کمی نہ تھی لیکن ایلوپیتھی میڈیسن اور سرجری کے سلسلہ میں کبھی کوئی معقول سہولیات میسر نہیں تھیں البتہ چالیس کی دہائی میں ایک ہندو ایل ایس ایم ایف ڈاکٹر خزان سنگھ نے اپنا کلینک قائم کر لیا تھا جو مقامی آبادی کیلئے نہایت ناکافی تھا جبکہ پورے قصبہ میں کوئی سرجن نہ تھا ان حالات میں جراحی میں ایک خاندان نے مہارت حاصل کی اور حکیم اللہ رکھا سے پہلے ان کے والد سکندر بھی ایک نامور جراح تھے' اللہ تعالی نے اس خاندان کے ہاتھ میں ایسی شفاء عطا کی تھی جس کے نتیجہ میں گلاؤٹھی اور مضافات کے ہزاروں افراد فیضیاب ہوئے حکیم اللہ رکھا حافظ شفیع الدین کے مکان کے مقابل چوک کے سرے پر اپنی رہائش رکھتے تھے چوک میں دو اک تخت اور سرکنڈوں سے بنے ہوئے چند موڑھے پڑے ہوتے تھے جہاں وہ مریضوں کو دیکھتے تھے ہر روز مریضوں کا ایک جم غفیر ہوتا تھا اور حکیم اللہ رکھا کے پاس خاندانی نسخہ کے طور پر بظاہر صرف دو مختلف قسم کے مرہم ہوتے تھے جن سے بڑے سے بڑے اور خطرناک سے خطرناک زخموں کا علاج ہوتا تھا اور اللہ کے حکم سے دو ایک دفعہ کی مرہم پٹی کے بعد ہی مریض شفایاب ہو جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ حکیم اللہ رکھا کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی اور لوگ ان کے کامیاب مگر حیرتناک علاج کے معترف ہو چکے تھے۔

حکیم اللہ رکھا کے دو بیٹے محمد علی اور مختار بھی باپ کا ہاتھ بٹاتے تھے اور اس تجربہ سے جو "نسلاً بعد نسلاً" ان کے خاندان کا ورثہ بن گیا تھا دونوں بیٹے پوری طرح فیضیاب ہوئے اور آج بھی گلاؤٹھی میں جراحی کا یہ حیرت ناک مرکز حکیم اللہ رکھا کے بیٹے مختار کے ہاتھوں نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔

مقدم فیضیاب خان

میواتی اور جھوجہ ذات کے لوگ بھی گلاؤٹھی کی آبادی میں خاصے نمایاں تھے۔ یہ لوگ بڑے محنتی اور جفاکش تھے اور ترقی کرنے کی لگن نے ان کی زندگیوں میں خوشگوار تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ یہ لوگ معاشی خوشحالی اور حصول تعلیم کی دوڑ میں بھی پوری طرح شریک ہو چکے تھے۔ مقدم فیضیاب خاں ان حضرات میں سب سے زیادہ نمایاں تھے وہ ذات کے میواتی تھے اور ایک خوشحال زمیندار تھے بلکہ رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے گلاؤٹھی میں اپنے اردگرد اپنے مداحوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا جو انہیں ایک روایتی رئیس کے روپ میں دیکھنے کیلئے انجمن آرائی کرتے رہتے تھے۔ مقدم فیضیاب کو شعر و سخن کی محفلین منعقد کرنے کا بے حد شوق تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے مکان پر اکثر طرحی اور غیرطرحی مشاعرے منعقد ہوتے جن میں شعرا و سامعین کی دل کھول کر تواضع کی جاتی اس روایت سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ گلاؤٹھی میں شعر و شاعری کا خوب چرچہ رہا مقدم فیضیاب خود بھی بحیثیت شاعر متعارف ہوئے اور اکثر اپنے کلام پر حضرت فدا گلاؤٹھوی سے اصلاح لیتے تھے وہ بستی کے دیگر استادان شعر کا بھی بے حد احترام کرتے تھے اور خواہش رکھتے تھے کہ قصبہ میں ان کی نمایاں حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

مقدم فیضیاب کو حکام اور مقتدر شخصیتوں سے مراسم بڑھانے کا خاص شوق تھا۔ وہ اکثر اہم شخصیتوں کو اپنے یہاں مدعو کرتے رہتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی کی شادی خورجہ کے کسی اپنی ہی برادری کے نوجوان سے طے پا گئی تھی۔ برات میں ضلع

کے بڑے بڑے افسران شریک تھے اس موقع پر ایک مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریز حکومت نے مقدم فیضیاب کو آنریری مجسٹریٹ بھی مقرر کر دیا تھا اور ان کے والد مقدم فتح یاب خاں کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی معاونت کرنے کے صلہ میں بطور جاگیر اراضیات عطا کی گئی تھیں جو انگریزوں سے نبرد آزما ہونے والے حریت پسند اہل قصبہ سے ضبط کی گئی تھیں۔

ڈاکٹر سید شمیم الدین

حافظ شفیع الدین جو گلاؤٹھی کی ایک جامع الصفات شخصیت تھے اور جنہوں نے اہل قصبہ کی سماجی سیاسی اور تعلیمی شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اپنی ذہانت اور معاملہ فہمی کے لئے بھی ممتاز گردانے جاتے تھے چنانچہ یہی اوصاف ایک حد تک ان کی اولاد میں بھی وراثتاً منتقل ہوئے لیکن علم و حکمت اور زیرکی و دانائی کا جو ورثہ ان کے بیٹے سید شمیم الدین کو ملا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ شمیم الدین بچپن ہی سے نہایت ذہین اور حصول علم کے بے پایاں شوق سے سرشار تھے ان کے معاصران کی ذہنی باریکیوں اور نہایت متحرک غور و فکر کی صلاحیتوں کے گواہ ہیں۔ لیکن افسوس کہ یہ نوجوان جو اپنی زندگی میں چونکا دینے والے علمی کارنامے انجام دے سکتا تھا۔ اپنی عمر طبعی کو پہنچے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

خوش درخشید ولے شعلہ ء مستعجل بود

سید شمیم الدین نے ابتدائی تعلیم گلاؤٹھی میں حاصل کی اور میٹرک مسلم ہائی سکول بلند شہر سے کیا اور ہمیشہ تعلیمی نتائج کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے حامل رہے۔ انٹرمیڈیٹ میں بنیادی مضامین فزکس اور کیمسٹری وغیرہ تھے اور وہ اس لئے کہ بزرگوں کی خواہش انہیں ایک انجینئر بنانے کی تھی لیکن ان کا رجحان ابتداء ہی سے نفسیاتی موضوعات کی طرف تھا چنانچہ پنجاب یونیورسٹی سے امتیازی پوزیشن کے ساتھ بی اے

کرنے کے بعد ایم اے نفسیات میں کیا اور اس موضوع کے ساتھ اپنے شغف علمی سے ثابت کر دیا کہ یہی ان کے مستقبل کا میدان ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جب امریکہ کی ہیلیفکس یونیورسٹی (Halifax University) سے پی ایچ ڈی کیا تو ثابت ہو گیا کہ قدرت نے انہیں ایک ماہر نفسیات ہونے کا اعزاز دینے کیلئے پیدا کیا تھا۔ ڈاکٹر سید شمیم احمد نے امریکہ کی مختلف جامعات میں معلّمی کے فرائض انجام دیئے اور ایک ممتاز سکالر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو اپنی مادر علمی یعنی ہیلیفکس یونیورسٹی میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔
بین الاقوامی سطح کے رسائل و جرائد میں آپ کے علمی مقالات شائع ہوئے لیکن موت کے فرشتے نے زیادہ مہلت نہ دی اور کم عمری ہی میں امریکہ میں انتقال ہو گیا تاہم آپ کی میت کو پاکستان لایا گیا اور آپ کراچی میں مدفون ہوئے۔

سید محمد احمد واسطی

مبارک ہیں وہ لوگ جو بزرگوں کے اوصاف حمیدہ کو اپنی ذات اور شخصیت کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں اور خاندانی ورثہ کی پاسداری ان کی زندگی کا نصب العین بن جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک مبارک ہستی سید محمد احمد واسطی تھے جنہوں نے اپنے والد بزرگوار سید محمود احمد واسطی کی رواداری، ملنساری، اقرباء پسندی، اخلاص و یگانگت اور محبت و بے لوثی جیسی تمام خوبیاں اپنائیں اور اپنی نرم و شیریں گفتاری سے ان میں اضافہ کیا۔ سید محمد احمد انہیں اوصاف کے سبب اعزاء میں بے حد مقبول تھے اور دل سے احترام کے مستحق سمجھے جاتے تھے انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور حکومت کے بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے لیکن اپنے مثالی اخلاق اور منکسر مزاجی کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا، سماجی بہبود کے کاموں میں اس قدر دلچسپی لیتے کہ ان کی ایسی مصروفیات ان کی حد تک عبادت کا درجہ اختیار کر گئیں تھیں۔

۱۶ جون ۱۹۲۹ء کو گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے لیکن چونکہ والد اپنے روزگار کے سلسلے میں ریاست جودھپور میں مقیم تھے اس لئے آپ کی ابتدائی تعلیم جودھپور ہی میں

ہوئی البتہ گلاؤٹھی آنا جانا کثرت سے رہا یہی وجہ تھی کہ محمد احمد واسطی کو اپنے مولد و منشاء گلاؤٹھی سے خاص لگاؤ تھا اور اپنے تمام بہن بھائیوں میں عزیز و اقارب سے مراسم استوار رکھنے میں وہ سب سے زیادہ پیش پیش رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے چنانچہ تعلیم کراچی میں ہی مکمل کی آپ کی شادی حافظ سید شفیع الدین کی نواسی سے ۹ جولائی ۱۹۸۱ء کو بہادریور میں ہوئی آپ کے خسر حافظ سید عبدالغنی ان دنوں بہاریور ہی میں بہ سلسلہ روزگار مقیم تھے۔

سید محمد احمد واسطی کا عہد طالب علمی نصابی و غیرنصابی سرگرمیوں میں نمایاں امتیازات سے بھرا پڑا ہے۔ آپ نے کراچی یونیورسی سے بی اے آنرز کرنے کے بعد ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی اور ۱۹۵۹ء میں کراچی ہی میں ایکسپورٹ پروموشن بیورو میں وفاقی وزارت تجارت کے تحت ملازمت کا آغاز لیا اور بعد میں ملک کے اندر اور باہر اہم مناسب جلیلہ پر فائز رہے دنیا کے مختلف ممالک میں پاکستانی صنعتوں کی نمائش کے انتظام و انصرام کے منتظم اعلی رہے اہم سرکاری خدمات کے سلسلہ میں ۱۹۶۷ء میں لندن ۱۹۷۱ء میں کھانا اور جدہ ۱۹۷۲ء میں بغداد (عراق) اور ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک سات سال مسلسل دوبئی میں پاکستان کے کمرشل کونسلر رہے آپ ۱۹۸۵ء میں چین بھی گئے اور اس طرح بیرونی دنیا میں اپنے وطن عزیز پاکستان کا نام روشن کیا۔ دوبئی سے واپسی پر آپ کو ایکسپورٹ پروموشن بیورو میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ پر تعینات کر دیا گیا تھا جہاں سے آپ ۱۹۸۹ء میں ساٹھ سال کی عمر پا کر ریٹائر ہوئے۔

آپ کو ابتداء سے کھیلوں سے خاص شغف رہا سکول کے زمانے میں بھی سکول ٹیم کے کپتان تھے اور ایل ایل بی کی تعلیم کے دوران بھی ایس ایم لاء کالج کراچی کی فٹ بال ٹیم کے کپتان رہے۔ معاشرتی بہبود کے کاموں سے دلی لگاؤ تھا۔ اور خدمت خلق کو عبادت سمجھتے تھے چنانچہ جب ان کی رہائش ملیر میں تھی تو آپ رفاہ عام سوسائٹی کے پانچ سال تک چیئرمین رہے۔ دو بار ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کے صدر رہے ان کے دور میں ادارہ نے سماجی بہبود کے متعدد قابل ذکر کام انجام دیئے لیکن آپ کی عمر نے مزید وفا نہ کی اور ۱۱ اگست ۱۹۹۶ء کو اچانک دل کا دورہ

پڑنے سے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

سید احمد

سید احمد کی ذات اور شخصیت کا احاطہ کرنے سے پہلے ہی علامہ اقبال کا ایک شعر اچانک حافظے میں تازہ ہو گیا ہے۔

وہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

شخصیتوں کی نشوونما اور تعمیر و تشکیل میں مکتب کی کرامت اور فیضان نظر دونوں ہی کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن ان دونوں عوامل کی اثر پذیری میں ایک نمایاں اور واضح فرق ہے فیضان نظر خوش نصیبوں کو حاصل ہوتا ہے اور انسان کے باطنی ارتقاء میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بزرگوں کی صحبت میں اکتساب فیض لامحدود ہوتا ہے اور ماحول سے تجربہ و مشاہدہ کی میزان میں تل کر جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کسی بھی مکتب کی کرامت سے ماورا ہے چنانچہ ان زاویہ ہائے نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہمیں سید صاحب کی ذات میں مکتب کی کرامت اور فیضان نظر کا ایک جامع امتزاج ملتا ہے وہ گلاؤٹھی کے ایک ذی علم خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ لیکن انہوں نے مکتب کے مراحل اپنے بزرگوں کے زیر سایہ ریاست کپور تھلہ میں طے کئے۔ گلاؤٹھی سے رابطہ بدستور رہا اور اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جب وہ بسلسلہ ملازمت دہلی منتقل ہو گئے گلاؤٹھی میں مستقل قیام کی نوبت تو شاید کبھی نہ آئی لیکن بطور وطن اس چھوٹی سی بستی سے ان کی والہانہ محبت اور اقرباء و اعزاء سے تعلق خاطر ان کے جذباتی رویوں کی مستقل بنیاد بن گیا جو آج بھی اس طرح تروتازہ ہے جس طرح بچپن میں تھی' ظاہر ہے کہ ان کی شخصیت کے اس پہلو میں مکتب کی کرامت کو ہرگز دخل حاصل نہیں بلکہ اقربا نوازی اور وطن دوستی کے اس جذبہ کا محرک وہ خاندانی ورثہ ہو سکتا ہے جو

بزرگوں سے انہیں منتقل ہوا۔

قیام پاکستان سے قبل سید صاحب کے قیام دہلی نے ان کی ذہنی و فکری تربیت میں زبردست کردار ادا کیا یہ وہ دور تھا جب تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی اور دہلی علم و حکمت اور شعر و ادب کے حوالے سے بھی برصغیر کا اہم ترین مرکز بن گیا تھا۔ سیاست و ادب کی عظیم اور قد آور شخصیات کا محور و مرکز دہلی تھا اور ان شعبہ ہائے حیات میں بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے دہلی کو ایک ایسی کھلی کتاب کی مانند بنا دیا تھا جس کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے کوئی بھی قاری فیضیاب ہو سکتا تھا۔

سید صاحب کو آداب مجلسی کا ڈھنگ بچپن ہی سے آتا تھا اور بزرگوں کی تربیت اور مکتب کے فیضان کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں دل و دماغ کی صلاحیتوں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ عصری و تاریخی بصیرتوں کے ایسے اوصاف عطا کئے تھے جنہیں دہلی کے ماحول نے اور بھی جلا بخش دی تھی یہیں انہیں مختلف شعبہ ہائے حیات میں بڑی بڑی شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور تحریک پاکستان سے ذہنی اور عملی وابستگی نے ان کے ملی شعور کو اور بھی پختہ کر دیا چنانچہ آج بھی پاکستان سے قلبی لگاؤ کی سید صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس ارض مقدس کے خلاف ایک لفظ سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے اور بڑے سے بڑے تعلق کو بھی قربان کر دینے سے انہیں دریغ نہیں ہوتا۔

سید صاحب کی فکری نشوونما میں ان کے تاریخی شعور نے خاص کردار ادا کیا ہے۔ خصوصاً" اسلامی تاریخ پر وہ ایک دردمند مسلمان اور باصلاحیت سکالر کی حیثیت سے گہری نظر رکھتے ہیں اور ان عظیم شخصیتوں کے نقوش کو اپنے دل میں سجائے ہوئے ہیں جنہوں نے ہمارے اسلامی و دینی ورثے کو اپنے کمالات اور قربانیوں سے مالا مال بنا دیا ہے۔ سید صاحب کی بہت اہم اور سب سے بڑی مصروفیت ان کا مطالعہ ہے جس نے ان کی علمی شخصیت کو اور بھی تہہ در تہہ بنا دیا ہے۔ وہ حالات حاضرہ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور پاکستان کو پہنچنے والے کسی بھی نقصان سے ان کا دل تڑپ

اٹھتا ہے وہ ایسے لوگوں کو قابل نفرت سمجھتے ہیں جو اس مملکت خداداد سے فیضیاب ہونے کے باوجود اس کے خلاف زبان دراز کرتے ہیں یا اس پاک سرزمین کے احسانات کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

سید صاحب حکومت پاکستان کی ملازمت سے بحیثیت انکم ٹیکس افسر ریٹائر ہوئے پاکستان کے وجود میں آنے کے فوراً بعد ہی لاہور آگئے تھے اور اپنی آنکھوں سے مہاجرین کے غول در غول سرحد عبور کر کے ارض پاک میں داخل ہوتے دیکھے ان کی بحالی کے مسائل کا مشاہدہ کرتے رہے اور نئی مملکت کے مشکل حالات کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنائے رکھا۔ تاہم اپنی ملازمت کے سلسلہ میں مسلسل کئی سال ملتان میں گزارے اور وہ بھی اس طرح کہ سید صاحب اہل قلم اور اہل دانش کے حلقوں کی جان بنے رہے۔ ان کے اخلاص اور ان کی حقیقت پسندی نے انہیں اہل دل کی نظر میں محترم بنا دیا تھا ورنہ انکم ٹیکس جیسے محکمے میں رہ کر جہاں سید صاحب نے سرخروئی اور عزّت کمائی وہاں لوگ ایمان جیسی دولت بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ ملتان سے کراچی منتقل ہو گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے غالباً اس لئے کہ اس شہر سے زیادہ اہل گلاؤٹھی انہیں کہیں اور مرتکز نظر نہ آتے تھے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے درمیان رہ کر محبتوں کے رشتوں کو استوار کیا جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے انہیں ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کا پلیٹ فارم میسر آیا جس کے وہ صدر بھی رہے اور اب بھی ایک متحرک رکن کی حیثیت سے فلاحی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک شفاف دل سے نوازا ہے اور اس مرد قلندر کا یہی ایک اثاثہ ہے۔

سید محبوب حسن واسطی

ادیب، خطیب، محقّق، مصنف اور عالم دین ہونے کے اعزازات کچھ کم نہ تھے۔ لیکن قدرت نے سید محبوب حسن واسطی کو نسبی تفاخرات سے بھی نوازا اور حضرت فدا گلاؤٹھوی جیسے عظیم شاعر کے پوتے اور سید شبیر حسن جیسے صاحب طرز انشاپرداز کے بیٹے ہونے کی سعادت ان کے حصہ میں آئی۔ اسی نسبت سے خود آگاہی

اور خدا آگاہی کے وہ اوصاف بھی انہیں ورثہ میں ملے جو ان کے بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ سید محبوب حسن واسطی ۱۹۳۲ء میں بستی نظام الدین دہلی میں پیدا ہوئے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء المعروف بہ محبوب الٰہی کی بستی میں پیدائش کی مناسبت سے محبوب نام رکھا گیا ابتدائی تعلیم مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ کے مشہور مدرسہ امینیہ دہلی میں ہوئی مدرسہ فتح پوری دہلی میں آپ فارسی کے طالب علم رہے نیز ابتدا" دریا گنج دہلی کے ڈی اے وی ہائی سکول میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔

قیام پاکستان کے بعد سید محبوب حسن واسطی اپنے والدین کے ہمراہ ہجرت کر کے لاہور آگئے اور مدرسہ اشرفیہ نیلا گنبد اور بعد میں کراچی منتقل ہونے کے بعد مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی میں دیگر دینی کتب اور موقوف علیہ کے طالب علم رہے۔ بعدازاں سال ۵۰۔۱۹۴۹ء میں آپ کے والد نے آپ کو ملتان بھجوا دیا جہاں خیرالمدارس سے آپ نے دورہ حدیث کیا اور سند الحدیث والا جازۃ حاصل کی آپ ابھی بمشکل سولہ برس کے ہوں گے کہ اس کم عمری ہی میں آپ کو یہ اعزاز حاصل ہو گیا۔ دینی تعلیم کے میدان میں ان گرانقدر کامیابیوں کے بعد اللہ تعالی نے آپ کو علوم دینوی کے حصول کی بھی توفیق ارزانی فرمائی اور آپ کراچی یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت میں بیچولرز ڈگری لے کر فارغ التحصیل ہوئے اور یہ سب کچھ بیک وقت معاشی زندگی کی ضرورتوں کو مختلف ملازمتوں کے ذریعہ پورا کرتے ہوئے ممکن ہوا بالاخر آپ نے پی آئی اے کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں باقاعدہ ملازمت کا آغاز کیا اور یہیں سے ۱۹۹۲ء میں بحیثیت سینئر اکاؤنٹس آفیسر ریٹائر ہوئے۔

دوران ملازمت سید محبوب حسن واسطی ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۵ء طرابلس (لیبیا) میں ڈیپوٹیشن پر رہے آپ نے اپنی صلاحیتوں کے اعتراف میں متعدد کیش ایوارڈز اور تعریفی اسناد بھی حاصل کیں۔ دوران ملازمت ہی برطانیہ' امریکہ' جرمنی' آسٹریلیا' ترکی' مصر' سعودی عرب' شام' بنگلہ دیش' یمن' ملائشیا اور سنگاپور کے سرکاری و نجی دورے کئے طالب علمی ہی کے زمانے سے لکھنے کا شوق رہا ایس ایم کالج کراچی کے میگزین برائے سال ۱۹۵۵ء کے انگریزی سیکشن کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے اور اپنے تحقیقی مقالے

"عمر خیام" پر بہترین مقالہ نگار کا اعزاز حاصل کیا اس کے علاوہ کراچی یونیورسٹی میگزین ۱۹۵۷ء میں اپنے انگریزی تحقیقی مقالہ "جارج برنارڈ شاہ کی کردار نگاری کے محاسن" پر ایوارڈ حاصل کیا۔ کراچی کے روزنامہ جنگ اور انجام دہلی کے ماہنامہ مخدوم جہاں لاہور کے مجلّہ سہرورد اور کراچی کے ماہناموں تدریس القرآن منشور، نقاد، اسوہ حسنہ اور اسلامی دنیا کیلئے تقریباً پچاس مقالات لکھے آپ کی مطبوعہ کتب یہ ہیں۔ حج و قربانی، روزہ، محسن انسانیت، نسمات القدس (اردو)، ماہ رمضان المبارک، نسمات القدس کو آپ نے فارسی سے اردو میں منتقل کیا اس کے علاوہ ایک اور اہم ترجمہ جو آپ نے کیا وہ گلاؤٹھی کے سید محمد حسینی واسطی کے ڈیڑھ سو سالہ پرانے فارسی قلمی نسخہ "تذکرہ الاقرباء و شجرۃ الاولیاء" کا ہے جو کتاب ہذا میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔

ڈاکٹر ظفر ایچ زیدی

گلاؤٹھی سے متّصل موضع سینٹہ کے ایک معزز و محترم خاندان سادات زیدی کے چشم و چراغ ہیں اور جّید طبیب و صاحب دیوان شاعر سید تہور علی زیدی کے روشن دماغ فرزند جنھوں نے دنیائے علم میں اپنی کاوش و حکمت کے گہرے نقوش ثبت کئے اور ملکی و بین الاقوامی سطح پر ایسے اعزازات حاصل کئے جن کے نتیجہ میں وہ آج پاکستان کی سب سے بڑی دانش گاہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر (رئیس الجامعہ) کے اعلیٰ و ارفع منصب پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر ظفر زیدی بلند شہر میں تقسیم ملک سے قبل پیدا ہوئے لیکن تعلیم کے مدارج پاکستان آنے کے بعد حیدر آباد (سندھ) میں طے کئے جہاں آپ کے والد نے مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے یونیورسٹی آف سندھ حیدر آباد سے ۱۹۶۱ء میں بی ایس سی آنرز اور ۱۹۶۳ء میں کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا۔ ۱۹۶۸ء میں انگلستان کی مشہور زمانہ یونیورسٹی لیڈز سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۹۳ء میں ڈی ایس سی۔ انگلستان جانے سے قبل (۶۵-۱۹۶۳ء) گورنمنٹ کالج حیدر آباد میں بحیثیت لیکچرر ملازمت اختیار کی۔ کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی کے قائم کردہ

انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری سے وابستگی کے دوران (۷۹-۱۹۷۸ء) پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ میں سینئر ریسرچ آفسر کے منصب پر فائز رہے۔ ۷۶-۱۹۷۳ء کے دوران میونخ (جرمنی) میں میکس پلینک انسٹی ٹیوٹ میں سینئر سائنٹسٹ رہے۔ ۱۹۷۸ء میں کراچی یونیورسٹی میں اولاً ایسوسی ایٹ پروفیسر مقرر ہوئے اور پھر پروفیسر ہو گئے اور ۲۵ جولائی ۱۹۹۷ء سے وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز ہیں۔

پاکستان میں پروفیسر زیدی کو پروٹین کیمسٹری کا نقیب سمجھا جاتا ہے اس سلسلہ میں کراچی یونیورسٹی میں ۱۹۶۹ء میں لیبارٹریز کے قیام کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ اس شعبہ میں آپ کی علمی کاوشوں کا اعتراف عالمی سطح پر بھی کیا گیا ہے اور آپ کے تحقیقی مقالات کو مستند بین الاقوامی کتب کی زینت بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر زیدی کو متعدد تحقیقی منصوبوں میں جو قومی و بین الاقوامی اعانت سے شروع کئے گئے پرنسپل انویسٹی گیٹر کی حیثیت حاصل رہی ہے آپ نے کراچی یونیورسٹی میں کم و بیش اٹھارہ پی ایچ ڈی اور پانچ ایم فل کے طلباء کے کام کی رہنمائی و نگرانی کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ ایران کی تہران یونیورسٹی جنوبی امریکہ کی پیرو یونیورسٹی میں بھی آپ کو یہی مقام و مرتبہ حاصل رہا ہے۔

ڈاکٹر زیدی نے نصف درجن سے زیادہ کتب ایڈیٹ اور تصنیف کی ہیں۔ جنھیں مشہور بین الاقوامی طباعتی اداروں نے شائع کیا ہے۔ نیز بین الاقوامی شہرت کے رسائل و جرائد میں سو سے زیادہ تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے آپ کو تحقیقی مقالات سپرد قلم کرنے کے اعتراف میں اول انعام اور مزید ایک اول انعام ایک کتاب کی تصنیف پر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۴ء میں بھی وفاقی وزارت تعلیم کی جانب سے ڈاکٹر زیدی کی ایک تحقیقی کاوش پر اول انعام دیا گیا۔

ڈاکٹر زیدی نے ۱۹۷۹ء میں کیمیکل سوسائٹی آف پاکستان کے زیراہتمام ایک مجلّہ کا آغاز کیا اور اس کے پہلے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اس کے علاوہ آپ پاکستان میں اور بیرون ملک تحقیقی جرائد کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی ہیں۔ ڈاکٹر

زیدی نے پاکستان میں پروٹین کیمسٹری کے شعبہ میں چار بین الاقوامی کانفرنسوں اور ورکشاپ کا اہتمام کیا اس کے علاوہ ۱۹۹۱ء میں بھی متعلقہ شعبہ میں ایک ورکشاپ منعقد کی۔ آپ نے متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور لیکچر دیئے۔ ۱۹۷۳ء میں پاکستان میں پہلے گریجویٹ پروگرام کے طور پر آپ نے کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر سائنس قائم کیا اور بی سی سی آئی فاسٹ کے زیرانتظام جو اب صرف فاسٹ (FAST) کے نام سے متعارف ہے لاہور میں ۱۹۸۳ء ہی میں انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرونکس قائم کیا۔

ڈاکٹر ظفر ایچ زیدی پاکستان اکیڈمی آف سائنسز کے علاوہ متعدد قومی اور بین الاقوامی تنظیموں کے فیلو ہیں۔ جن میں امریکہ کی پروٹین سوسائٹی اٹلی کی تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسزاور برطانیہ کی بائیو کیمیکل سوسائٹی شامل ہیں آپ انٹرنیشنل یونین آف بائیولوجی کی مطبوعات اور فرانس کو ڈیٹا ٹاسک گروپ کے رکن ہیں اور کیمیکل سوسائٹی آف پاکستان کے ۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۸ء کی مدت کے صدر ہیں۔

ڈاکٹر زیدی کو ۱۹۹۵ء میں گورنمنٹ کالج حیدر آباد کی جانب سے پاکستان جوبلی ایوارڈ دیا گیا ڈاکٹر زیدی کی کاوشوں کو ملک و بیرون ملک سراہا گیا اور صدر پاکستان نے انہیں تمغہ امتیاز اور صدر ایران نے خوارزمی تمغہ سے نوازا ہے۔

اس قدر قومی و بین الاقوامی اعزازات کے حامل ڈاکٹر ظفر ایچ زیدی کی شخصیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایک نہایت منکسر مزاج اور مرنجا مرنج انسان ہیں اور اعزاء و اقرباء کیلئے دل میں بے پناہ احترام و محبت رکھتے ہیں۔

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

سید ظفرالدین احمد

معلّم، محقّق اور مصنّف سید ظفر الدین احمد اپنے گلاؤٹھی کے معاصرین میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی علمی کاوشیں کئی دہائیوں پر محیط ہیں اور ایک بلند پایہ ماہر تعلیم کی حیثیت سے برصغیر ہی نہیں بلکہ افغانستان میں بھی متعارف ہیں جہاں کابل میں کم و بیش دس سال تک کالج کی سطح پر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اہل گلاؤٹھی کو آپ کا ممنون ہونا چاہئے کہ آپ نے نہایت تحقیق و تجسس اور محنت و کاوش کے بعد تقریباً ہر خاندان سادات کے الگ الگ شجرہ ہائے نسب مرتب کئے جو سید محمد حسینی واسطی کے اس فارسی رسالہ سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے ۱۲۷۴ھ میں "تذکرہ الاقرباء و شجرۃ الاولیا" کے نام سے ترتیب دیا۔

سید ظفر الدین احمد سید شریف الدین احمد کے فرزند ہیں آپ کے اجداد مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ کے عہد میں گلاؤٹھی آکر آباد ہوئے۔ آپ گلاؤٹھی ہی میں یکم مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول بلند شہر سے کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور مسلم یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم ایس سی بی ٹی اور ایم ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ عملی زندگی کیلئے تدریس کے شعبہ کا انتخاب کیا اور چونتیس سال تک معلّمی کے مقدس پیشہ سے نہ صرف وابستہ رہے بلکہ اس مدت میں اہم تصانیف طبع کرائیں جو افغانستان اور ہندو پاکستان کی درسگاہوں میں طلباء و اساتذہ کے آج تک زیر مطالعہ ہیں۔ افغانستان کے قیام کے دوران جو ۱۹۴۱ء کے بعد کے دس برسوں پر محیط ہے آپ نے جغرافیہ کے موضوع پر فارسی زبان میں دو کتابیں تصنیف کیں ایک جغرافیہ پاکستان اور دوسری جغرافیہ ء اقتصادی دوسری کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے اس کے علاوہ پاکستان میں سندھ یونیورسٹی کے طلباء کیلئے جو کتب تصنیف کیں ان میں منافع الاعضاء اور اصول صحت شامل ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں آپ نے اپنی ایک تصنیف ہمارے نصاب میں اسلامیات (Islamiat in our curriculum) انگریزی زبان میں مرتب کی اس کے علاوہ آپ کی متعدد تحقیقی کتب کے مسودات اشاعت کے منتظر ہیں۔ جن میں دو ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل "النبی الامی ۱۳

جلدوں میں ہے اور چار جلدوں میں "القرآن الکریم" ہے جو تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ غرض آپ کی عمر عزیز کی اہم ترین مصروفیات تصنیف و تالیف ہی سے وابستہ ہیں اور آپ کے اس رجحان فکری کا پتہ دیتی ہیں جس کی بنیاد آپ کی دین اسلام سے والہانہ اور راسخ وابستگی پر ہے۔

سید اعجاز الدین احمد

گلاؤٹھی کے ایک ایسے ذی علم سادات گھرانے کے چشم و چراغ جس کے بزرگوں کو کئی پشتوں تک تواتر سے حافظ قرآن ہونے کا دینی اعزاز حاصل رہا ہے۔ روحانی فیوض و برکات کے حوالے سے شجرہ نسب میں ایسے بزرگوں کے اسمائے گرامی بھی نظر آتے ہیں جن سے عہد در عہد بندگان خدا کی ایک کثیر تعداد فیضیاب ہوئی۔
سید شہاب الدین کرمانی آپ ہی کے اجداد امجد میں سے تھے۔ جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے عہد میں کرمان سے تشریف لائے اور گلاؤٹھی کے مضافات میں گٹھاولی نام کی ایک بستی آباد کی۔ آپ کے دو بیٹے محمود شاہ اور تیفور شاہ تھے جو جید بزرگ اور ولی اللہ تھے۔ تیفور شاہ کا مزار گٹھاولی ہی میں ہے۔ ان کے صاحبزادے سید احمد کرمانی کا ذکر انگریزوں کے مرتب کردہ ضلع بلند شہر کے گزٹ میں بھی ملتا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ انہیں "مالا مل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا چنانچہ گلاؤٹھی کے قرب میں مالا گڑھ کی بستی جو ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ آزادی کا عظیم مرکز بن گئی تھی انہیں کے نام سے منسوب ہے۔

سید اعجاز الدین احمد جنہیں اپنے طالب علمی کے زمانے سے عہد ملازمت تک اپنی خداداد صلاحیتوں اور محنت و کاوش کے اعتراف میں متعدد قومی و بین الاقوامی اعزازات حاصل ہوئے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ جب آپ کے والد بزرگوار سید ظہور الدین ریاست بہاولپور چلے آئے تو سید اعجاز الدین احمد نے اپنے باقی تعلیمی مدارج بھی بہاولپور ہی میں طے کئے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں صادق ڈین ہائی سکول بہاولپور سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا' اور

صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ ۴۲-۱۹۴۱ء کے دوران مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایم اے انگریزی کے طالب علم رہے۔ جہاں آفتاب ہال میں آپ کا قیام تھا چنانچہ آپ کے ایک استاد پروفیسر غلام سرور نے جو انگلستان کی مشہور یونیورسٹی لیڈز کے فارغ التحصیل تھے اور انگلش ڈیپارٹمنٹ میں ریڈر کے منصب پر فائز تھے۔ اپنے ایک سرٹیفکیٹ میں سید اعجاز الدین احمد کو ان کی ذہانت اور قابلیت پر زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ لیکن مستقبل کو شاید یہ منظور تھا کہ وہ ایک ماہر معاشیات کی حیثیت سے شہرت حاصل کریں ہرچند کہ اہم شخصیتوں نے ان کے انگریزی زبان پر بھی عبور کو تسلیم کیا ہے۔ تقسیم ملک سے قبل ہی آپ نے حکومت ہند کے مرکزی سیکرٹریٹ دہلی میں ۱۹۴۳ء میں ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۷ء میں آپ پاکستان چلے آئے اور زیادہ تر وفاقی وزارت خزانہ سے مختلف حیثیتوں میں وابستہ رہے۔ اگست ۱۹۷۳ء میں جب بعارضہ قلب آپ کا انتقال ہوا اس وقت آپ حکومت پاکستان میں ڈپٹی اکنامک ایڈوائزر کے منصب پر فائز تھے آپ کی غیرمعمولی صلاحیتوں اور ایک ماہر معاشیات کی حیثیت سے حکومت پاکستان نے آپ کی کارکردگی کے اعتراف میں ۱۹۶۳ء میں تمغہ خدمت عطا کیا آپ نے متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی جن میں کامن ویلتھ اکنامک کانفرنس لندن (۱۹۵۲ء) دولت مشترکہ کانفرنس سڈنی (آسٹریلیا ۱۹۵۴ء) بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) تربیتی پروگرام (۵۵-۵۴ء) اور لندن میں دولت مشترکہ کے افسران کی کانفرنسیں منعقدہ لندن(۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جناب ممتاز حسن نے جو اس وقت حکومت پاکستان کے سیکرٹری خزانہ تھے۔ لندن سے ایک ڈسپیچ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء میں سید اعجاز الدین احمد کو اپنی جانب اور وزیر خزانہ سید امجد علی کی جانب سے ان کی بین الاقوامی سطح پر اعلیٰ کارکردگی کیلئے زبردست خراج تحسین پیش کیا اس طرح جب آپ ۱۹۵۵ء میں جارج واشنگٹن یونیورسٹی واشنگٹن میں زیر تعلیم تھے تو اقتصادیات کے شعبہ کے سربراہ پروفیسر ڈونلڈ واٹسن نے آپ کو بہترین طالب ہونے کی سند اعتراف عطا کی۔ دوران ملازمت ہی سید اعجاز الدین احمد کو بین الاقوامی شہرت

رکھنے والی شخصیتوں کے رفیق کار رہنے کے مواقع بھی ملے آپ نے جرمن سنٹرل بینک کے سابق صدر ڈاکٹر ولہیم (DR. WILHELM) کے ساتھ مل کر پاکستان کی معاشی، مالیاتی اور کرنسی سے متعلق پالیسیوں پر ایک نہایت اہم رپورٹ مرتب کی اس کے علاوہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک عالمی بینک کے ماہرین کے وفود کے ساتھ قومی اہمیت کے مختلف منصوبوں پر کام کیا آپ نے آخری بار ۱۹۷۰ء میں ہالینڈ میں ہیگ کے مقام پر منعقد ہونے والے ایک بین الاقوامی سیمینار میں بحیثیت ماہر معاشیات شرکت کی اور پاکستان کی موثر نمائندگی کی۔

سید اعجاز الدین احمد کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ ریٹائرمنٹ سے قبل ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تاہم حکومت پاکستان کے ریکارڈ میں ان کی مرتب کردہ کم و بیش نصف درجن مطبوعات آج بھی موجود ہیں جو ایک ماہر معاشیات کی حیثیت سے ان کے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں کی یادگار کہی جا سکتی ہیں ان کی ذہانت اور علم و حکمت کا یہ ورثہ خوش قسمتی سے ان کی اولاد میں منتقل ہوا چنانچہ ان کے چار بیٹوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے شعبہ میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے ان کے بڑے فرزند سید عبدالرحمان جو ۱۰ فروری ۱۹۴۶ء کو بہاولنگر میں پیدا ہوئے۔ ایک اعلیٰ پایہ کے کیمیکل انجینئر ہیں۔ انہوں نے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور سے بی ایس سی کرنے کے بعد انگلستان سے اسی شعبہ میں ماسٹرز کیا اور بیس سال تک آئل اینڈ گیس انڈسٹری کے شعبہ میں اہم حیثیتوں میں کام کر کے شہرت حاصل کی آپ نے جن اہم اداروں میں کام کیا ان میں کویت آئل کمپنی کے علاوہ اٹک آئل ریفائنری، پاکستان آئل فیلڈز، پاکستان ریفائنری اور ہنٹ انٹرنیشنل پٹرولیم کارپوریشن اور دیگر ادارے شامل ہیں۔

سید اعجاز الدین احمد کے دوسرے فرزند سید بلال احمد جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے پولیٹیکل سائنس اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لیں اور قائداعظم یونیورسٹی سے سٹرٹیجک سٹڈیز میں ایم ایس سی کیا پاکستان کی اعلیٰ ملازمتوں کے رکن ہیں اور پاکستان اکاؤنٹس گروپ کے ایک ممتاز افسر کی حیثیت سے مرکزی حکومت اور

خودمختار و نیم خودمختار اداروں کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہ چکے ہیں۔ آج کل وہ وزیراعظم معائنہ کمیشن کے رکن کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں اور قبل ازیں دارالحکومت کے ترقیاتی ادارہ کے ممبر ایڈمنسٹریشن اور واہ آرڈی نینس فیکٹری کے مشیر مالیات رہ چکے ہیں۔ سید بلال احمد اپنی فرض شناسی اور دیانت و صداقت کے اوصاف کے باعث حکومتی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ان کے ایک چھوٹے بھائی سید ہارون احمد میڈیکل ڈاکٹر اور دوسرے سید زبیر احمد انجینئر ہیں۔

سید محمد تنظیم واسطی

سید محمد تنظیم واسطی کو اللہ تعالیٰ نے عالمی سطح پر ملّتِ اسلامیہ کی عظیم اور گرانقدر خدمات انجام دینے کی جو توفیق اور سعادت عطا کی ہے وہ قابل رشک بھی ہے اور لائق تحسین بھی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

خدمت ملی کے جذبہ سے سرشار ان کے شب و روز دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بزرگوں کا فیضان بھی ہے کیونکہ سید محمد تنظیم واسطی کا گلاؤٹھی کے جس خانوادے سے تعلق ہے وہ اپنے اوصاف دینی اور اخلاق و اخلاص کیلئے خاص شہرت رکھتا ہے آپ کے والد سید محمد شمیم اپنی حب الوطنی، اقربا نوازی اور احترام دین کے پرخلوص جذبات کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ معاش کی ضرورتیں ہرچند انہیں گلاؤٹھی سے کھینچ کر جودھپور ریاست لے گئیں تھیں۔ لیکن وطن کے ساتھ ان کا رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا اور جودھپور میں اپنے کردار وعمل سے انہوں نے جو مقام و مرتبہ حاصل کیا وہ بھی اہل وطن کیلئے باعث فخر ہے۔ جودھپور حالانکہ ایک ہندو ریاست تھی جہاں کسی مسلمان کیلئے آگے بڑھنے کی راہیں تلاش کرنا بہت مشکل تھا لیکن سید محمد شمیم چیف منسٹر کے پرائیویٹ سیکرٹری سے آغاز ملازمت کر کے کمشنر کے اعلیٰ منصب

تک پہنچے جو ان کی بہترین صلاحیتوں کی روشن دلیل ہے۔

سید محمد تنظیم واسطی جودھپور ہی میں ۱۴ اگست ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت کے ابتدائی مدارج طے کئے اور باقی تعلیم پاکستان آنے کے بعد کراچی میں مکمل کی۔ ڈی جے سائنس کالج سے بی ایس سی کی ڈگری لی اور پھر کراچی یونیورسٹی سے عمرانیات (سوشیولوجی) میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۴ء میں لندن چلے گئے اور یہیں سے ان کی اس گرم رفتار زندگی کا آغاز ہوا جس نے انہیں بین الاقوامی شہرت عطا کی۔ برطانیہ پہنچتے ہی یو کے اسلامک مشن (U.K. Islamic Mission) سے وابستہ ہو گئے اور اسی سال تنظیم کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ یہ ایک نووارد کیلئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ کیونکہ یو کے اسلامک مشن برطانیہ کی سب سے بڑی اور منظم اسلامی تحریک ہے اور تنظیم واسطی گزشتہ تیس برسوں سے تنظیم کی اسی طرح روح رواں بنے ہوئے ہیں کہ سیکرٹری جنرل کے علاوہ وہ اس کے نائب صدر اور قائمقام صدر بھی رہے ہیں یہ مشن جو چالیس شاخوں پر مشتمل ہے تیس مساجد کے انتظام و انصرام کا ذمہ دار ہے جہاں ہر سال پانچ ہزار طلباء و طالبات زیور تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں۔ سید محمد تنظیم واسطی ایک اور اہم ادارے اسلامک کونسل آف یورپ سے بھی وابستہ ہیں اور اس کی ایگزیکٹو کمیٹی کے مسلسل رکن رہے ہیں اور ان تمام بڑی بڑی اسلامی کانفرنسوں' سیمیناروں اور کتب کی نمائشوں کے انعقاد میں سرگرم حصہ لیتے رہے ہیں جو کونسل کے زیراہتمام مختلف اوقات میں ترتیب دی گئیں آپ کونسل کے مندوب کی حیثیت سے ان تمام اہم اجتماعات میں شریک ہوئے جو برطانیہ' فرانس' سوئٹزرلینڈ' پاکستان' ترکی اور ملیشیا میں منعقد ہوئے یہی نہیں بلکہ گزشتہ بیس سال سے اسلامی ممالک کی عالمی تنظیم (O.I.C) کے سربراہان اور وزرائے خارجہ کے اجلاس میں شرکت کا اعزاز حاصل کرتے رہے ہیں غرضیکہ اللہ تعالی نے سید محمد تنظیم واسطی کو سعادت بخشی ہے کہ وہ برطانیہ میں مسلمانوں کی نمائندگی اور براعظم یورپ میں مسلمانوں کی ترقی و استحکام کیلئے مسلسل اور انتھک کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے ایک کتاب بھی مرتب کی ہے اور عالمی سطح کے زعماء سے ملاقاتیں کی ہیں جن میں سربراہان مملکت

و حکومت شامل ہیں۔

سید محمد تنظیم واسطی کی نمایاں کاوشوں میں یہ کارنامہ بھی شامل ہے کہ انہوں نے اپنے قریبی رفقاء کے ساتھ مل کر مسلم ایڈ یو کے (Muslim Aid U.K.) کے نام سے ایک فلاحی ادارہ کی بنیاد رکھی جس کے وہ ٹرسٹی ہیں اور وائس چیئرمین رہے ہیں اس ادارہ کے پلیٹ فارم سے دنیا کے تقریباً ستائیس ۲۷ ممالک میں مختلف منصوبوں پر ۲۶۵ ملین پاؤنڈ کی امداد سے مسلمانوں کی بہبود کے لئے کام کیا گیا ہے ان ممالک میں فلپائن سے لے کر بوسنیا چیچنیا اور افریقہ کے متعدد ممالک شامل ہیں ایک اور ادارہ جو مسلم کونسل آف برٹن (Muslim Council of Britian) کے نام سے ابھرا ہے اور تیزی سے شہرت حاصل کر رہا ہے۔ سید محمد تنظیم واسطی اس کی انتظامیہ کمیٹی کے رکن اور انٹرنیشنل آفیرز کمیٹی کے سربراہ ہیں۔ وہ مسلم سالیڈریٹی کمیٹی (Muslim Solidarity Committee) کے بھی سیکریٹری جنرل ہیں جو برطانیہ میں مسلمانوں کی سیاسی امداد و اعانت کیلئے مسلسل مصروف عمل ہے ان میں وہ کوششیں بھی شامل ہیں جو بھارت میں بابری مسجد کے سانحہ اور میرٹھ میں مسلمانوں کے قتل عام، مصر میں تحریک اسلامی سوڈان اور ایران میں اسلامی انقلاب، جہاد افغانستان، بوسنیا میں مسلمانوں کی جدوجہد اور البانیہ، ترکی، کشمیر نیز چیچنیا وغیرہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی امداد و حمایت سے متعلق ہیں۔ فرانس، برطانیہ، امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں جہاں مسلمانوں کو نسلی امتیاز کا شکار بنایا گیا ہے وہاں بھی یہ کمیٹی اپنا موثر کردار انجام دے رہی ہے۔

ایک بہت بڑا امتیاز و اعزاز جو سید تنظیم واسطی کو حاصل ہے وہ ان کے ہاتھوں ایجنسی افغان پریس کا قیام ہے جس کا ہیڈ آفس لندن میں واقع ہے اور وہ اس کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں اس طرح جہاد افغانستان میں مجاہدین کے سرفروشانہ کردار کو دنیا بھر میں اجاگر کرنے کا موثر ذریعہ قائم ہوا اور جہاد افغانستان میں ایک اہم کردار ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایجنسی افغان پریس نے جو کام کیا اسے تمام اسلامی دنیا میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سلسلہ میں سید تنظیم واسطی نے دنیا کے بیشتر

ممالک کے سفر کئے اور جہاد افغانستان کو تقویت پہنچانے کیلئے اہم عالمی شخصیات سے ملاقاتیں کیں، خدا انہیں نظر بد سے بچائے اور توفیق دے کہ وہ امت مسلمہ کی خدمت کے مشن کو اور بھی طاقت و توانائی کے ساتھ جاری و ساری رکھیں۔ (آمین)

عثمان غنی راشد

حکومت سندھ کے سابق اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صوبہ سندھ سے نائب صدر اور کراچی بار کی ایک معروف و مقبول شخصیت عثمان غنی راشد حافظ عبدالغنی کے ذہین و زیرک اور حلیم و بردبار فرزند رشید ہیں۔ اس نسبت سے آپ کا تعلق سینشر کے ایک ممتاز و محترم گھرانے سے ہے جس کی روایات میں دینی اقدار اور کردار و عمل کے اوصاف سرفہرست نظر آتے ہیں جبکہ ننھیالی تعلق آپ کی گلاؤٹھی سے نسبت اور حافظ شفیع الدین جیسی صاحب بصیرت شخصیت کا نواسہ ہونا بھی آپ کے لئے باعث اعزاز ہے۔

عثمان غنی راشد کی ذات و صفات کا مطالعہ و مشاہدہ بتاتا ہے کہ قدرت نے انہیں باپ اور ماں دونوں سلسلوں سے دل و دماغ کی صلاحیتیں اور کردار و عمل کے اوصاف ورثہ میں عطا کئے ہیں ان کے والد ایک نیک دل، نیک سیرت اور نجابت و شرافت سے متصف پاکیزہ انسان تھے۔ قدرت نے ان کے لئے معاش کا انتظام ریاست بہاولپور میں کیا تھا چنانچہ مدۃ العمر تک یہیں رہے اور ایک حافظ قرآن کی حیثیت سے کلام اللہ کے امین کے طور پر بہاولپور کے سادہ اور دینی معاشرہ میں واجب التعظیم گردانے گئے دیانت و صداقت اور اخلاص و مروت کے اوصاف نے ان کی شخصیت کو اور بھی پسندیدہ و دلپذیر بنا دیا تھا ظاہر ہے کہ ان کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھنے والے عثمان غنی راشد نے بھی اپنے والد کے ورثہ سے خوشہ چینی کی اور اپنی زندگی کو پسندیدہ اوصاف سے سجا لیا والدہ کی گود نے خودی و خود آگاہی کے محاسن سے نوازا اور اس طرح ان کی زندگی مختلف اوصاف حمیدہ کا خوبصورت امتزاج بن گئی۔

تعلیم و تربیت کیلئے بہاولپور اور کراچی کا ماحول میسر آیا جس نے روایت کے احترام اور جدت کی ناگزیریت کو ان کی زندگی کا رہنما اصول بنا دیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر جب بار کا رخ کیا تو قانون و عدالت کی اس اجنبی دنیا میں عثمان غنی راشد کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن گذرتے ہوئے وقت نے تیزی سے ثابت کر دیا کہ امتیاز و افتخار اس میدان میں ان کے منتظر ہیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ ایک قابل وکیل شمار کئے جانے لگے اور یہاں تک ہوا کہ صوبے میں اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کے منصب کیلئے حکومت سندھ کی نگاہ انتخاب نوجوان عثمان غنی راشد پڑی جو ان کی قانونی مہارت اور پیشہ ورانہ ذہانت و ذکاوت کا برملا اعتراف تھا یہی نہیں بلکہ بار کے پلیٹ فارم سے اپنی قابل توجہ سرگرمیوں کے باعث انہوں نے خود کو ملک کے دوسرے حصوں میں بھی متعارف کرا لیا جس کے نتیجہ میں سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی نائب صدارت کا تازہ ترین اعزاز ان کی کلاہ عزیمت میں ایک سرخاب کے پر کا درجہ رکھتا ہے۔

اپنے بزرگوں کی طرح عثمان غنی راشد محبت و مروت کے شعائر پر کاربند ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ عزیز و اقارب میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ادارہ اخوان السادات گلاؤٹھی کے صدر کی حیثیت سے ان کا انتخاب ان کے انہیں اوصاف کیلئے خراج تحسین کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے حوصلہ و ہمت کے پیش نظر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید کامرانیوں سے نوازے گا۔

سید محمد تسلیم واسطی

بین الاقوامی سطح کے پٹرولیم جیولوجسٹ اور عالمی شہرت یافتہ تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل سید محمد تسلیم واسطی کو گلاؤٹھی کی ایک پسندیدہ و محترم شخصیت سید محمد شمیم واسطی کی فرزندی کا شرف حاصل ہے وہ ننھیال کے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ سے بھی پوری طرح مالا مال ہیں اور اپنے بڑے بھائی سید محمد تنظیم واسطی کی طرح انسانی خدمت اور دینی وابستگی کے جذبہ سے سرشار ہیں کراچی یونیورسٹی کی طالب علمی کے

ور میں اسلامک سٹڈی سرکل کا چیئرمین منتخب ہونا ان کی خاندان سے ملی ہوئی دینی روایت کا روشن ثبوت ہے اور کینیڈا کے قیام کے دوران غرباء کیلئے مالی امداد و اعانت فراہم کرنے کیلئے چوبیس میل مسلسل پیدل سفر ان کی انسانیت دوستی پر دلالت کرتا ہے۔

جب پاکستان بنا اور ان کے والد سید محمد شمیم واسطی ریاست جودھپور سے جہاں وہ ریاستی ایڈمنسٹریشن میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے کراچی آئے تو اس وقت تسلیم واسطی کی عمر صرف تین سال تھی اس لئے ان کی تعلیم و تربیت کا ابتدائی دور کراچی کا مرہون منت ہے جہانگیر روڈ کے سنٹرل گورنمنٹ سیکنڈری سکول سے ۱۹۵۷ء میں میٹرک پاس کیا بعدازاں کراچی یونیورسٹی سے بی ایس سی (آنرز) اور جیالوجی میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور وہیں یونیورسٹی کے جیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ لیکچرر ہو گئے یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہیں معلمی کا اعزاز حاصل ہو جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ جامعہ کے ایک ذہین باصلاحیت اور ہونہار طالب علم تھے انہیں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء کی مدت کے دوران نظامت تعلیم اور رئیس الجامعہ کی طرف سے میرٹ سکالرشپ مل چکے تھے اور میرٹ سکالرشپ کا یہ اعزاز انہیں اس وقت بھی حاصل ہوا جب مشرقی، مغربی پاکستان سے واحد منتخب طالب علم کی حیثیت سے انہیں ائل آئل کمپنی کے میرٹ سکالرشپ پر ۶۸۔۱۹۶۵ء کے دوران اعلیٰ تعلیم کیلئے امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن (انگلینڈ) بھیجا گیا جہاں انہوں نے یونیورسٹی آف لندن سے ۱۹۶۸ء میں آئل ٹیکنالوجی میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ سید محمد تسلیم واسطی ۱۹۶۸ء ہی میں انگلینڈ سے کینیڈا منتقل ہو گئے اور ۷۵۔۱۹۷۴ء کے دوران پاکستان کینیڈا ایسوسی ایشن کے صدر رہے اور اس طرح وطن عزیز کی خدمت کو بھی بیک وقت جاری رکھا۔ کینیڈا کے قیام کے دوران آپ نے بزنس مینجمنٹ میں بھی ایک تربیتی کورس کیا اس کے علاوہ کنیڈا میں آباد پاکستان کمیونٹی کے لئے فلاحی کاموں میں مسلسل مصروف رہے جن میں مساجد کا انتظام و انصرام اور ہنگامی حالات میں پاکستان کے لئے فنڈز اکٹھا کرنے کی مصروفیات شامل تھیں۔

سید محمد تسلیم واسطی نے ملک میں اور بیرون ملک ایک جیالوجسٹ کی حیثیت سے اہم پیشہ ورانہ خدمات انجام دیں ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں کینیڈا میں گیس اور تیل کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے انہوں نے ۹۵۔۱۹۸۷ء کے دوران اپنی انکارپوریٹیڈ کمپنی امانۃ انٹرنیشنل لمیٹڈ کیلئے ایک انٹرنیشنل ایکسپلوریشن کنسلٹنٹ کے طور پر بھی کام کیا۔ آج کل پاکستان آئل فیلڈز لمیٹڈ سے بحیثیت اسسٹنٹ جنرل مینجر وابستہ ہیں پاکستان کی پچاس سالہ تقریبات کے سلسلہ میں اسلام آباد میں ۱۹۹۷ء میں عالمی سطح کا سیمینار منعقد ہوا تھا اس میں سید محمد تسلیم واسطی نے پاکستان میں تیل اور گیس کے امکانات کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ پڑھا جسے ماہرین میں بے حد سراہا گیا۔ انہوں نے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کرکے جو تجربہ و مشاہدہ کی دولت حاصل کی ہے وہ ان کا قیمتی اثاثہ ہے ان ممالک میں شمالی و جنوبی امریکہ کی ریاستیں، یورپ، مشرق بعید، چین اور آسٹریلیا کے ممالک شامل ہیں۔

اختر بیگانہ

اختر بیگانہ گلاؤٹھی کی بیٹی نہ سہی لیکن بہو تو ہیں اور اس حیثیت میں انہیں گلاؤٹھی کے جس خاندان سے نسبت حاصل ہے وہ ان کے لئے باعث اعزاز بھی ہے اور یہ جواز بھی مہیا کرتا ہے کہ ان کی شخصیت کے اوصاف کا اعتراف کیا جائے اختر بیگانہ تو وہ بعد میں بنیں جب فکر و فن نے انہیں گمنامی کی سطح سے بلند کیا البتہ ان کا اصل نام اختر سلطانہ ہے اور وہ گلاؤٹھی کی ایک جید و مقتدر شخصیت منشی مہربان علی کی نواسی ریاض فاطمہ کے فرزند سید ساجد علی آصف سے بیاہی گئیں اور اس طرح گلاؤٹھی سے ان کی نسبت معلوم و معتبر ٹھہری۔

اختر بیگانہ متحدہ ہندوستان کے شہر الہ آباد کے موضع کرئی میں پیدا ہوئیں والد مرحوم ڈاکٹر اعظم کریوی کا شمار پاک و ہند کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے مختصر

افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی دیہاتی زندگی کی عکاسی کے سلسلہ میں منشی پریم چند کے بعد اعظم کریوی کا نام سر فہرست ہے اختر بیگانہ کی والدہ بھی ادیبہ اور شاعرہ تھیں اسی ادبی ماحول میں پروان چڑھیں بھائی ڈاکٹر سلیم اعظم اخبار اعظم کے ایڈیٹر اور ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب جبکہ بہن ناہید اعظم ریڈیو ڈراموں اور اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔

اختر بیگانہ نے تعلیم کا آغاز گورنمنٹ گرلز نارمل سکول میرٹھ سے کیا اور خورشید گرلز کالج کراچی سے تعلیم مکمل کی آٹھویں جماعت ہی سے شاعری اور افسانہ نگاری کا شوق بیدار ہوا جو کچھ لکھا سکول میگزین میں بھی شائع ہوا نثر میں اپنے والد سے اصلاح لیتی تھیں اور شاعری میں حضرت سوز شاہجہانپوری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ کے افسانے اخبار جہاں، عکس نو، حریم انڈیا، حنا، کرن، خواتین، پاکیزہ اور سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہوتے رہے ہیں ریڈیو اور خواتین مشاعروں میں شرکت کرتی رہی ہیں۔ ''زندگی کی راہ میں'' ان کا پہلا افسانوں کا مجموعہ ہے ان کے افسانے فرضی اور من گھڑت نہیں ہوتے بلکہ زیادہ تر سچی کہانیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔

اختر بیگانہ کی زندگی کی اہم مصروفیات ان کے سماجی بہبود کے کام ہیں جنہیں وہ عبادت سمجھ کر سرانجام دیتی ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق دی کہ وہ بہت سی نادار بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کا ذریعہ بنیں اور ضرورت مندوں کے لئے ہمیشہ پوری دردمندی کے ساتھ مصروف عمل رہیں۔

مصنف کا شجرۂ نسب

سید منصور عالم عاقل (برادران ـ سید رحیم اللہ قابل ' سید شجاعت اللہ '
سید منظور عالم عادل ' ہمشیرگان ـ سیدہ شاہجہانی بیگم سیدہ شاہزمانی بیگم ' سیدہ تنظیم فاطمہ)
بن قاضی سید حبیب اللہ (برادران قاضی سید سمیع اللہ ' قاضی سید امانت اللہ) بن
قاضی سید امین اللہ (برادران نوراللہ ' نصرت اللہ یا قدرت اللہ ' فضل اللہ یا فیض اللہ)
بن عنایت اللہ بن فیض اللہ (برادران عظمت اللہ یاداللہ) بن شکراللہ بن عطاء اللہ بن
فتح محمد بن وارث بن وہاب بن ناصر علی ' بن مظہر علی یا مظفر علی بن سید تمن
بن محمد رفیع (بڈھن) بن غلام مصطفیٰ بن نصیرالدین (برادران سید عمر ' کمال الدین اور
جمال الدین جن کی اولاد عبداللہ ان کے بیٹے حسام الدین ان کے بیٹے سید تبارک یا
مبارک جو بابر بادشاہ کے زمانے میں گلاوٹھی میں آباد ہوئے ان کے بیٹے سید اکبر ان
کے بیٹے سید مداری جن کے نام اکبر بادشاہ نے فرمان جاری کیا) بن سید احمد زیدی
واسطی بن علاء الدین بن شمس الدین بن تاج الدین بن حسین یا فرید الدین بن
ادریس یا اویس بن فرید الدین یا زید بن علاؤ الدین (فضائل ' فاضل ' داؤد یہ بھائی
بہلول لودھی کے زمانے میں تھے ہتنا پور اور گڑھ میکشر کو فتح کیا اور دو آبے میں
آباد ہو گئے) بن سید عرض یا معزالدین بن ابو الفرح ثانی (ان کی زوجہ سلطان محمود
غزنوی کی بہن تھیں) بن ابوا لفراس (برادران ابو الفاضل ابوالفضل ' معزالدین ' سید
داؤد) بن سید ابو الفرح واسطی (غزنہ میں آباد ہوئے) بن سید داؤد بن سید حسین
واسطی(واسط میں آباد ہوئے) بن یحییٰ بزرگ بن سید زید بن عمر بزرگ بن زید بزرگ
بن سید علی عراقی بن سید حسین بن علی بزرگ بن سید محمد بن عیسیٰ (کوفہ میں خروج کیا
برادران حسین ' یحییٰ ' محمد اور کبیر محمد جنہوں نے خراسان میں خروج کیا) بن زید الشہید
بن علی اوسط زین العابدین بن حضرت امام حسینؓ بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ

ضمیمہ

تذکرۃ الاقربا و شجرۃ الاولیاء

فارسی تالیف

سید محمد حسینی واسطی

اردو ترجمہ

سید محبوب حسن واسطی

عنوانات

اردو ترجمہ تذکرۃ الاقرباء و شجرۃ الاولیاء

عرض مترجم

الحمدلله رب العالمین و العاقبته للمتقین و الصلوٰة و السلام علی سید المرسلین محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔ اما بعد!
سید محمد حسینی واسطی ساکن گلاؤٹھی (م۔ ۱۲۸۸ھ تقریباً) نے اپنا فارسی رسالہ "تذکرۃ الاقرباء و شجرۃ الاولیاء" ۱۲۷۴ھ میں مکمل کیا جیسا وہ خود فرماتے ہیں۔

تھے یک ہزار و دو صد و ہفتاد و چار سال
لکھا جو میں نے شجرۂ علیا بشاعری

اس فارسی قلمی نسخہ کے جس مسودہ تک اس عاجز کی رسائی ہوئی (رسالہ کے دیگر قلمی نسخے مجھے دستیاب نہیں ہوئے) پہلی بار ۱۳۱۴ھ/نومبر ۱۸۹۶ء میں محمد نقی ساکن گلاؤٹھی نے خط شکستہ میں اس کی کتابت کی۔ پھر ۱۳۵۷ھ/نومبر ۱۹۳۸ء میں اعجاز احمد خوشنویس نے بہتر اور صاف ستھرے خط نستعلیق میں اس کی کتابت کا کام انجام دیا جسکا اردو ترجمہ حسب فرمائش برادرم سید منصور عاقل ۱۴۱۷ھ/نومبر ۱۹۹۶ء میں اس ناچیز ہیچمداں نے مکمل کیا جو پیش خدمت ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ مذکورہ تینوں کاوشیں ماہ نومبر میں تکمیل کو پہنچیں۔

حضرت مولف (سید محمد حسینی واسطی) کے پردادا سید محمد بقاء، محمد شاہ (بادشاہ) کے یہاں فوجی خدمات پر مامور تھے اور یہ شاہی اعزاز و اکرام اس خاندان میں کوئی نئی چیز نہ تھی اس لئے کہ سید محمد بقاء کے دادا سید محمد امین کو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی طرف سے پلول کی خدمت سپرد تھی اور اسی لئے ان کی اولاد "پلولیان" کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت مولف کے دادا سید خدا بخش قادری پر البتہ تصوف کا رنگ غالب تھا۔ وہ بڑے عابد و تہجد گزار تھے۔ حضرت شیخ مجیب اللہ شاہ قادری ساکن پھلواری سے بیعت تھے اور مراقبہ و مجاہدہ میں مشغول رہتے۔ کمال کے خوشنویس اور تیر انداز تھے۔ نوے سال کی عمر پاکر ۱۲۴۴ھ میں انتقال کیا۔ ان کے پوتے نے ان کی تاریخ اس طرح کہی۔

بتاریخ او گفت ہاتف یکا
بہشت بریں باد آرام گاہ
(۱۲۴۴ھ)

حضرت مولف کے والد سید علی بخش ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو فن خوشنویسی گویا ورثہ میں ملی۔ محنت و دلجمعی سے انہوں نے اس میں کمال پیدا کیا جو آگے چل کر ان کی دنیاوی ترقی کا بھی زینہ بنا کہ اسی کی بدولت وہ اولاً نواب شوکت جنگ بہادر کے یہاں عہدۂ خوشنویسی پر مامور ہوئے اور پھر انہیں رئیس فرخ آباد نواب تفضل حسین خان کے یہاں اعزازت ملے۔ وہ خود اپنے ایک شعر میں اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

دانی کہ خوشنویسی ما یاں زبہر چیست
مائیم واسطی و قلم نیز واسطے ست

وہ فارسی کے بھی بڑے عالم تھے۔ عربی گھوڑوں اور ہندی و حجازی تلواروں کی شناخت کا بھی بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ آخر الذکر دو شعبوں میں آپ کے دو رسالے "گلدستہ فراست" اور "رسالہ شمشیر" اہم تالیفات کا درجہ رکھتے ہیں۔ شیعہ حکمرانوں کے ساتھ طویل عرصہ رہنے کے باعث آپ کا شیعیت کی طرف شدید رجحان ہوگیا تھا اور آپ نے اسی لئے ائمہ اثنا عشری شان میں مدحیہ اشعار کے کئی مجموعے بھی مرتب کئے۔

سید محمد حسینی واسطی جن کی "تذکرۃ الاقرباء و شجرۃ الاولیاء" سادات گلاوٹھی کے انساب معلوم کرنے کا غالباً سب سے زیادہ معتبر ذریعہ ہے۔ فارسی و عربی کے ممتاز عالم، صاحب طرز نثر نگار اور ایک باکمال شاعر تھے۔ آپ ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں اپنے دادا سید خدا بخش قادری سے پڑھیں۔ پھر والد بزرگوار سے فارسی کتابیں سکندر نامہ اور ظہوری وغیرہ پڑھیں۔ عربی علوم کی تحصیل مولوی بدل خان صاحب اور مولوی عبدالحق گوپاموی سے کی۔ پھر ۱۲۴۰ھ میں کتب

حدیث کی تعلیم کیلئے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسے اور جانشین شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کے پاس شاہجہاں آباد چلے گئے جہاں تین سال رہے اور سند حاصل کی۔ پھر روزگار کے سلسلے میں پہلے بریلی اور پھر فرخ آباد گئے اور نواب تجمل حسین خاں کے ہاں خطوط نویسی کیلئے مقرر ہوئے۔

تصنیف و تالیف کا ابتداء سے شوق تھا چنانچہ چند رسالے اور مثنویاں لکھیں اس سلسلہ میں (۱) جامع القوانین (قواعد فارسی) (۲) ایجاز القوانی (قافیہ نظم) (۳) مثنوی عشق انگیز (۴) مثنوی عشق آمیز (۵) حل الحساب (ترجمہ خلاصۃ الحساب) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاعری میں آپ کو میر غلام حسین مفتون سے تلمذ حاصل تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں: "میر غلام حسین متخلص .بمفتون کہ در تحقیق کتب فارسیہ و شعر گوئی و نثر نویسی نظیر خود نداشت۔ فقیر ہم از ایشاں تلمذ دارد"۔ مرثیہ نگاری' مدحیہ شاعری اور تاریخ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اس کا کچھ اندازہ ان کے ان اشعار سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے اپنے دادا یا اپنے محسن نواب تجمل حسین خاں بہادر (۱۲ + ۵۵ اشعار) کے انتقال پر یا اپنے والد و دیگر اشخاص کے کمالات بیانات کرتے ہوئے یا شجرۂ نظم (۴۴ اشعار) کے سلسلے میں کہے ہیں۔

ان کی تاریخ گوئی کا ایک انتہائی دلچسپ واقعہ خود ان کا اپنی زندگی ہی میں اپنی تاریخ وفات کہنا ہے۔ اس حدیث نبویؐ کے پیش نظر کہ میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہوں گی انہوں نے فرض کر لیا کہ ان کی عمر تقریباً ۶۵ سال ہوگی اور اس طرح لفظ "محمد بخش مرحوم" (۱۳۸۸ھ) سے اپنی تاریخ وفات نکال ڈالی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

چو سال رحلتم گر دید معلوم
دلم گفتا محمد بخش مرحوم

مذہب و مسلک کے سلسلے میں ہمیں سید محمد حسینی واسطی کے یہاں انتشار فکر

ملتا ہے۔ وہ اپنا تعلق اہل سنت و الجماعت سے بتاتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

"مخفی مباد که مذہب فقیر سنت جماعت ست:
متبع حدیث و در مسئله که دراں حدیث یافته نشود
مقلد امام اعظم ابوحنیفه کوفی ست"

لیکن ان کا اہل سنت و الجماعت سے ہونے کا تصور جمہور اہل سنت کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ایسے اہل سنت ہونے کے مدعی ہیں جو اہل حدیث (غیرمقلد) بھی ہو اور حنفی (مقلد) بھی۔ جہاں حدیث نظر آ جائے خواہ وہ حدیث اصول نقد حدیث کے اعتبار سے کمزور یا من گھڑت (موضوع) ہی ہو (جیسے فضائل خاندان نبوت کے سلسلے میں ان کی حدیث نمبر۲) وہ اس کا اتباع کرتے ہیں اور جب حدیث نہ ملے تو وہ حنفی(مقلد امام اعظم ابوحنیفہ کوفی) بن جاتے ہیں۔

پھر وہ تصوف کی طرف اپنا شدید رجحان ظاہر کرتے ہیں اور سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہونے کے متمنی ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"و (فقیر) بصدق دل اراده دارد که کدام صاحب باطن
پیدا آید تا دست بدست او داده داخل سلسله بهشتیه
چشتیه شوم۔ اللهم حصل آمالی و حسن اعمالی"

مگر تلاش بسیار کے بعد بھی انہیں کوئی ایسا صاحب باطن نہیں ملتا جس سے وہ کسب فیض کر سکیں۔

ایک طرف وہ اہل سنت کے امام و محدث کبیر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسے اور جانشین حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ سے شرف تلمذ پر فخر کرتے ہیں اور فخریہ انداز میں ان کے پاس تین سال رہنے اور ان سے سند حدیث لینے کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

"در آنجا به سن یک ہزار و دو صد و چہل ہجریه
(۱۲۴۰ھ) رسیده مستفید خدمت فیضدرجت

المشتہر فی الافاق مولنٰا محمد اسحٰق محدث
گردیدہ بسماعت و قرات کتب احادیث اشتغال
نمودہ-- اسناد نمود-- بعد مرور ۳ سال بوطن خود
عود نمودہ"

اور اپنے اس رسالہ میں متعدد جگہ اہل سنت و الجماعت کی کتب احادیث بخاری و ترمذی وغیرہ سے احادیث نقل کرتے ہیں تو دوسری طرف حسب موقعہ وہ شیعی افکار کے مبلغ و ترجمان بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اپنے والد کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

"و آنجناب را بسبب الفت و محبت ائمۂ معصومین
کہ باعث نجات مسلمین است میل طبیعت باشعار
مدحیہ ائمۂ کبار بدرجہ اقصیٰ است"

وہ ائمہ اثنا عشر کو معصوم اور گناہوں سے بالکل پاک کہتے ہیں۔ جبکہ جمہور اہل سنت کے نزدیک انسانی مخلوق میں صرف انبیاء و رسل ہی معصوم ہوتے ہیں۔ کوئی غیرنبی و غیر رسول معصوم و طاہر نہیں ہوتا۔ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کیلئے "ام ائمہ الطاہرین" اور حضرت امام زین العابدینؒ کے لئے "آدم ائمہ الطاہرین" اور "امام چہارم" کے الفاظ استعمال کئے ہیں جو عقیدۂ اہل سنت کے خلاف ہیں اور ان کے شیعہ ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ انہوں نے صحیح اور من گھڑت احادیث کو خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ انتشار فکر ان کے یہاں غالبًا ان کے دادا اور والد کے درمیان افکار کے فرق اور معاشی و دینی فکر کے مختلف تقاضوں کے باعث آیا ہے۔

سید ابو الفرح واسطی جو واسطی خاندان کی مرکزی شخصیت ہیں' ان کے بارے میں حضرت مولف نے تین مختلف آراء بیان کی ہیں : (ا) سید عبدالجلیل بلگرامی کے خیال میں ان کے چار فرزند تھے۔ ان کے بیٹے سید معزالدین کچھ دن اپنے والد کے ساتھ ہندوستان میں قیام کے بعد واپس واسط چلے گئے جبکہ ان کے بقیہ تین بیٹے سید ابوالفراس' سید ابوالفضائل اور سید داؤد ہندوستان میں رہ گئے جن سے واسطی خاندان

پھیلا۔ (۲) بارہہ کے بعض دانشوروں کے نزدیک سید ابوالفرح واسطی کے پانچ فرزند تھے۔ کچھ دن ہندوستان قیام کے بعد ان کے دو بیٹے ان کے ساتھ واپس واسط چلے گئے جبکہ ان کے تین بیٹوں سید داؤد' سید فاضل اور سید فضائل جو ہندوستان میں رہ گئے واسطی خاندان یہاں ان سے چلا۔ (۳) تیسرا قول اس سلسلہ میں سید محمد حسینی واسطی کا اپنا ہے جس کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ان کے پاس اس کا دستاویزی ثبوت موجود ہے۔

"و پیش فقیر مولف اوراق روایت ثقات ثابت و متحقق است"

کہ حضرت ابو الفرح واسطی' سلطان محمود غزنوی کے دور میں بغرض جہاد ہندوستان تشریف لائے۔ جہاد میں کامیابی کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ موضع دہامری میں قیام فرمایا پھر واپس واسط چلے گئے جہاں انہوں نے انتقال فرمایا اور وہیں ان کا مدفن ہے۔ ان کے چار بیٹے سید داؤد' سید فضل' سید فضائل اور سید عوض ہندوستان میں مختلف جگہ آباد ہوئے اور ان سے یہاں واسطی خاندان چلا۔ انہوں نے عبدالجلیل بلگرامی پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے فرزندگان سید ابوالفرح واسطی میں سید عوض کا نام شامل نہیں کیا حالانکہ ان کا نام تو ہندوستان میں زبان زد خاص و عام ہے۔ یہاں تک کہ بادفروشوں اور بھاٹوں تک کی زبان پر ہے :۔

"عجب است از سید عبدالجلیل بلگرامی که تعداد
ابنائی سید ابوالفرح واسطی نام سید عوض ننگاشته
بود۔ چهار فرزند ایشاں در ہندوستان آنقدر مشهور و
صحیح است که باد فروشاں ہم مید انند و می گویند۔
تہن پوری یکی آبی چهار ترودی کلوار
جهجیری جگمگ رہی سرسن کوندنی وار"

آخر میں پیش نظر قلمی نسخہ کی کتابت کے بارے میں کہ اعجاز احمد خوشنویس کہیں کہیں عبارت کو سمجھ نہیں پائے ہیں اور یہ بالکل فطری اور قابل فہم ہے کیونکہ

انہوں نے انتہائی بے ربط خط شکستہ سے یہ قلمی نسخہ صاف ستھرے خط نستعلیق میں منتقل کیا ہے اور ان کی یہ کاوش لائق صد تحسین ہے کہ رسالہ کی مکمل کتابت سے پہلے ہمت نہ ہاری۔ چنانچہ نہ سمجھنے کے باعث انہوں نے بعض جگہ عبارت چھوڑ دی ہے مثلاً نمبر ۱۵ کے بزرگ زید سوم کا نثر عبارت میں ذکر نہیں ہے جبکہ منظوم شجرہ میں یہ ذکر موجود ہے۔ اسی طرح منظوم شجرہ کے شعر نمبر ۴۴ کا پہلا مصرعہ انہوں نے پورا کتابت نہیں کیا ہے۔ بعض جگہ غلط کتابت کر دی ہے اور اس قلمی نسخہ میں ایسی متعدد مثالیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مثال وہ مرثیہ ہے جو حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؓ کے وصال پر کہا۔

مجموعی طور پر سید محمد حسینی واسطی کی یہ علمی و تحقیقی کاوش گلاؤٹھی اور اس کے اطراف کے انساب معلوم کرنے کا انتہائی معتبر ذریعہ اور قابل قدر تاریخی معلومات کا خزانہ ہے۔

اپنے اردو ترجمہ کے متعلق یہ عاجز صرف اتنا عرض کرے گا کہ یہ ترجمہ باللفظ نہیں بلکہ اکثر مواقع کے اعتبار سے ترجمہ بالمعنی ہے کہ ترجمہ کرنے کے دوران مقصد عموماً تشریح مطالب و توضیح معانی رہا اور اگر کسی صاحب کو اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو براہ کرم مترجم کو ضرور مطلع فرمائیں۔ ممنون ہوں گا۔

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ

۶ نومبر ۱۹۹۶ء — سید محبوب حسن واسطی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی خص الانسان بانواع الفضائل و جعلہٗ شعوبا و قبائل و الصلوٰۃ علی رسولہ الذی لا ینقطع نسبہ و سببہ الیٰ یوم الدین و علیٰ الہ و اھل بیتہ الذی محبتھم فرض علی المومنین
(تمام تعریفیں اس اللہ پاک کیلئے ہیں جس نے انسان کو مختلف فضیلتوں کے ساتھ خصوصیت عطا فرمائی اور مختلف اقوام و قبائل میں تقسیم فرمایا اور درود ہو اس کے اس رسول پاک ﷺ پر جن کا نسب و سبب قیامت تک منقطع نہ ہوگا اور آپ کی آل اولاد اور اہل بیت پر جن کی محبت مومنوں پر فرض ہے)

سبب تالیف رسالہ

حمد و صلوٰۃ کے بعد۔ یہ امر مخفی اور پوشیدہ نہ رہے کہ بموجب فرمان واجب الاعتبار تعلموا من انسابکم لتصلوا ارحامکم (اپنے نسب سیکھو تاکہ اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی کرسکو) قدرت و طاقت والے اللہ کا سب سے کمزور بندہ شید محمد حسینی واسطی' ساکن گلاؤٹھی جو فلک امامت کے مہر درخشاں اور آسمان ولایت کے آفتاب تاباں یعنی حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اللہ الغالب سے اپنا انتساب رکھتا ہے۔ ان اوراق میں اس نسب نامہ کی تفصیل بھی عرض کریگا اور اپنے دوسرے جدی برادران کا حال بھی رقم کریگا تاکہ وہ میری یادگار اور آئندہ آنیوالوں کیلئے ذکر و سند رہے۔ اس رسالہ کا نام "تذکرۃ الاقرباء و شجرۃ الاولیاء" ہے اور یہ ۱۲۷۴ھ میں اختتام پذیر ہوا۔

فضائل خاندان نبوت

خاندان نبوت و امامت کے ساتھ انتساب ایک عظیم نعمت ہے۔ جسے خدا نے

یہ دی دی اور جسے یہ پہنچی پہنچی۔ بیان نسب میں جھوٹی شرکت نہیں ڈھونڈتے اور سچی بات کے علاوہ کچھ نہیں کہتے کہ یہ دنیا میں باعث شرم اور آخرت میں بڑا گناہ ہے چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

من انتسب الی غیر ابیه او تولّی غیر موالیه فعلیه
لعنة الله و الملائکة و الناس اجمعین
(جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے سے اپنا نسب ملایا یا
غیر موالی کی طرف نسبت موالات کی تو اس پر اللہ کی لعنت ہو،
فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو)۔

اور اس رسالہ کی ابتداء اور اس مقالہ کے شروع میں چند احادیث ذکر کی جاتی ہیں۔ جو حضرت سید البشر، خیر الانام علیہ الصلوۃ و السلام کے خاندان مکرمت نشاں کے فضائل و علو مرتبت جناب امامت و ولایت مآب حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کے نسب کی جلالت، عظمت اور بنت رسول حضرت فاطمہ الزہراء البتول اور امام المجاہدین حضرت حسنؑ و حسینؑ کے مکارم سنیہ کے بارے میں ہیں اور یہ متعدد احادیث میں سے صرف چند اور بیشمار روایات میں سے صرف تھوڑی سی ہیں:۔

حدیث نمبر۱ ان اللہ اصطفی من ولد ابراہیم اسمٰعیل و اصطفی من ولد اسمٰعیل بنی کنانه و اصطفی من کنانه قریش و اصطفی من قریش بنی ہاشم و اصطفانی من بنی ہاشم
(فرمایا رسول اللہؐ نے بلاشبہ اللہ پاک نے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے حضرت اسمٰعیلؑ کو منتخب و برگزیدہ بنایا اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے بنو کنانہ کو منتخب و برگزیدہ بنایا اور کنانہ میں سے قریش کو برگزیدہ بنایا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو منتخب کیا اور مجھے بنو ہاشم میں سے منتخب و برگزیدہ کیا۔ (ترمذی شریف)

حدیث نمبر۲

خلقت انا و علی من نور واحد فسبح اللہ علی متن العرش من قبل ان یخلق ابونا آدم با لفی الف عام فلما خلق آدم صرنا فی صلبہ ثم نقلنا من کرام الاصلاب الی مطہرات الارحام حتی صرنا فی صلب عبدالمطلب ثم انقسمنا نصفین فصرت فی صلب عبداللہ و صار علی فی صلب ابی طالب و اختار نی بالنبوۃ و اختار علیا بالشجاعتہ و القلم و الفصاحتہ و اشتق لنا اسماء من اسماء اللہ فا اللہ محمود و انا محمد و اللہ الا علی و ھذا علی (اخرجہ' سبو ع الاندلسی فی کتابہ الشفاء)

(حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میں اور علیؑ ایک نور سے پیدا کئے گئے جسے ہمارے جد امجد حضرت آدمؑ کی تخلیق سے دو لاکھ سال پیشتر اللہ پاک نے متن عرش کی زینت بنایا۔ پھر جب حضرت آدمؑ کی تخلیق ہوئی تو ہم ان کی پشت میں آئے۔ پھر ہم مقدس و محترم پشتوں سے پاکیزہ رحموں میں منتقل ہوتے رہے یہاں تک کہ حضرت عبدالمطلب کی پشت میں آئے پھر ہم دو نصف میں منقسم ہوگئے۔ میں حضرت عبداللہؑ کی پشت میں آگیا۔ جبکہ علیؑ ابوطالبؑ کی پشت میں آگئے اور اللہ پاک نے مجھے نبوت کیلئے پسند کیا۔ جبکہ علیؑ کو شجاعت اور علم و فصاحت کیلئے پسند کیا اور اللہ پاک نے اپنے اسماء میں سے ہمارے نام مشتق کئے۔ پس اللہ محمود ہے اور میں محمد ہوں اور اللہ اعلیٰ ہے اور یہ علی ہیں۔ (سبوع الاندلسی نے اپنی کتاب الشفاء میں یہ حدیث بیان کی)

حدیث نمبر ۳ خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات غداۃ و علیہ مرط مرحل من شعر اسود فجاء الحسین بن علی رضی اللہ عنہ فا دخلہ ثم جاء الحسین فا دخل معہ ثم جائت فاطمتہ فاد خلھا ثم جاء علی فادخلہ ثم قال انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا (رواہ مسلم)

(ایک دن صبح حضور نبی کریم ﷺ برآمد ہوئے۔ آپ کے بدن پر اس وقت ایک سیاہ بالوں کی کملی تھی جس پر اونٹوں کے کجاووں کی تصاویر بنی تھیں۔ اتنے میں حضرت حسنؓ بن علیؓ آگئے اور آپؐ نے ان کو اپنی کملی میں لے لیا۔ پھر حضرت حسینؓ آئے۔ آپؐ نے ان کو بھی حضرت حسنؓ کے ساتھ کملی کے اندر لے لیا۔ پھر حضرت فاطمہؓ آئیں اور آپؐ نے ان کو بھی کملی کے اندر لے لیا۔ پھر حضرت علیؓ آئے اور آپؐ نے ان کو بھی کملی کے اندر لے لیا اور پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا (اے اہل بیت! اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم کو (گناہوں اور برائیوں کی) ناپاکی و پلیدی (اور غیراخلاقی باتوں کے میل کچیل میں آلودہ ہونے) سے بچائے اور تم کو پاک و صاف رکھے جیسا کہ پاک و صاف رہنا چاہیے۔

حدیث نمبر ۴ معرفۃ آل محمد براءۃ من النار و حب آل محمد جوار علی الصراط و الو لایۃ لآل محمد امان من العذاب (اوردہ' الشیخ العلامہ یحیٰی العامری الیمنی الشافعی فی

کتابہ بہجۃ المحافل)۔
آل محمدؐ کی معرفت دوزخ کی آگ سے برات ہے۔ آل محمدؐ کی محبت پل صراط پر حفاظت و پناہ کا سامان ہے۔ آل محمدؐ کی ولایت و حکومت اور دوستی عذاب سے امان ہے۔ (علامہ عامری نے اپنی کتاب ۔ بجنۃ المحافل میں بیان کی)

حدیث نمبر۵ سالت ربی ان لا یدخل النار احدا من اهل بیتی فاعطانی ذلک
(جواہر العقدین السید علی المسہودی میں حضرت عمران بن حسینؓ سے مروی مرفوع حدیث میں حضورﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میرے اہل بیت میں سے کوئی جہنم میں نہ جائے تو میری یہ دعا قبول ہوئی)۔

حدیث نمبر۶ قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یا فاطمه لم سمیت فاطمه۔ قال علی لم سمیت فاطمته یا رسول الله قال ان الله قد فطمها و ذریتها من النار
(حضورﷺ سے حضرت علیؓ نے روایت کیا کہ آپؐ نے ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ سے پوچھا اے فاطمہؓ (کیا تمہیں معلوم ہے) تمہارا نام فاطمہ کیوں رکھا گیا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ ان کا نام فاطمہؓ کیوں رکھا گیا۔ حضورﷺ نے فرمایا (فطم کے معنی روکنا، منع کرنا، چھڑانا) اللہ پاک نے فاطمہؓ اور اس کی اولاد کو آگ سے روک دیا ہے)

حدیث نمبر۷ ما بال قوم یزعمون ان قرابتی لا تنفع ۔ ان کل سبب و نسب منقطع یوم القیمه الا سببی و نسبی ۔ والله

رحمی موصولہ فی الدنیا و الاخرۃ
(لوگوں کو کیا ہوگیا کہ سمجھتے ہیں کہ مجھ سے قرابت رکھنا قیامت کے دن فائدہ مند نہ ہوگا (جبکہ حقیقت یہ ہے کہ) قیامت کے دن ہر سبب و نسب منقطع ہو جائے گا سوائے میرے سبب و نسب کے۔ واللہ دنیا اور آخرت میں مجھ سے قرابت انعام یافتہ ہوگی) متعدد طریقوں سے آپ کا یہ ارشاد بھی منقول ہے۔ ان الانساب ینقطع یوم القیمۃ غیر نسبی و سببی و صہری (کہ قیامت کے دن سب نسب منقطع ہو جائیں گے سوائے میرے نسب و سبب و سسرالی رشتہ کے)

حضور ﷺ کے خصائل بیان کرتے ہوئے صاحب التلخیص فرماتے ہیں کہ آپ کی بیٹیوں کی اولاد کا نسب بھی آپ کی ذات گرامی ہی سے چلتا ہے جبکہ آپ کے علاوہ دوسروں کے نواسوں نواسیوں کا نسب ہم ذات و برابری میں ان کے نانا سے نہیں چلتا۔ اور صاب کشاف نے آیت قل تعالوا ندع الی آخرہ کے تحت فرمایا کہ اصحاب کساء (چادر کے اندر آ جانے والوں) کے فعل پر اس آیت سے زیادہ کوئی قوی دلیل نہیں ہے اور اصحاب کساء حضرت علیؓ و فاطمہؓ و حسنؓ و حسینؓ ہی ہیں اس لئے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ حضرت حسینؓ و حضرت حسنؓ اور حضرت فاطمہؓ کو اپنی پشت کی طرف کھڑا کیا اور حضرت علیؓ کو ان سب کے پیچھے کھڑا کیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آیت سے مراد یہی حضرات ہیں اور یہ کہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد اور ذریت بھی حضور ﷺ کی اولاد و ذریت ہی ہے اور ان کے نسب کی نسبت آپ کی طرف نسبت صحیحہ اور دنیا اور آخرت میں نفع پہنچانے والی ہے اور اس کی تائید بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت حسنؓ کی فضیلت کے بارے میں ہے جس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا

ان ابنی هذا سید کہ میرا یہ بیٹا سید ہے اور التشریح میں ہے ان الحسن و الحسین سیدا شباب اھل الجنة و اولادھما سادات المسلمین کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں اور ان کی اولاد سادات المسلمین ہیں۔

لفظ سید

سیادت کا لقب خود احادیث نبویہ سے ماخوذ ہے۔

حدیث نمبر۱ حضرت حسنؓ بن علیؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت انسؓ سے ارشاد فرمایا۔ یا انس ادع لی سیّد العرب (اے انس سید العرب کو میرے پاس بلا کر لاؤ) اس پر حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے فرمایا الست سید العرب (کیا آپ خود سید العرب نہیں ہیں؟)۔ آپؐ نے فرمایا انا سید ولد آدم و علی سید العرب (میں تو اولاد آدم کا سردار ہوں اور علی سید العرب ہیں)۔ جب حضرت علیؓ تشریف لے آئے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا یا معشر الانصار الا ادلکم علی من ان تمسکتم به لن تضلوا بعده ابدًا هذا علی فاحبوه بحبی و اکرموه بکرامتی فان جبریل امرنی بالذی قلت لکم من الله عز و جل (اخرجه الطبرانی) اے انصار کی جماعت! کیا میں تمہیں ایسی شخصیت کے متعلق نہ بتاؤں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑ لو تو اس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ یہ علی ہیں میری محبت کے باعث ان سے محبت کرو اور میری کرامت کے باعث ان کا اکرام کرو کیونکہ حضرت جبرئیلؑ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے کہ جو میں تم سے کہتا ہوں وہ

اللہ عز و جل کی طرف سے ہے۔

حدیث نمبر۲ اور کنز العمال میں حضرت ابن الزبیرؓ سے مروی ہے یا فاطمہؓ الاترضین ان تکونی سیدة نساء المسلمین (اے فاطمہ! کیا تو اس سے خوش نہیں کہ تو مسلمان عورتوں کی سردار ہو جائے)

حدیث نمبر۳ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرۃ سے روایت ہے کہ میں نے ایک دن حضور ﷺ کو اس حال میں منبر پر (خطبہ دیتے ہوئے) دیکھا کہ حسن بن علیؓ آپؐ کے (دائیں یا بائیں) پہلو میں تھے۔ کبھی تو آپؐ (وعظ و نصیحت میں تخاطب کیلئے) لوگوں کی طرف دیکھتے اور کبھی (پیار محبت بھری نظروں سے) حسنؓ بن علیؓ کی طرف دیکھنے لگتے اور فرماتے ان ابنی ھذا سید کہ "یہ میرا بیٹا سید ہے"۔

حدیث نمبر۴ ان ھذا ملک لم ینزل الارض قط قبل ھذہ اللیلۃ اَستاذن ربہ ان یسلم علی و بشرنی بان فاطمۃؓ سیدۃ نساء اھل الجنۃؓ و ان الحسن و الحسین سید اشباب اھل الجنۃؓ (یہ ایسا فرشتہ ہے جو اس رات سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اترا۔ اس فرشتہ نے اپنے رب سے مجھے سلام کرنے کی اجازت چاہی اور مجھے خوشخبری دی کہ فاطمہؓ جنت کی عورتوں کی سردار اور حسنؓ و حسینؓ جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔ (اخرجہ' ترمذی عن حذیفہ)

کمزور انسان کیلئے بھلا کب ممکن ہے کہ اللہ پاک کی غیرمتناہی نعمتوں کا شکر ادا

کرےگا۔ اس خاکسار ذرۂ بیمقدار کیلئے یہ بڑا عطیہ خداوندی ہے کہ دنیا کے بہترین نسب کے ساتھ اسے شرف انتساب حاصل ہے۔ اس نسب شریف سے مراد خلاصہ خاندان اصطفا یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سلسلہ شجرۂ علیا' نطفہ کنبہ ارتضیٰ حضرت علی مرتضیٰؓ کے ساتھ نسبت کی کرامت ہے۔

گر چہ خور دیم نسبتی ست بزرگ
ذرۂ آفتاب تا با نیم

(اگرچہ ہم بہت چھوٹے ہیں مگر نسبت بڑی رکھتے ہیں۔ ہم آفتاب تاباں کے ذرہ ہیں)

محمد احمد رسول بشیر بنی نذیر شاہد مبشر منذر داعی الی اللہ سراج رئوف رحیم کریم حق مبین نور خاتم النبین سید ولد آدم سید المرسلین رسول رب العالمین حبیب اللہ صاحب المقام المحمود صلی اللہ علیہ وسلم من اللہ المعبود

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شجرۂ طیبہ

هو محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد
مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن
غالب بن فهر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن
مدرکہ بن الیاس بن مضرین نزار بن معد بن عدنان

تمام اہل علم حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب اطہر عدنان تک اسی طرح ہے اور عدنان تا اسمٰعیل بن ابراہیم تا آدم علیہ السلام میں اختلاف ہے کہ بعض اشخاص کے بارے میں صحیح روایت نہیں آئی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نسب کا ذکر کرتے وقت جب عدنان تک پہنچتے تو رک جاتے۔

عموماً تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ و ابراہیمؑ و نوحؑ و ادریس و شیث علیہم السلام آنحضرت ﷺ کے اجداد کے سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ عدنان کے دو بیٹے تھے۔ نمبرا عد بن عدنان اور نمبر۲ معد بن عدنان جو ہمارے پیغمبر ﷺ کے اجداد میں سے ہیں۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے: قضاعہ، قنص، ایاد اور نزار (وغیرہ)۔ نزار کی کنیت ابو ربیعہ تھی اور بعض نے کہا ابو ربار۔ اول الذکر تین حضرات کے متعلق معلوم نہیں کہ کس دین و ملت سے تعلق رکھتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ کے اجداد میں مضر دین اسلام پر تھے۔ ایک روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا

لا تسبوا مضر فانه كان قد اسلم
(مضر کو برا مت کہو کیونکہ وہ مسلمان ہو گئے تھے)

اور حضور ﷺ کے اجداد میں الیاس بھی مومن تھے کہ ان کا نام عامر یا عمرو تھا۔ ایک دن خرگوش کے پیچھے دوڑے اور اسے پکڑ لیا تو مدرکہ کے (پانے اور پکڑنے والا) لقب سے مشہور ہوئے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ قریش نضر کا لقب تھا۔ حضور ﷺ سے لوگوں نے پوچھا کہ قریش کون لوگ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا نضر بن کنانہ کی اولاد۔ لیکن اکثر اہل سیر و مورخین کے نزدیک قریش فہر بن مالک بن النضر کا لقب ہے اور جو فہر کی اولاد نہیں ہے اسے قریشی نہیں کہتے اور قریش نام سے پکارے جانے کی وجہ یہ ہے کہ تقرش جمع ہونے یا جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ (تقرش المال ۔ مال جمع کرنا۔ تقرش القوم ۔ قوم کا جمع ہونا) اور قریش متفرق و جدا ہونے کے بعد چونکہ پھر حرم شریف میں جمع ہو جایا کرتے اس لئے قریش کہلائے یا یہ قریش تقریش سے ماخوذ ہے بمعنی تفتیش (قرش بینهم ۔ ان کے درمیان رہ کر حالات معلوم کئے) اور قریش چونکہ فقراء کے اور غریب حاجیوں کے حالات معلوم کرتے رہتے اس لئے قریش کہلائے۔ (تیسری ممکنہ وجہ بیان کرتے ہوئے) بعض حضرات کا

کہنا ہے کہ قریش سب سے بڑے سمندری جانور کا نام ہے۔ (بعض نے وھیل مچھلی کہا) (جسے کلب البحر بھی کہتے ہیں) قریش چونکہ قبائل عرب کا سب سے بڑا اور طاقتور قبیلہ تھا اس لئے یہ قریش کہلائے۔

(اور حضور ﷺ کے اجداد میں) قصی کا نام زید تھا اور قصی لقب۔ (قاصی بمعنی دور کا باشندہ) چونکہ قصی مکہ سے کافی دور قبیلہ بنی قضاعہ میں چلے گئے تھے اور وہاں قیام کر لیا تھا اس لئے قصی ان کا لقب پڑ گیا۔ قصی کو مجمع (جمع کرنے والا) بھی کہتے ہیں کیونکہ قبائل جب متفرق ہوگئے تو یہ سب کو مکہ لے آئے اور ان سب کو جمع کر دیا۔ انہوں نے (باہمی مشاورت کیلئے) دارالندوہ (دارالمشاورت) بھی تعمیر کرایا تھا۔

(اور حضور ﷺ کے اجداد میں) عبدمناف بڑے خداترس و حق شناس آدمی تھے۔ آپ کی کنیت ابو عبدشمس تھی اور مناف ایک نبی کا نام تھا (جس کے نام پر مناۃ ایک بت تراش لیا گیا تھا۔ ماں نے پہلی بار منات/مناف پر بھیجا تو یہ عرف عام میں عبدمناف کے نام سے مشہور ہوگئے اگرچہ ان کا حقیقی نام مغیرہ تھا)۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ (نمبر۱ ہاشم نمبر۲ عبدشمس نمبر۳ نوفل نمبر۴ مطلب) ہاشم ہمارے پیغمبر ﷺ کے اجداد میں ہیں جبکہ عبدشمس بنو امیہ کے اجداد میں سے ہیں۔ ہاشم اور عبدشمس جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ ان دونوں کی پیشانی جڑی ہوئی تھی۔ آخر الامر تلوار کے ذریعے ان کی پیشانی جدا کی گئی۔ (ان کی آئندہ نسلوں میں اختلافات رہے اور تلوار کا برابر عمل دخل رہا)۔

(اور حضور ﷺ کے اجداد میں) ہاشم کا نام عمرو تھا۔ ان کو بلند مرتبہ کے باعث عمرو العلی بھی کہتے ہیں۔ ان کا لقب ہاشم اس لئے پڑا کہ عربی میں "ہشم" کسی خشک چیز کے ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں اور جن دنوں مکہ میں قحط پڑا (یہ تجارت کی

غرض سے شام گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر سب اونٹوں پر روٹیاں اور آٹا لاد لائے اور مکہ آکر عام دعوت کر دی۔ گوشت اور شوربے میں روٹیاں توڑ کر ڈالیں اور عام دعوت میں پیش کیں۔ اس طرح یہ ہاشم مشہور ہوگئے یعنی مخلوق خدا کو شوربے میں بھیگی روٹیاں کھلانے والے)

ہاشم کے چار بیٹے تھے۔ (نمبرا اسد نمبر۲ نضلہ نمبر۳ ابو صیفی نمبر۴ عبدالمطلب)۔ اسد حضرت علی مرتضیٰؓ کے نانا تھے۔ (والدہ کے والد)۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اب جتنے ہاشمی ہیں وہ سب عبدالمطلب ہی کی اولاد ہیں اس لئے کہ ہاشم کے دوسرے تین بیٹوں کی اولاد باقی نہ رہی تھی۔

(حضور ﷺ کے دادا) عبدالمطلب کا نام شیبہ ہے۔ آپ کو آپ کے بہت سے نیک کاموں کے باعث "شیبته الحمد" بھی کہتے ہیں۔ آپ کو عبدالمطلب اس لئے کہتے ہیں کہ آپ ابھی بچے ہی تھے کہ آپ کے والد (ہاشم) کا انتقال ہوگیا اور آپ کے چچا مطلب نے آپ کی پرورش اور تربیت کی۔ عرب کا دستور تھا کہ جو کسی یتیم کی تربیت کیا کرتا، یتیم کو اس کی طرف منسوب کرکے اس کا غلام کہا کرتے۔ لفظ "عبدفلان" سے اسے یاد کرتے (عبدالمطلب ۔ مطلب کا غلام)۔ جب مطلب کا انتقال ہوا تو اہل مکہ کی ریاست اور پیشوائی عبدالمطلب کو ملی اور خانہ کعبہ کی چابی ان کے ہاتھ آئی۔ خانہ کعبہ کی "حجابت" (بیت اللہ کی دربانی اور مسجد حرام کی خدمت) اور "سقایت" (حاجیوں کو زمزم کا پانی پلانے کی خدمت) کے منصب ان کے سپرد ہوئے۔ تمام مکہ والے ان کے مطیع و فرمانبردار ہوگئے اور ان کا بے حد احترام کرنے لگے۔

عبدالمطلب کے تیرہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے بارے میں بعض کا خیال ہے کہ گیارہ تھے اور بعض کہتے ہیں دس تھے۔ نمبرا حارث نمبر۲ ابوطالب

نمبر۳ ر۔ نمبر۴ حمز نمبر۵ ابولہب نمبر عداق نمبر۷ مقوم نمبر۸ صرار
نمبر۹ عباس نمبر۱۰ قثم نمبر۱۱ الکعبہ نمبر۱۲ حجل نمبر۱۳ عبداللہ ہمارے پیغمبر
کے والد بزرگوار (بعض نے کہا غیداق اور حجل ایک ہی شخص کے نام ہیں اور
عبدالکعبہ اور مقوم ایک ہیں جبکہ قثمؓ کوئی نہ تھا)۔ عبدالمطلب کی چھ بیٹیاں یہ
تھیں۔ نمبر۱ ام حکیم جن کا نام مینا تھا۔ نمبر۲ برہ نمبر۳ عاتکہ نمبر۴ صفیہ
نمبر۵ اروی نمبر۶ امیمہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تایوں میں صرف حضرت حمزہؓ اور
حضرت عباسؓ ہی اسلام لائے۔ صاحب جامع الاصول کے خیال میں اہل بیت کا یہ گمان
ہے کہ ابوطالب مرنے سے پہلے اسلام لے آئے تھے۔ واللہ اعلم

ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اہل سیر و مورخین کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت واقعہ فیل کے
۵۵ روز بعد یا چالیس روز بعد ہوئی اور اہل تاریخ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ کی
ولادت اور قصہ اصحاب فیل دونوں واقعات ایک ہی دن ظہور پذیر ہوئے۔ مشہور قول
کے مطابق آپؐ ماہ ربیع الاول میں دنیا میں تشریف لائے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں
آپؐ کی ولادت باسعادت ماہ رمضان میں تھی۔ (ماہ ولادت کی طرح) آپؐ کی تاریخ
ولادت میں بھی اہل علم کی مختلف آراء ہیں۔ مورخین کے مشہور قول کے مطابق ماہ
ربیع الاول کے بارہ شب و روز گزر چکے تھے جب آپؐ کی ولادت باسعادت ہوئی۔
حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ۱۰ ربیع الاول بروز پیر
شروع وقت میں ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
پیدائش بھی بروز پیر تھی۔ آپؐ پر پہلی بار وحی بھی بروز پیر نازل ہوئی۔ آپؐ نے
حجراسود کو بھی اس کی جگہ پیر کے روز ہی نصب کیا۔ ہجرت کے ارادہ سے آپؐ مکہ
مکرمہ سے پیر ہی کے دن روانہ ہوئے اور مدینہ منورہ پیر ہی کے روز پہنچے اور آپؐ کی

وفات بھی پیر ہی کے روز ہوئی۔

آنحضرت ﷺ طلوع صبح صادق کے بعد اور طلوع آفتاب سے پیشتر پیدا ہوئے۔ چاند کی منزلوں میں طلوع عقرب کے وقت۔ حساب دانوں کے نزدیک رومی مہینوں کے اعتبار سے یہ تاریخ یکم اپریل تھی اور فارس کے مہینوں کے اعتبار سے اس ماہ کی ۱۷ تھی اور لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ کسریٰ نوشیروان کا عہد تھا۔ صاحب جامع الاصول کے بیان کے مطابق آپؐ کی ولادت باسعادت جب ہوئی تو سکندر رومی کی وفات کو ۸۸۲ سال گزر چکے تھے اور ابن جوزی نے کتاب تلقیح میں حضرت ابن عباسؓ اور محمد بن اسحٰق سے نقل کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے حضور ﷺ کی ولادت تک کا زمانہ چھ سو سال تھا۔ واللہ اعلم

آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وھب بن عبدمناف بن زہرہ بن کلاب تھیں۔ اکثر اہل سیر کا یہی خیال ہے کہ حضور ﷺ کے علاوہ وہ کسی اور فرزند سے حاملہ نہ ہوئی تھیں اور حضرت عبداللہ کے آپؐ کے علاوہ اور کوئی فرزند تولد نہ ہوا تھا۔ محمد بن اسحٰق کے بیان کے مطابق حضور ﷺ ابھی شکم مادر ہی میں تھے کہ آپؐ کے والد بزرگوار حضرت عبداللہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اپنے والد عبداللہ کی وفات کے وقت آپؐ ۲۸ ماہ کے تھے یا سات ماہ کے یا گہوارہ میں دو ماہ کے تھے۔

روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی والدہ حضرت آمنہ کا دودھ صرف شروع کے سات دن پیا۔ اس کے بعد ابولہب کی کنیز ثوبیہ نے آپؐ کو دودھ پلایا۔ اس وقت حضرت حلیمہ سعدیہ آپؐ کو دودھ پلانے پر مقرر ہوئیں۔ حضور ﷺ جب چھ یا سات سال کے ہوگئے تو حضرت آمنہ آپؐ کو اپنی خادمہ حضرت ام ایمن کے ساتھ جو حضرت عبداللہ کی کنیز تھیں اور بذریعہ میراث حضور ﷺ کو ملی

تھیں مدینہ منورہ لے گئیں۔ اس کے بعد جب حضرت آمنہ مکہ مکرمہ واپس ہو رہی تھیں تو اثنائے راہ جب بمقام ابوا پہنچیں تو آپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کو وہیں دفن کر دیا گیا۔ ام ایمن آنحضرت ﷺ کو لیکر مکہ مکرمہ آئیں اور آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب آپؐ کی کفالت و تربیت کے ذمہ دار ہوگئے۔ جب حضور ﷺ چھ سال کے ہوئے تو آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے وفات پائی مگر اپنی زندگی میں انہوں نے ابوطالب کو وصیت کر دی تھی کہ وہ حضور ﷺ کی نگہداشت و محافظت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔ روایت ہے کہ حضرت عبدالمطلب آخیر عمر میں نابینا ہوگئے تھے۔ آپ کی عمر ۱۲۰ سال اور ایک قول کے مطابق ۸۲ سال ہوئی اور آپ کی وفات نوشیروان عادل کے عہد میں ہوئی۔ شہزادہ ہرمز اور حاتم طائی شاعر جو سخاوت و کرم میں مشہور ہے۔ ان کی موت ایک ہی سال واقع ہوئی۔

کفالت ابوطالب

حضرت ام ایمن سے روایت ہے کہ جب حضرت عبدالمطلب کا جنازہ جا رہا تھا تو حضور ﷺ جنازہ کے پیچھے روتے ہوئے جا رہے تھے۔ ابوطالب نے جب حضور ﷺ سے متعلق امور کی نگہداشت سنبھالی تو آپؐ کی تربیت و محافظت کے فرض کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا اور آپؐ کی نصرت و حمایت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ کیا ظہور نبوت سے قبل اور کیا اعلان نبوت کے بعد ابو طالب آپ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اپنے بیٹوں پر بھی آپؐ کو تقدیم و ترجیح دیتے اور حضرت عبدالمطلب کے طریقہ کے موافق آپؐ کی موجودگی کے بغیر کھانے کیلئے دسترخوان تک نہ بچھاتے۔ آپؐ کو اپنے پہلو میں سلاتے اور جب گھر سے باہر جاتے آپؐ کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ ابو طالب نے حضور ﷺ کی مدح میں کچھ اشعار بھی کہے ہیں۔ ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے۔

و شق لہٗ من اسمہ لیجلہ

فذو العرش محمود و ھذا محمد

(اور اللہ پاک نے حضور ﷺ کے نام کو اپنے نام سے مشتق کیا (نکالا) تاکہ آپؐ کا نام دنیا میں خوب چمکے۔ پس صاحب عرش (اللہ) کا نام محمود ہے (تعریف کیا گیا) اور آپ کا نام محمدؐ) اور حضرت حسان بن ثابتؓ نے اسی شعر کی تضمین کرتے ہوئے اپنے یہ نعتیہ اشعار کہے ہیں

الم تر ان اللہ ارسل عبدہ بایاتہ اعلٰی و احمد

و شق لہ الٰی آخرہ

(اے مخاطب! کیا تو نے اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ پاک نے اپنے بندہ کو کیسی بلند اور انتہائی قابل تعریف نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور مذکورہ بالا شعر وشق لہ من اسمہ آخر تک)

بعثت و نبوت

آپ کی عمر شریف جب چالیس سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو پوری انسانیت کیلئے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ بعثت و نبوت دیئے جانے سے پیشتر آپؐ پر کچھ علامات و نشانیاں ظاہر ہونا شروع ہوئیں مثلاً رویاء صالحہ و صادقہ (اچھے اور سچے خواب) اور شجرو حجر کا آپؐ کو سلام کرنا۔ چنانچہ حضرت جابر ابن سمرۃ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری بعثت و نبوت سے کچھ پہلے میں جب بھی کسی درخت یا پتھر پر گزرتا وہ مجھے السلام علیک یا رسول اللہ کہتا۔

آنحضرت ﷺ پر وحی کا نزول مختلف طرح ہوتا تھا: ایک رویاء صادقہ یعنی سچے خواب آنے کی شکل میں جیسا کہ اوپر گزرا۔ دوسرے اس طرح کہ حضرت

جبرئیل علیہ السلام حضور ﷺ کے قلب مبارک میں القاء فرماتے بغیر اس کے کہ حضور ﷺ حضرت جبرئیلؑ کو دیکھیں۔ تیسرے اس طرح کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں حضور ﷺ کے روبرو تشریف لاتے اور آپؐ کے سامنے وحی کے الفاظ پڑھتے۔ چوتھے اس طرح کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی اور گھنٹی کی سی آواز آتی اور آپؐ پر یہ وحی کی سب سے زیادہ سخت صورت تھی۔ پانچویں اس طرح کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصل شکل و صورت میں آپؐ کے پاس تشریف لاتے اور الفاظ وحی آپؐ کے سامنے پڑھتے۔ کسی اور کی شکل و صورت اختیار نہ کرتے۔ چھٹے جیسے شب معراج میں بالائے آسمان آپؐ پر وحی کا نزول ہوا۔ ساتویں اللہ پاک بغیر فرشتہ کے واسطہ کے آپؐ سے پردہ کے پیچھے سے خود کلام فرماتے۔ آٹھویں جیسے شب معراج میں اللہ پاک نے بغیر فرشتہ کے واسطے اور بغیر کسی پردہ کے آپ سے کلام فرمایا۔

وفات ابوطالب

۱۰ سال نبوت ابوطالب نے وفات پائی۔ ابوطالب جب بیمار ہوئے تو آنحضرت ﷺ آپ کے سرہانے تشریف لائے اور بیٹھ کر فرمایا۔ اے چچا! خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے بچپن میں میری کفالت فرمائی اور میرے بڑے ہونے پر میرے لئے باعث تقویت بنے۔ اور فرمایا "انک اعظم الناس علی حقا و احسنھم عندی یدًا ولا نت اعظم حقا من ولدی" (بلاشبہ اور لوگوں کے مقابلہ میں آپ کا حق مجھ پر سب سے زیادہ ہے۔ آپ نے سب سے زیادہ مجھ سے حسن سلوک کیا۔ آپ کا مجھ پر حق تو میری اولاد سے بھی زیادہ ہے) اے چچا! ایک کلمہ (لا الہ الا اللہ) زبان سے ادا کرکے میری مدد فرما دیجئے تاکہ روز قیامت اس کلمہ کے وسیلہ سے میں اللہ کی جناب میں آپ کے لئے شفاعت کرسکوں۔ ابوطالب نے پوچھا وہ کونسا

کلمہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ (اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں)۔ ابوطالب نے کہا یہ صحیح ہے کہ تو میرا خیرخواہ ہے' لیکن اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میرے بعد تجھے لوگ یہ طعنہ دیں گے کہ تیرا چچا موت سے ڈر گیا اور خوف کے باعث اس نے یہ کلمہ ادا کیا تو یہ کلمہ ادا کرکے میں ضرور تیری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا اور اس موقعہ پر ابوطالب نے یہ شعر کہے۔

دعوتنی علمت انک ناصح
و لقد صدقت و كنت فيه امينا
اطهرت دينًا قد علمت بانه
من خير اديان اله روينا
لو لا اعلامة او خد ارينا
لو جد تنی سمحًا ند اک سمعنا

(تونے مجھے دعوت فکر دی اور مجھے معلوم ہے کہ تو میرا خیرخواہ ہے۔ بلاشبہ تونے سچ کہا اور تو ایسا کہنے میں صاحب امانت ہے۔ تو نے ایسے دین کا اعلان کیا کہ مجھے معلوم ہے وہ ان ادیان میں سب سے بہتر ہے جو ہمارے پاس آئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا کہ ملامت حالت نشاط میں تیز دوڑنے والے اونٹ سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دوڑتی ہے تو مجھے تو اپنی اس پکار کو قبول و تسلیم کرنیوالا پاتا)

معراج شریف

اکثر علماء کی رائے ہے کہ معراج ۱۲ نبوی ربیع الاول کے مہینہ میں ہوئی۔ بعض کا قول ہے کہ ہجرت سے ایک سال پانچ ماہ قبل ہوئی کہ ماہ شوال ۱۱ نبوی تھا۔ ایک قول کے مطابق معراج ماہ رجب کی ستائیس ویں شب کو ہوئی۔ بعض کا قول ہے ربیع الثانی کی ۲۷ویں شب کو ہوئی۔ بعض حضرات کا کہنا ہے ۱۷ رمضان المبارک ۱۲ نبوی کو ہوئی۔ معراج شریف کی تفصیلی کیفیت کیلئے سیئر و تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ہجرت نبویؐ

۱۳ نبوی میں جب کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کے سلسلے میں مشاورت میں مشغول تھے جبرئیل امین رب العالمین کی جانب سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دینے تشریف لائے اور حقیقت حال سے خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :۔

ان اللہ یا مرک با لھجرۃ

(اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہجرت کا حکم فرماتے ہیں)

کہ آپؐ مدینہ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ جب رات کا وقت آیا کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در دولت پر جمع ہوگئے اور انتظار کرنے لگے کہ آپؐ سو جائیں تاکہ وہ آپؐ پر حملہ کرکے آپؐ کو ہلاک کر ڈالیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حقیقت حال کا علم ہوگیا تو آپؐ نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے ارشاد فرمایا کفار میرے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں آج یہاں سے باہر نکل رہا ہوں۔ آپؓ آج رات میرے بستر پر آرام کریں اور میری سبز چادر اپنے اوپر ڈال لیں اور یہ وہ چادر تھی جو آپؐ رات کو استعمال فرماتے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ وہ اپنا دل مضبوط رکھیں۔ کفار انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ چنانچہ حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے خاص بستر پر آرام فرما ہوگئے اور چادر اپنے اوپر کھینچ لی اور حضورﷺ گھر سے باہر نکلے۔ ایک مشت خاک کفار کے سروں پر چھڑکی اور ان کے سامنے سے گزر گئے اور وہ گمراہ آپ کو نہ دیکھ سکے۔

روایت ہے کہ جس رات حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ' حضورﷺ کے خاص بستر پر آرام فرما ہوئے اور حضورﷺ پر اپنی جان نچھاور کی۔ اللہ پاک نے حضرت جبرئیلؑ و میکائیلؑ کو وحی فرمائی کہ میں تم دونوں میں بھائی چارے کا بندھن قائم کرتا ہوں اور تم میں سے ایک کی عمر دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ مقرر کرتا ہوں۔ بتاؤ تم دونوں میں سے کون اس ایثار و قربانی کا مظاہرہ کریگا کہ اپنی عمر کا کچھ حصہ اپنے دوسرے بھائی کو دے دے۔ دونوں نے کہا ہم کسی دوسرے کیلئے اپنی زندگی کا ایثار نہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ اور حضرت میکائیلؑ دونوں پر وحی نازل فرمائی کہ وہ کیوں حضرت علی بن ابی طالبؓ کی طرح نہیں ہیں کہ میں نے ان کے اور محمدﷺ کے درمیان (عقد مواخات) بھائی چارہ قائم کیا تو انہوں نے اپنی جان محمدؐ کی جان پر فدا کی اور ان کی زندگی پر اپنی زندگی کا ایثار کر دیا تم دونوں جاؤ اور ان کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھو۔ چنانچہ اللہ پاک کے حکم کے بموجب حضرت جبرئیلؑ و میکائیلؑ زمین پر اترے۔ حضرت جبرئیلؑ حضرت علیؓ کے سرہانے اور حضرت میکائیلؑ آپ کی پائنتی پر بیٹھے اور حضرت جبرئیلؑ نے خوشی، تعجب و مدح کے انداز میں فرمایا واہ وا آفریں! اے علی بن ابی طالبؓ آپؓ جیسے شخص پر کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے مقابلہ میں آپؓ پر فخر کیا۔

وفات نبویؐ

۱۱ھ میں جب حضورﷺ حجتہ الوداع سے واپس تشریف لا چکے تھے تو بیمار ہوگئے مگر یہ آپؐ کا مرض وفات نہ تھا۔ آپؐ کی بیماری کی خبر سن کر بعض لوگوں

نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے بعد آپؐ کی بیماری میں روزبروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اہل سیئر بیان کرتے ہیں کہ اخیر عمر میں حضورﷺ کو معلوم ہوگیا تھا کہ آپؐ کو اسی سال دنیا سے رخصت ہوجانا اور جوار حضرت حق ذوالجلال میں انتقال فرما جانا ہے۔ خصوصاً حجتہ الوداع میں آپؐ نے اس طرف اشارہ بھی فرمایا تھا۔ ایام منیٰ میں آپؐ پر جب سورۃ اذا جاء نصراللہ نازل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا گویا حضرت جبرئیل نے مجھے اس بات کی اطلاع دیدی تھی کہ اس دنیا سے مجھے اب رخت سفر باندھنا ہے۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا تھا و الاخرۃ خیر لک من الاولٰی (اور آپؐ کے لئے آخرت دنیا سے بہتر ہے)۔ کہتے ہیں جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو حضورﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے

سبحانک اللھم و بحمدک اللھم اغفر لی انک انت
التواب الرحیم
(تیری ذات پاک ہے' اے اللہ ۔ تیری حمد بیان کرتا ہوں اے
اللہ میری مغفرت فرما۔ بلاشبہ تو توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے)

لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہﷺ کیا وجہ ہے آپؐ یہ کلمات اتنی زیادہ مرتبہ کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ جان لو اور آگاہ ہو جاؤ مجھے عالم بقاء کی طرف بلاتے ہیں اور آپؐ نے رونا شروع کر دیا۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہؐ کیا آپؐ موت کے سبب روتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو آپؐ کا گذشتہ و آئندہ سب معاف کر دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا فاین الھول المطلع و این ضیق القبر و ظلمتہ اللحد و این القیمتہ و الاھوال (کہاں وہ خوف و دہشت جس کی اطلاع دی گئی اور کہاں قبر کی تنگی اور لحد کی تاریکی اور کہاں قیامت اور ہولناکیاں)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ حضورﷺ

نے اپنے دنیا سے پردہ فرمانے سے ایک ماہ پیشتر ہی ہمیں اپنی وفات سے متعلق خبر دے دی تھی۔ آپؐ نے بعض خاص اصحابؓ کو ام المومنین حضرت عائشہؓ کے گھر طلب فرمایا اور جب آپؐ کی نظر مبارک ہم پر پڑی آپؐ بے اختیار رونے لگے اور آپؐ کا یہ رونا حضرات اصحاب کے ساتھ بے حد شفقت کے باعث تھا۔ اس کے بعد آپؐ نے دعا فرمائی اور ارشاد فرمایا میں تمہیں تقویٰ اور خوف خدا کی وصیت کرتا ہوں۔ میں جیسا کہ دنیا سے جا رہا ہوں تمہیں چاہیے کہ بندگان خدا کے درمیان ان کے شہروں میں خدا کا نام لیکر علو، غلو اور کبر سے اجتناب کرو (احساس برتری، انتہا پسندی اور مکر و فریب سے بچنا) میں نے کہا یا رسول اللہؐ آپؐ کا آخری وقت کب ہوگا۔ فرمایا وقت جدائی قریب ہی پہنچ گیا ہے۔ پھر خدا، سدرۃ المنتہٰی، جنۃ الماویٰ اور رفیق اعلیٰ کے پاس پہنچ جانا ہے۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہؐ آپؐ کو غسل کون دے گا۔ فرمایا میرے اہل بیت میں وہ مرد جو مجھ سے قریب تر تھے۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ آپؐ کا کفن کن کپڑوں کا ہوگا۔ فرمایا ان سفید کپڑوں کا۔ پھر میں نے پوچھا یا رسول اللہؐ آپؐ کی نماز کون پڑھائے گا اور ہم سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ حضور ﷺ کو بھی رونا آگیا مگر آپؐ نے فرمایا صبر کرو اور نہ گھبراؤ۔ تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ تمہارے گناہ بخشے جائیں اور تمہارے رسول کی طرف سے تمہارے لئے جزائے خیر ہو۔ مجھے جب تم غسل دے چکو تو کفن میں لپیٹنا اور اس گھر میں قبر کے کنارے پر رکھنا۔ پھر گھر سے باہر چلے جانا اور کچھ دیر مجھے تنہا چھوڑ دینا کیونکہ پہلے جو میری نماز جنازہ پڑھیں گے وہ میرے دوست حضرت جبرئیلؑ ہوں گے پھر حضرت میکائیلؑ، پھر حضرت اسرافیلؑ اور اس کے بعد ملک الموت پہلے سے دوسرے فرشتوں کے گروہ کے ساتھ۔ اور ایک روایت میں ہے اول من یصلّی علی ربی (سب سے پہلے میرا رب مجھ پر صلوٰۃ پڑھیگا) پھر جبرئیل نماز ادا کریں گے اور پھر وہی ترتیب جو مذکور ہوئی۔ پھر تم گروہ در گروہ آنا اور میری نماز جنازہ ادا کرنا اور زیادہ

رونے پیٹنے اور نوحہ وغیرہ کرنے سے مجھے ایذاء نہ پہنچانا۔

تمہیں اس طرح کرنا چاہیے کہ پہلے اہل بیت کے مرد حضرات میری نماز جنازہ ادا کریں۔ اس کے بعد اہل بیت کی خواتین اور اس کے بعد باقی تمام اصحاب کرامؓ۔ اور میرا سلام اس جماعت اور میرے ان تمام دوستوں کو پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں اور ہر اس شخص کو جو میرے دین کی پیروی کرے اور میرے طریقہ کا اتباع کرے روز قیامت تک اسے میرا سلام پہنچے۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہؐ آپؐ کو قبر میں کون اتارے گا۔ آپؐ نے فرمایا میرے اہل بیت فرشتوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ --- وہ تمہیں ایسی جگہ سے دیکھیں گے کہ تم انہیں نہ دیکھ پاؤ گے۔

اہل سیر کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری کی مدت کتنی تھی۔ اکثر کے خیال میں ۱۳ روز تھی۔ ایک قول کے مطابق یہ ۱۴ روز تھی اور بعض کے نزدیک ۱۲ دن۔ ایک گروہ کے نزدیک یہ مدت دس روز تھی۔ اس بیماری میں ایک دن آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کو اپنے پاس بلایا۔ جب وہ تشریف لائیں تو آپؐ نے مرحبا یا ابنتی (اے میری بیٹی خوش آمدید) کہہ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں اپنے دائیں یا بائیں ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا اور بر سبیل اشارہ ان سے کوئی بات کی۔ وہ بات سن کر حضرت فاطمہؓ نے رونا شروع کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر دوبارہ اسی طرح حضرت فاطمہؓ سے اشارتاً کوئی بات کی۔ اب حضرت فاطمہ خوش ہوگئیں اور انہوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ حضرت عائشہؓ (جو حضرت فاطمہؓ کا یہ رونا اور پھر ہنسنا دیکھ رہی تھیں) کہتی ہیں میں نے فاطمہ سے کہا اے فاطمہ! میں نے آج سے پہلے کبھی کسی خوشی کو کسی غم سے اتنا زیادہ نزدیک نہیں دیکھا اور میں نے ان سے پوچھا کہ آخر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کیا کہا تھا۔ حضرت فاطمہؓ نے فرمایا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راز فاش نہ کروں گی۔ یہ میرے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان بات تھی۔

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے دن حق تعالیٰ جل شانہ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ ہمارے حبیب محمدؐ کے پاس جاؤ۔ ان کے پاس بغیر اجازت جانے اور بغیر اجازت ان کی روح قبض کرنے سے پرہیز کرنا۔ چنانچہ ملک الموت اپنے ہزار ہزار معاون فرشتوں کے ہمراہ سیاہ و سفید گھوڑوں پر سوار، زر بفتی اور موتی جواہرات والے لباس میں ملبوس حضور ﷺ کے در دولت پر تشریف لائے اور ان کے ہاتھ میں پروردگار عالم کا وہ گرامی نامہ تھا۔ ملک الموت ایک دیہاتی کی شکل و صورت میں دروازہ کے باہر کھڑے ہوگئے اور وہیں سے کہا السلام علیکم اھل بیت النبوۃ و معدن الرسالۃ (اے نبوت و معدن رسالت کے گھر والو! آپ سب پر سلامتی ہو) آپ ہمیں اندر آنے کی اجازت عنایت فرمائیں۔ آپؐ سب پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ حضرت فاطمہؓ نے جو حضور ﷺ کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ جواب دیا کہ حضورؐ ابھی اپنے حال میں مشغول ہیں اور ابھی ملاقات ممکن نہیں۔ دوسری مرتبہ ملک الموت نے پھر اجازت طلب کی اور انہیں پھر وہی جواب ملا۔ تیسری مرتبہ ملک الموت نے اتنی بلند آواز میں اندر آنے کی اجازت طلب کی کہ گھر کے تمام افراد اس آواز کی ہیبت سے کانپنے لگے۔ حضور ﷺ کو ہوش آیا۔ آپؐ نے اپنی مبارک آنکھیں کھولیں اور پوچھا کیا ماجرا ہے۔ آپؐ کو صورت حال بتائی گئی تو آپؐ نے فرمایا اے فاطمہؓ! تمہیں کچھ معلوم ہے تم نے ابھی کس سے گفتگو کی تھی۔ حضرت فاطمہؓ نے فرمایا اللہ و رسولہ اعلم (اللہ اور اس کا رسولؐ زیادہ بہتر جانتے ہیں)۔ آپؐ نے فرمایا یہ ملک الموت ہیں لذتوں کو توڑنے والے۔ آرزوؤں اور خواہشات نفس کو قطع کرنے والے۔ جماعتوں کو الگ الگ کرنے اور بکھیرنے والے۔ بیویوں کو بیوہ کرنے والے۔ بیٹوں بیٹیوں کو یتیم کرنے والے۔ حضرت فاطمہؓ نے جب یہ سنا تو آزردہ خاطر ہوگئیں اور کلمات رنج و غم ادا کرنے لگیں تب حضور ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے سینہ بے کینہ پر رکھ لیا اور کچھ دیر تک آپؐ کی

آنکھیں پلٹی رہیں۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپؐ کی روح مبارک آپ کے جسد مبارک سے پرواز کر گئی ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے اپنا سر آگے کیا اور زور سے یا ابتاہ (اے ابا جان) کہا مگر کوئی جواب نہ سنا۔ پھر کہنے لگیں اے میرے پیارے بابا جان! میری جان آپؐ پر قربان آپؐ میری طرف تو دیکھئے اور کچھ بات کیجئے۔ اب حضورﷺ نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا اے میری بیٹی نہ رو کہ سارا عرش تیرے رونے سے آبدیدہ ہو جاتا ہے اور آپؐ نے اپنے دست مبارک سے حضرت فاطمہؓ کے چہرہ سے آنسو پونچھے۔ ان کی دلداری کی اور انہیں بشارتیں دیں اور فرمایا "بار خدایا! فاطمہ کو میری جدائی پر صبر عطا فرما اور آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کو تعلیم دی کہ جب میری روح پرواز کر جائے تو انا للله و انا الیہ راجعون کہنا اور آپؐ نے سب ازواج مطہرات کو پردہ عصمت و پاکیزگی کی تاکید فرمائی کہ تم سب کو چاہیے کہ اپنے گھر کے گوشہ کی نگہداشت رکھو اور خود کو غیرمحرم کی نظروں سے محفوظ اور پوشیدہ رکھو جیسا کہ حق تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا :-

و قرن فی بیو تکن و لا تبر جن تبرج الجاھلیۃ الاولٰی ؁

(اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو)۔

اس وقت آپؐ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا اپنے بیٹوں حسنؓ و حسینؓ کو میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ دونوں حضورﷺ کے پاس آئے اور سلام کرکے اپنے نانا جان کے پاس بیٹھ گئے۔ دونوں نے جب حضورﷺ کو نزع کی ایسی حالت میں دیکھا تو رونا شروع کر دیا اور وہ کچھ اس طرح بلک بلک کر روئے کہ گھر کے دوسرے افراد بھی انہیں روتا دیکھ کر رونے لگے۔ حضرت حسنؓ نے اپنا منہ حضورﷺ کے چہرۂ مبارک پر رکھ دیا اور حضرت حسینؓ نے اپنا سر حضورؐ کے سینہ بے کینہ پر رکھا۔ حضور انورﷺ نے اپنی نرگسی آنکھیں کھولیں اور حضرت حسنؓ و حضرت

حسینؓ کی طرف شفقت بھری نظروں سے دیکھا۔ دونوں کو بوسہ دیا اور سونگھا اور ان دونوں (شہزادوں) کے بارے میں تعظیم و احترام کی وصیت فرمائی۔ اس موقعہ پر آپؐ نے فرمایا۔ میرے پاس میرے (چچازاد) بھائی علی کو بلاؤ۔ حضرت علی کرم اللہ و جہہ تشریف لائے اور حضورﷺ کے سرہانے بیٹھ گئے۔ حضورﷺ نے بستر سے اپنا سر مبارک اٹھایا۔ حضرت علیؓ نے حضورﷺ کے سر مبارک کو اپنے بازو میں لے لیا تو حضورﷺ نے فرمایا اے علی! فلاں یہودی کا مجھ پر کچھ قرض ہے جو میں نے لشکر اسامہ تیار کرنے کے لئے اس سے لیا تھا۔ تم میری طرف سے وہ رقم اس یہودی کو ضرور ادا کر دینا۔ اے علیؓ! تم سب سے پہلے وہ شخص ہو گے جو لب کوثر پر میرے پاس پہنچے گا۔ میرے بعد بہت سے ناپسندیدہ امور تمہارے ساتھ پیش آئیں گے۔ تمہیں چاہیے کہ تنگدل نہ ہو اور طریق صبر پیش نظر رکھو اور جب تم دیکھو کہ لوگوں نے دنیا پسند کر لی ہے تو تمہیں چاہیے کہ آخرت پسند کرنا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضورﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا دوات (و قلم) و کاغذ لاؤ تاکہ تمہارے بارے میں وصیت لکھ دوں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں مجھے ڈر محسوس ہوا کہ میں لکھنے کا سامان لینے چلا جاؤں اور اس دوران آپ کہیں دنیا ہی سے رخصت نہ ہوجائیں اور میں آپؐ کی وصیت تک نہ پہنچ پاؤں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا حضورﷺ مجھ سے گفتگو کرنے ہی لگے تھے کہ آپؐ کا آب دہن مجھ پر آیا اور آپؐ کی حالت متغیر ہونی شروع ہوگئی۔ آپؐ کی زبان مبارک پیچھے کی طرف سے بے طاقت سی محسوس ہونے لگی۔ میں برداشت نہ کرسکا کہ آپؐ کو اس حالت میں دیکھوں۔ میں نے کہا اے عباس! آپؐ میرے پاس آیئے۔ وہ آئے اور ہم دونوں نے آپؐ کو ہلایا۔ کہتے ہیں کہ سکرات موت آپؐ پر بہت دشوار تھے۔ کبھی آپؐ سرخ ہو جاتے اور کبھی زرد۔ حالت بے قراری میں کبھی آپؐ دائیں ہاتھ کو حرکت دیتے کبھی بائیں ہاتھ کو۔ پسینہ آپؐ کے رخسار مبارک پر اپنے انوار کے ساتھ جھلک رہا تھا۔

آپؐ نے برتن میں کچھ پانی اپنے سامنے رکھا تھا۔ اس پانی میں آپؐ اپنا دست مبارک ڈالتے اور اپنے منہ پر ملتے ہوئے کہتے اللھم اعنی علی سکرات الموت اللھم اعنی علی سکرات الموت (اے اللہ سکرات موت میں میری مدد فرما)۔

رفت آں طاؤس عرشی سوئی عرش

چوں رسید از ہاتفانش بوی عرش

(ہاتف غیبی کی جانب سے جب اسے عرش کی خوشبو پہنچی تو عرش کا طاؤس جانب عرش روانہ ہوگیا)

جب یہ المناک واقعہ پیش آیا تو اہل بیت کے مرد حضرات گھر کے اندر آ گئے اور انہوں نے عورتوں اور مردوں کے درمیان پردہ باندھ دیا۔ گھر کے ایک گوشہ سے لوگوں نے یہ آواز سنی لیکن کہنے والے کو کسی نے نہ دیکھا کہ السلام علیک اھل البیت و رحمۃ اللہ و برکاتہ کل نفس ذائقۃ الموت و انما توفون اجورکم یوم القیٰمۃ (اے اہل بیت! آپ پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں و برکتیں۔ ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو روز قیامت تمہارے اجر پورے پورے دیئے جائیں گے)۔ جان لو کہ اللہ پاک کے نزدیک ہر مصیبت کیلئے دلاسا ہے اور دلجمعی اور ہر فوت شدہ کیلئے ایک جانشین ہے۔ پس اللہ پاک سے اپنا رشتہ مضبوط رکھو اور اسی کی طرف رجوع کرو اور صبر کرو کیونکہ درحقیقت مصیبت زدہ وہ ہے جو آخرت کے ثواب سے محروم ہوا۔ والسلام علیکم و رحمتہ اللہ۔ حضرت علیؓ نے لوگوں سے پوچھا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ یہ کہنے والا کون تھا۔ لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی تو آپؓ نے ارشاد فرمایا یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ ہمارے پاس تعزیت کیلئے آئے تھے۔

منقول ہے کہ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ محلّہ سخ میں اپنے مکان میں تھے۔ کسی کو آپ کو خبر کرنے کیلئے بھیجا۔ آپ عجلت کے ساتھ تشریف لائے اور فرمایا

وا محمداہ و انقطاع ظہراہ (اے محمد ﷺ آپؐ کے پردہ فرما جانے سے تو گویا ہم سب کی کمر ہی ٹوٹ گئی ہے)۔ حضرت ابوبکرؓ نے اہل بیت سے تعزیت کی اور انہیں دلاسا دیا اور فرمایا حضور ﷺ کے غسل اور تجہیز و تکفین کی مہم آپ اہل بیت حضرات سے متعلق ہے اور خود اکابر مہاجرین و انصار کے ساتھ سقیفہ بنی ساعدہ امر خلافت طے کرنے کے لئے چلے گئے۔ اہل بیت آنحضرت ﷺ کے غسل سے متعلق کاموں میں مشغول ہوگئے۔ حضرت علیؓ و عباس و فضل و قثم صاحبزادگان حضرت عباس' اور اسامہ بن زید و آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ صالح حبشی جن کا لقب شقران ہے۔ حضور ﷺ وسلم کے جسد اطہر کو اٹھا کر اندر حجرہ میں لے گئے۔ اب اس بارے میں آراء مختلف ہو گئیں کہ حضور ﷺ کو لباس میں ملبوس ہونے کی حالت میں غسل دیا جائے یا پھر جس طرح عام طور پر میت کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ کپڑے بدن سے علیحدہ کر کے برہنہ کو غسل دیا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے حاضرین پر ایک طرح کی اونگھ طاری کر دی۔ اچانک گھر کے ایک گوشہ سے کسی نے آواز دی کہ رسول اللہ ﷺ کو برہنہ نہ کرو اور آپ کے پیراہن ہی میں آپؐ کو غسل دے دو۔ اس طرح سب نے جان لیا کہ یہ غیبی آواز ہے اور لوگ اٹھے اور آپؐ کو غسل دینے میں مصروف ہو گئے۔ حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ باقی لوگ برابر دوسری طرف بیٹھ جائیں اور ان چھ افراد کے علاوہ اندر کوئی نہ آئے۔ حضور ﷺ کو میت کی طرح لٹا دیا گیا کہ آپؐ کا سر مبارک مشرقی جانب اور پاؤں مغربی جانب کر دیئے گئے پھر حضرت علیؓ نے غسل دینا شروع کیا۔ آپ کو اپنے سینہ کے ساتھ کیا۔ اپنے ہاتھ پر کپڑے کا ایک ٹکڑا لپیٹا اور آنحضرت ﷺ کے پیراہن کے اندر ہاتھ ڈالا۔ حضرت اسامہ اور شقران پانی ڈالتے جاتے تھے اور حضرت فضل حضور ﷺ کے پیراہن کو آپ کے بدن مبارک سے جدا کئے رکھتے تھے تاکہ حضرت علیؓ باآسانی حضور ﷺ کا جسد اطہر دھو سکیں اور حضرت عباسؓ و

حضرت قثمؓ حضورﷺ کے بدن مبارک کو ایک جانب سے دوسری جانب کرنے میں حضرت علیؓ کی امداد و اعانت کر رہے تھے اور از جانب غیب بھی اس غسل میں امداد ہو رہی تھی جیسا کہ ان حضرات نے دیکھا کہ حضورﷺ خود اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے دست مبارک سے ہٹا رہے تھے اور عموماً" جیسا کہ میت کا پیٹ دبانے سے کچھ لتھڑا ہوا میل یا آلائش نکلتی ہے حضورﷺ کے مبارک بدن سے ایسی کوئی چیز نہ نکلی۔ حضرت علیؓ نے چنانچہ اس موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں زندگی میں جس طرح آپ کے بدن مبارک سے خوشبوئیں پھوٹتی تھیں اسی طرح اب پھوٹ رہی ہیں۔ بیری کے پتوں والے پانی اور سادہ صاف پانی سے تین مرتبہ آنحضرتؐ کے بدن مبارک کو دھویا گیا۔ غسل سے فراغت کے بعد چند پانی کے قطرے حضورﷺ کے گوشہ چشم اور ناف پر جمع ہوگئے تھے۔ حضرت علیؓ ان قطروں کو پی گئے اور یہ آگے چل کر ان کے علم و حافظہ میں اضافہ کا سبب بن گیا۔ پھر آپؐ کے بدن مبارک کو تین سفید کپڑوں کے کفن میں رکھا گیا جن میں قمیض وعمامہ نہ تھا۔ آپ کے کفن اور سجدہ گاہ پر مشک و حنوط چھڑکا گیا۔ روایت ہے کہ یہ حنوط حضرت جبرئیل علیہ السلام بہشت سے لائے تھے۔ منقول ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے اپنے انتقال کے وقت کچھ مشک اپنے صاحبزادگان کو دیا اور وصیت کی کہ یہ ان کے کفن پر لگائیں کہ ان خوشبوؤں کا بچا ہوا حصہ ہے جو حضورﷺ کے کفن پر لگائی گئی تھی۔

جب مذکورہ امور سے فارغ ہو گئے اور آپ کو چارپائی پر لٹا کر حجرہ غسل سے گھر کے اندر لائے تو مذکورہ وصیت کے مطابق سب گھر سے باہر چلے گئے۔ (اور میت کو کچھ وقت کے لئے تنہا چھوڑ دیا تاکہ سب سے پہلے آپؐ کے دوست حضرت جبرئیلؑ آپؐ کی نماز جنازہ پڑھ لیں پھر حضرت میکائیلؑ پھر حضرت اسرافیلؑ پھر ملک الموت مع فرشتوں کے گروہ کے پھر عام مسلمان گروہ در گروہ)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں آپ کی وفات بروز پیر ہوئی تھی۔ بروز منگل آسمان سے ہاتف غیبی کی آواز ہم نے سنی کہ اے گروہ مسلمانان! آؤ اور اپنے پیغمبر کی نماز جنازہ ادا کرو۔ چنانچہ اسی ترتیب کے ساتھ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں اوپر ذکر ہوا لوگ فوج در فوج آتے رہے اور علیحدہ علیحدہ نماز جنازہ ادا کرتے رہے۔ حضرت علیؓ نے بتا دیا تھا کہ کوئی شخص آپؐ کی نماز جنازہ کی امامت نہ کرے کیونکہ حضور ﷺ اپنی حیات میں بھی اور بعد الموت بھی ان کے امام تھے۔ مدینہ میں دو حضرات تھے۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح جو بطریق شق قبر کھودتے تھے اور حضرت ابو طلحہ انصاری جو بطریق لحد قبر بناتے تھے۔ حضرت عباسؓ نے دو افراد کو بھیجا کہ انہیں بلا لائے اور طے کیا کہ ان میں سے جو بھی پہلے آ جائے اسی کے طریقہ کے موافق حضور ﷺ کیلئے قبر کھودی جائے۔ حضرت ابو طلحہ انصاری جو صاحب لحد تھے پہلے آ گئے اور انہوں نے آپؐ کے لئے قبر کھودی۔ بدھ کی شب آدھی رات کی خاموشی میں آپؐ کو قبر میں رکھا اور پیروں کی جانب سے آپ کو قبر میں لائے۔ حضرت علیؓ و عباسؓ و عقیلؓ اور اسامہؓ و شقرانؓ اور ایک قول کے مطابق فضل و قثمؓ بھی آپؐ کی قبر میں اترے پس نو اینٹیں آپ کی لحد پر چنیں۔

روایت ہے کہ جب آپؐ کے دفن سے فارغ ہوگئے تو یہ لوگ حضرت فاطمہ زہراؓ کے گھر آئے۔ ان سے تعزیت کی اور دلاسا دیا۔ حضرت فاطمہؓ نے پوچھا کہ حضرت پیغمبرؐ کو دفن کر آئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ آپؐ جب ان کی قبر پر مٹی ڈال رہے تھے تو آپ کے دل کو کیسا لگا کہ آخر وہ نبی رحمت تھے۔ آپؐ نے جواب دیا اے رسول اللہ کی بیٹی! ہمارا دل بھی اس وقت بڑا غمناک تھا لیکن اللہ پاک کے حکم کے آگے کوئی چارہ نہیں۔

روایت ہے کہ اہل بیتؓ اور حضرات صحابہؓ حضور ﷺ کی مفارقت و

جدائی کے سبب بہت مغموم اور رنجیدہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے سوز و نیاز کا اظہار کیا اور مرثیے کہے۔ جب حضرت فاطمہؓ اپنے والد بزرگوار ﷺ کی زیارت قبر کیلئے تشریف لائیں تو آپؐ کی قبر مبارک سے ایک مشت خاک اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھی اور رونا شروع کر دیا اور یہ اشعار ارشاد فرمائے۔

ماذا علیٰ من شم تربتہ احمد ان لا یشم مدی الزمان غوالیا
صبت علی مصائب لو انھا صبت علی الایام صرن لیا لیا

(جس نے حضور ﷺ کے قبر مبارک کی مٹی کو سونگھ لیا ہو پھر وہ اگر کبھی کوئی دوسری خوشبو نہ سونگھے تو اس پر کوئی ملامت کرنے والا نہ ہوگا۔ آپؐ کے دنیا سے پردہ فرما جانے سے مجھ پر مصیبتوں کا ایسا پہاڑ ٹوٹا ہے کہ وہ مصیبتیں اگر دن پر پڑتیں تو رات ہو جاتی)۔

جمہور ارباب سیرۃ کی یہی رائے ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کا جانکاہ واقعہ ۱۲ ربیع الاول کو پیش آیا اگرچہ ایک قول کے مطابق آپؐ کا وصال ۲ ربیع الاول کو ہوا۔ آپؐ کی عمر شریف کے بارے میں ارباب سیَر کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق آپؐ کی عمر ۶۳ سال ہوئی۔ ایک قول ۶۵ سال کا، ایک قول ۶۰ سال کا اور ایک ساڑھے ۶۰ سال کا ہے اور ان میں سے ہر قول ایک روایت کی بنا پر ہے جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہے۔

ذکر حضرت علی مرتضیٰؓ

مشرق و مغرب کے امام ابو الائمہ حضرت علی مرتضیٰ بن ابی طالب علیہ السلام اللہ الغالب کا ذکر جو ہمارے شجرۂ علیاء کی اصل و بنیاد ہیں۔ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء (سورۂ ابراہیم آیت نمبر۲۴) "جس کی جڑ محکم اور شاخیں آسمان میں"۔ (یہ قرآنی آیت کلمہ طیبہ کے بارے میں ہے جسے ایسے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے

جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی محکم اور جس کی شاخیں آسمان میں ہیں) آنجناب ائمہ اثنا عشر کے پہلے امام ہیں۔ آپؓ کی کنیت ابو الحسن اور ابو تراب اور آپؓ کا لقب مرتضیٰ تھا۔ آپؓ عام الفیل کے ۳۰ سال بعد ۱۳ رجب بروز جمعہ اندرون خانہ کعبہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ آپؓ کی والدہ محترمہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف تھیں اور یہ پہلی ہاشمی خاتون تھیں جنہوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ جن کی نماز جنازہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پڑھائی، جن کے کفن کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنا قمیص مبارک عنایت فرمایا اور جن کی قبر میں خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اترے اور انہیں قبر میں رکھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، آٹھ سال کے تھے جب ایمان لائے یا بہ روایات دس سالہ یا چودہ سالہ یا پندرہ سالہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود اپنے زیر سایہ آپؓ کی تربیت فرمائی اور خود آپؓ کی پرورش کی۔ سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ باتفاق علماء سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ ایمان لائیں۔ اس کے ایک دن بعد یا ایک روایت کے مطابق اسی دن حضرت علی علیہ السلام ایمان لائے۔ آپؓ کے علمی و عملی فضائل اور حسبی و نسبی شمائل احاطہ شمار سے کہیں زیادہ ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے کسی کے اتنے زیادہ فضائل ہم تک نہیں پہنچے ہیں جتنے امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کے پہنچے ہیں۔ اور حضرت سعید بن المسیب فرماتے ہیں کہ آپ کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جس کا اتنا ذکر ہوتا ہو۔ ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ تین سو قرآنی آیات آپ کے حق میں نازل ہوئیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ماہ ذی الحجہ ۳۵ھ میں مسند خلافت پر بیٹھے اور تین باغی گروہوں سے جنگ کی۔ پہلی جنگ جمل ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ جو نصف جمادی الاخر ۳۶ھ میں بصرہ میں ہوئی اور وہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی وجہ

سے ہوئی اور اس گروہ کو "ناکثین" کہتے ہیں۔ ناکث بمعنی عہد توڑنے والا۔ بیعت فسخ کرنیوالا اور یہ لوگ بیعت توڑنے والے تھے۔ دوسری جنگ صفین حضرت معاویہؓ اور ان کے متبعین کے ساتھ تھی اور ان لوگوں کو "قاسطین" کہتے ہیں۔ قاسط وہ جو ظلم کرے اور جادۂ عدل سے انحراف کرے اور یہ جنگ یکم ذی الحجہ ۳۶ھ سے ایک سو دس روز تک رہی اور اس مدت میں ۷۲ معرکے ہوئے اور صفین دریائے فرات کے قریب ایک موضع ہے۔ تیسری جنگ نہروان جو فرقہ خوارج سے نصف جمادی الاخر ۳۸ھ میں ہوئی اور اس گروہ کو "مارقین" کہتے ہیں (دین سے نکل جانیوالے)۔ حدیث شریف میں ہے حضورؐ نے فرمایا۔

یخرج قوم من امتی یمرقون من الدین مروق السہم من الرمیہ (الطبرانی فی الکبیر)

(میری امت میں ایک ایسی قوم خروج کریگی جو دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے)

(حدیث شریف میں لفظ یخرج آیا اس سے یہ لوگ "خوارج" اور لفظ یمرقون کے باعث "مارقین" کہلائے) اور اس حدیث میں ان لوگوں کے حضرت علیؓ کے دور میں خروج کی طرف اشارہ ہے۔

۱۹ رمضان المبارک آخر شب جمعہ ابن ملجم شقی نے مسجد کوفہ میں تلوار آپؓ کے سر مبارک پر ماری اور ۲۱ رمضان المبارک شب شنبہ آپؓ خالق حقیقی سے جاملے۔ حضرات حسنین علیہم السلام اور حضرت عبداللہ بن جعفر نے آپؓ کو غسل دیا اور محمد بن الحنفیہ نے پانی ڈالا۔ آپؓ کا کفن حضورﷺ کے کفن کے مطابق تھا۔ حضرت امام حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور نجف کے قبرستان میں دفن کیا۔ آپؓ کی عمر شریف ۶۳ سال تھی۔ "عمدۃ المطالب فی نسل آل ابی طالب" میں ہے کہ اکثر روایات کے مطابق امیر المومنین حضرت علیؓ کی اولاد کی تعداد ۳۶ تھی: ۱۸

ذکر حضرت فاطمہؑ

ائمہ طاہرین کی والدہ حضرت فاطمہ زہراء البتول بنت الرسول کی کنیت ام محمد تھی اور آپ کے القاب مبارکہ و طاہرہ و زاکیہ و راضیہ و مرضیہ و بتول تھے۔ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب کی صاحبزادی تھیں۔ آپؑ واقعہ فیل سے ۳۵ سال بعد اور نبوت سے پانچ سال پیشتر پیدا ہوئیں۔ آپ کی ولادت کے متعلق ایک قول ۴۱ نبوی بھی ہے۔ حضرت علیؑ نے غزوۂ بدر سے واپسی پر ۲ھ میں آپ کا رشتہ مانگا جبکہ آپ کی عمر ۱۵ سال تھی یا ۱۸ سال۔ بیہقی و خطیب و ابن عساکر نے روایت کی ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں میں حضورﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ آپ کے چہرۂ مبارک سے نزول وحی کے آثار ظاہر ہوئے۔ جب وحی آ چکی تو حضورﷺ نے مجھ سے پوچھا اے انس! تمہیں کچھ معلوم ہے کہ حضرت جبرائیل میرے لئے رب العزت کی طرف سے کیا پیغام لائے تھے۔ میں نے عرض کیا اللہ و رسولہ اعلم (اللہ اور آپ کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے) آپ نے فرمایا۔

ان اللہ امرنی ان ازوج فاطمہ من علی

اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہؑ کا علیؑ سے نکاح کر دوں۔

فرزند بہ خانہ خدا شد - با بنت رسول کتخدا شد

وہ فرزند جو خانہ خدا کعبہ میں پیدا ہوا - رسول خدا کی بیٹی کا کتخدا و شوہر بن گیا۔

حضرت فاطمہؑ کا مہر چار سو مثقال چاندی تھا (ایک مثقال - چار ماشہ چار رتی) اور آپ کا جہیز ایک کمبل، تکیہ، چکی کے دو پاٹ، ایک پانی کی مشک اور دو بڑے پانی کے گھڑے (مٹکے) حضورﷺ نے حضرت فاطمہؑ کے نکاح کے بعد ان کے حق میں اس طرح دعا فرمائی۔

اللھم بارک فیھما و بارک علیھما و بارک اللہ لھما فی نسلھما

اے اللہ! ان دونوں (کی زندگیوں) میں برکت عطا فرما۔ ان دونوں پر برکتیں نازل فرما

اور ان دونوں کیلئے ان دونوں کی نسلوں میں برکت عطا فرما۔

الطبرانی نے حضرت جابرؓ اور خطیب نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

ان اللہ جعل ذریہ کل بنی فی صلبہ و جعل ذریتی فی ذریہ علی ابن ابی طالب

(بلاشبہ اللہ پاک نے ہر نبی کی اولاد اس کی پشت میں رکھی اور میری اولاد علی بن ابی طالب کی پشت میں رکھی ہے)

اور کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

شیر خدا نفس بنی زوج بتول — بے مہر تو طاعت ملک نیست قبول

شاہد زپی لحمک لحمی ایں بس — کز نسل تو پیدا شدہ اولاد رسول

(اے حضرت علیؓ جو شیر خدا نفس بنی اور حضرت فاطمہؓ کے شوہر ہیں۔ بغیر آپ کی الفت و محبت کے تو طاعت ملک بھی قبول نہیں ہے۔ حضورؐ کا حضرت علیؓ کے بارے میں ارشاد کہ تیرا گوشت میرا گوشت ہے اس پر یہ کافی شہادت ہے کہ اے حضرت علیؓ آپ کی نسل سے حضور ﷺ کی اولاد پیدا ہوئی)

علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی نے کیا خوب کہا۔

وی کسی گفت عائشہ در فضل — بہتراز بنت سید البشر ست

مصرعہ در جواب او خواندم — رشتہ دیگر رگ جگر دگر ست

(وہ جو کسی نے کہا کہ حضرت عائشہ فضیلت میں سید البشر ﷺ کی بیٹی سے زیادہ ہیں ان کے جواب میں میں نے یہ مصرعہ پڑھ دیا۔ رشتہ دیگر رگ جگرد گرست کہ کسی سے رشتہ ہو جانا الگ بات ہے اور کسی کا جگر یا رگ ہونا الگ بات)

حضرت فاطمہؓ کی وفات حضور ﷺ کی وفات کے چھ ماہ بعد ۳ رمضان المبارک ہفتہ کی رات واقع ہوئی۔ حضور ﷺ نے وفات سے قبل حضرت فاطمہؓ

سے فرمایا تھا:۔

انک لاول اهل بیتی لحوقاً لی فاتقی اللہ و اصبری
فانہ نعم السلف انا منک
بلاشبہ تو میرے اہل بیت میں سب سے پہلے مجھ سے ملے گی پس
اللہ سے ڈر اور صبر کر۔ میں تیرے لئے اچھا سلف ہوں۔

حضرت فاطمہؓ کی عمر شریف ۲۸ سال تھی۔ ان کی وصیت کے مطابق امیر المومنینؓ اور حضرت اسماءؓ بنت عمیس نے انہیں غسل دیا اور حضرت امام حسنؓ و حسینؓ پانی ڈالتے جاتے تھے۔ رات کے وقت بقیع کے قبرستان میں مدفون ہوئیں۔ حضرت علیؓ نے اور ایک روایت کے مطابق حضرت عباسؓ نے آپؓ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت عباسؓ و علیؓ و فضل بن عباس آپ کی قبر میں اترے اور امیرالمومنین حضرت علیؓ نے مرثیہ کے اشعار پڑھے۔ لکل اجتماع الٰی لا یروم خلیل ۔ حضرت فاطمہؓ سے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تولد ہوئیں: بیٹے حسنؓ، حسینؓ اور محسنؓ (س کی تشدید کے ساتھ) تھے اور بیٹیاں رقیہؓ، زینبؓ اور ام کلثومؓ تھیں۔ محسنؓ اور رقیہؓ کا تو بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ امامیہ کے نزدیک تیسرے بیٹے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ روایت ہے کہ حمل تھا جو ساقط ہوگیا تھا۔ اور حضرت فاطمہؓ کی نسل صرف حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ سے ہی چلی ہے۔

ذکر حضرت امام حسینؓ

امام مشرق و مغرب حضرت امام ابو عبداللہ الحسین کا ذکر۔ آپ کا لقب سید اور شہید تھا۔ ۵ شعبان سن ۴ھ بروز منگل آپ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے آپ رحم مادر میں صرف چھ ماہ رہے اور آپ کے اور حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کے علاوہ

کوئی فرزند چھ ماہ مدت حمل کے بعد پیدا نہیں ہوا اور حضور ﷺ نے آپ کا نام حسین رکھا اور آپ کو قدرت نے ایسا حسن عنایت فرمایا تھا کہ آپ کی روشن پیشانی اور چمکتے ہوئے رخسار کے نور میں لوگ راستہ طے کرتے تھے۔ آپ کے فضائل و مناقب بے حد و بے حساب ہیں۔ آپ کی شہادت ۱۰ محرم بروز جمعہ سن ۶۱ ہجری میں وقوع ہوئی جبکہ آپ کی عمر شریف ۵۷ سال ۵ ماہ تھی۔ ابن خشاب کے بیان کے مطابق آپ کے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ علی اکبر اپنے والد بزرگوار کے ساتھ شہید ہوئے' علی امام زین العابدین' علی اصغر' محمد' عبداللہ اور آخر الذکر ان تینوں نے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ شہادت پائی۔ جعفر کی اپنے والد کی حیات میں وفات ہوئی اور زینب' سکینہ' فاطمہ اور حافظ عبدالعزیز حامدی کے بیان کے مطابق آپ کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں (چھ بچے) تھے۔ علی اکبر جو اپنے والد بزرگوار کے ساتھ شہید ہوئے اور علی اصغر امام زین العابدین اور جعفر اور عبداللہ اور سکینہ اور فاطمہ' شیخ سعاد نے بھی آپ کے یہی چھ بچے بتائے ہیں اور اس میں بھی کہا گیا ہے کہ حضرت امام زین العابدین کے علاوہ حضرت امام حسین کی اور کسی فرزند سے اولاد نہیں چلی ہے۔ حضرت خواجہ محمد پارسا' فصل الخطاب میں فرماتے ہیں کہ بروز طف حضرت امام حسین کی اولاد میں سے حضرت امام زین العابدین کے علاوہ کوئی نہ بچا تھا۔ پس حق سبحانہ' و تعالیٰ نے آپ کی پشت سے جتنے اہل بیت نبوت پیدا فرمانا چاہے پیدا فرمائے اور مشرق و مغرب میں پھیلا دیئے جبکہ یزید اور اس کے اخلاف میں ایک تن بھی نہ بچا کہ اس کا گھر آباد ہوتا اور اس کے باورچی خانہ میں آگ جل پاتی۔ اللہ تعالیٰ سب سچ بولنے والوں سے زیادہ سچا ہے جس نے فرمایا انا اعطیناک الکوثر (بے شک ہم نے دی آپ کو کوثر حوض کوثر و خیر کثیر) اور فرمایا ان شانئک ھو الابتر (بے شک آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے)۔

ذکر حضرت امام زین العابدینؒ

ائمہ طاہرین کے سردار ابو محمد علی زین العابدین چوتھے امام ہیں۔ آپ کا لقب سجاد و زین العابدین ہے۔ مدینہ منورہ میں ۵ شعبان سن ۳۸ھ (بعض نے کہا سن ۳۶ھ) بروز جمعرات پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ کا نام شاہ زنان اور بقول بعض شہر بانو بنت یزدجرد بن شہریار بن شہرویہ بن پرویز بن ہرمز بن کسریٰ نوشیروان عادل تھا۔ زمخشری نے اپنی کتاب "ربیع الابرار" میں لکھا ہے کہ خلیفہ ثانی (حضرت عمر فاروقؓ) کے دور میں جب صحابہؓ فارس کے قیدیوں کو مدینہ منورہ لائے تو ان میں یزدجرد کی تین بیٹیاں بھی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ان کو (بغیر تعین قیمت) بیچ دیا جائے۔ اس پر حضرت علیؓ نے ان سے کہا کہ حکمرانوں کی اولاد کے ساتھ باقی تمام لوگوں جیسا سلوک نہ کیا جائے تو حضرت عمرؓ نے ان سے استفسار کیا کہ پھر انہیں کس طرح فروخت کیا جائے۔ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کہ پہلے ان کی قیمت مقرر کر دی جائے اور جب قیمت مقرر ہو جائے تو پھر جو چاہے انہیں لے لے۔ چنانچہ ان کی قیمت مقرر کی گئی اور حضرت علیؓ نے تینوں کو خرید لیا۔ ان میں سے ایک کو حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو دیا۔ دوسری کو اپنے فرزند حضرت امام حسینؓ کو دیا اور تیسری کو حضرت ابوبکر کے بیٹے حضرت محمد بن ابی بکر کو دیا۔ پہلی سے حضرت سالم بن عبداللہ پیدا ہوئے۔ دوسری سے حضرت امام زین العابدین پیدا ہوئے اور تیسری سے حضرت قاسم بن محمدؒ پیدا ہوئے۔ یہ تینوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے۔

اس واقعہ سے پیشتر اہل مدینہ جنگی قیدی عورتوں سے شادی کرنا عیب تصور کرتے تھے مگر انہی قیدی عورتوں کے بطن سے جب ایسے عظیم فرزند پیدا ہوئے جو علم فقہ اور تقویٰ میں تمام اہل مدینہ پر سبقت لے گئے تو اب لوگوں کو ایسی عورتوں سے نکاح کرنے میں رغبت پیدا ہوئی۔ حضرت امام زین العابدین ایسی جلیل القدر ہستی اور ایسی عظیم صفات کے حامل تھے کہ زبان قلم ان صفات کے شمار سے قاصر ہے۔ امامیہ

کہتے ہیں کہ ولید بن عبدالملک بن مروان کے اشارہ پر ان کو زہر دیا گیا اور اس طرح ۱۲ محرم بروز ہفتہ اور ایک روایت کے مطابق ۱۳ محرم ۹۵ھ اور بعض نے کہا ۹۴ھ میں آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ آپ کی عمر شریف ۵۷ سال تھی۔ زبیر بن بکاء نے فرمایا بروز طف آپ کی عمر ۲۳ سال تھی اور آپ بقیع کے قبرستان میں مدفون ہوئے جہاں آپ کے تایا حضرت امام حسن مدفون تھے۔ اس کے بعد اسی قبہ میں حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق مدفون ہوئے۔ حضرت امام زین العابدین کے چھ بیٹے تھے' امام محمد باقر' عبداللہ باہر' عمر اشرف' زید شہید' حسین اصغر اور علی اصغر۔

(بارہہ و گلاؤٹھی و بلگرام اور بعض دیگر ہندوستانی مقامات کے سادات کا نسب اور اسی طرح سادات رسولدار کا نسب کہ وہ بھی واسطی الاصل ہیں انہی زید شہید سے وابستہ ہے۔)

حضرت زید شہیدؒ

حضرت زید شہیدؒ کے فضائل و مناقب اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ شمار میں آسکیں اور ان کا احاطہ کیا جا سکے۔ آپ کی کنیت ابوالحسن ہے۔ علامہ بحر محیط عمادالدین ادریس الحسنی الحمری اپنی کتاب کنزالاخبار فی معرفتہ السیر والاخبار میں حضرت علی بن الحسین (والد حضرت زید شہیدؒ) سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی بن الحسین (امام زین العابدین) نے فرمایا کہ جس شب انہوں نے اپنی اہلیہ (جن کا نسب نوشیروان عادل سے جا ملتا ہے) سے مباشرت کی تو صبح اپنے معتقدین سے فرمایا کہ میں نے رات حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے بہشت میں لائے اور ایک حور سے میرا نکاح کیا۔ میں نے اس حور سے مباشرت کی اور وہ حاملہ ہوئی تو حضور ﷺ نے پکارا اور ارشاد فرمایا کہ اپنے اس بیٹے کا نام زید رکھو۔ اگرچہ حضرت علی بن الحسین (امام زین العابدین) کو یہ بشارت ہو چکی تھی

پھر بھی آپ نے قرآن مجید سے فال نکالی اور مصحف میں پہلی بار جب آپ نے نظر ڈالی تو یہ آیت نکلی وفضل اللہ المجاہدین علی القاعدین اجراً عظیماً (اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو گھر میں بیٹھنے والوں کے مقابلہ میں اجر عظیم دیا ہے) آپ نے مصحف بند کر دیا اور دوبارہ کھولا تو ورق اول پر یہ آیت دیکھی ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنتہ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے انکی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی) تو حضرت نے خدا کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ بیٹا زید ہے (یعنی میرے اس بیٹے زید کی یہی شان ہوگی کہ جہاد بھی کرے گا اور جنت کے بدلے اپنی جان جان آفرین کے سپرد بھی کرے گا)۔

حضرت زید شہیدؒ کی ولادت سن ۷۱ھ میں ہوئی۔ گورا رنگ، بڑی آنکھیں، ملی ہوئی بھویں، دراز قد و قامت، گھنی داڑھی، کشادہ سینہ، درمیانی ناک، سیاہ بال، آپ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فصاحت و بلاغت و کثرت علم میں بہت مشابہت رکھتے تھے۔ حضرت زید شہیدؒ کی والدہ کا نام ام ولد جیدا تھا۔ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب "الذراری فی ابناء السراری" میں ایک شہری سے نقل کیا کہ ہشام بن عبدالملک مروان نے ایک بار حضرت زید شہید بن علی سے کہا کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ کا خلافت (کے دعویٰ) کا ارادہ ہے حالانکہ آپ خلافت کے لائق نہیں کہ آپ کی ماں ایک باندی ہے۔ حضرت زید شہید نے جواب میں فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل بھی ایک باندی کے بیٹے تھے جبکہ ان کے بھائی حضرت اسحاق علیہ السلام ایک آزاد عورت کے بیٹے تھے۔ پھر بھی اللہ پاک نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پشت سے خیر البشر حضور ﷺ کو پیدا فرمایا جبکہ حضرت اسحٰق کی پشت سے (بعض) بندر و خنزیر بھی پیدا ہوئے کہ آپ کی بعض اولاد (انبیاء علیہم السلام سے گستاخی کرنے کی بنا پر) مسخ ہو کر بندر و خنزیر کی صورت ہو گئے تھے۔

جاننا چاہیئے کہ حضرت زید شہیدؒ نے ۱۲۱ھ میں ہشام بن عبدالملک بن مروان

کی مخالفت شروع کی اور اپنی بیعت کیلئے لوگوں کو دعوت دی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ مخالفت اس طرح شروع ہوئی کہ زید شہید' حضرت علی بن عبداللہ بن عباس کے بیٹے داؤد اور حضرت جعفر بن ابی طالب کے بیٹے محمد ابن عبداللہ کے ساتھ (گورنر عراق) خالد بن عبداللہ سے ملنے گئے۔ گورنر نے ان حضرات کو انعامات و عطیات سے نوازا۔ خالد جب عراق کی گورنری سے معزول ہوئے اور ان کی جگہ یوسف بن عمرو نے سنبھالی تو یوسف نے ہشام کو لکھا کہ خالد نے زید سے دس ہزار درم کے عوض ایک مزروعہ زمین خریدی ہے اور زید نے وہ رقم لے کر زمین بھی اس کی تحویل میں دے دی ہے۔ ہشام بن عبدالملک نے زید کو داؤد کے ساتھ اپنے دربار میں طلب کر لیا اور اس بارے میں پوچھ گچھ کی۔ زید اور ان کے ساتھیوں نے قسم کھا کر بتایا کہ معاملہ صرف (زمین کی) پیدوار کی فروخت کا ہوا ہے (نہ کہ زمین کی فرخت کا)۔ ہشام نے ان کی قسم کا اعتبار کرلیا مگر کہا کہ آپ لوگوں کو (گورنر عراق) یوسف کے پاس عراق جانا ہوگا اور اس سلسلے میں اس کے روبرو بات کرنا ہوگی۔ انہیں یہ بات پسند نہ تھی مگر ناچار یہ عراق گئے مگر حضرت زید کے خلاف وہاں کوئی بات ثابت نہ ہو سکی۔ جب انہیں وہاں سے واپسی کی اجازت ملی تو یہ حضرات قادسیہ چلے گئے۔ کوفہ والوں نے حضرت زید کے ساتھ خط و کتابت شروع کی کہ آپ کوفہ واپس تشریف لے آئیں تاکہ خلافت آپ کو دے دی جائے۔ چنانچہ حضرت زید نے کوفہ جانے کا عزم کر لیا۔ دوستوں نے بہت سمجھایا (کہ کوفہ نہ جائیں) مگر ان کی کوئی نصیحت کارگر نہ ہوئی اور زید بن علی اور داؤد بن علی بن عبداللہ بن عباس اور محمد بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کوفہ آکر مقیم ہوئے جبکہ باقی ساتھی مدینہ منورہ چلے گئے۔ اس کے باوجود کہ حضرت زید بن علی خوب جانتے تھے کہ ان کے آباؤ و اجداد کے ساتھ ان کوفہ والوں نے کیا کیا ہے وہ ان بے وفا لوگوں کی باتوں میں آگئے اور اس طرح جنگ کے آثار پیدا ہو گئے۔ الغرض جب حضرت زید کوفہ میں اقامت پذیر ہو گئے اور آپ کے پاس لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو بعض حضرات نے کہا کہ خلافت بطور میراث اور

بطور استحقاق آپ کو پہنچتی ہے۔ پھر توقف کیسا اور سوچ بچار کیسی۔ ہم سب آپ کے فرماں بردار ہیں۔ چنانچہ حضرت زید پھر دعوت میں مشغول ہو گئے۔ مورخین کا بیان ہے کہ آپ کے دست حق پرست پر ۴۰ ہزار افراد نے بیعت کر لی۔ جب والی کوفہ یوسف کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے حضرت زید کو پیغام بھیجا کہ آپ اس شہر سے چلے جائیں۔ حضرت زید نے شہر اس طرح چھوڑنے کے بارے میں کچھ عذر پیش کئے۔ یوسف نے آپ کی منت کی تو آپ قادسیہ چلے گئے۔ کوفہ کے بعض نامور اہل علم و فضل بھی آپ کے پیچھے ہوئے اور وہاں جا کر آپ سے مل گئے۔ ان لوگوں نے آپ سے کہا کہ ہم چالیس ہزار افراد آپ کی کمان میں اپنی جانیں قربان کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور یہاں ہمیں شامیوں کا کسی طرح کا خوف نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ دل مضبوط کریں اور واپس کوفہ چلیں تاکہ ہم دشمنوں سے انتقام لے سکیں۔ حضرت زید نے اگرچہ بہت کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنا عہد پورا نہ کریں گے اور مجھے دشمنوں کے سپرد کر دیں گے انہوں نے اپنا عہد پورا کرنے کی پکی قسمیں کھائیں۔ حضرت داؤد بن علی نے حضرت زید سے فرمایا کہ اے میرے چچا زاد! آپ اہل کوفہ کی ان باتوں سے دھوکے میں نہ آئیں اور ان کے عہد پر ہرگز اعتماد نہ کریں کہ یہ انہی لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے حضرت علی بن ابی طالب سے بے وفائی کی تھی اور بیعت کرنے کے بعد بھی حضرت امام حسنؓ کے کاندھے سے چادر کھینچی اور حضرت امام حسینؓ کے روبرو تلوار سونتی تھی۔ یہ سن کر کوفیوں نے حضرت زید سے کہا کہ یہ شخص آپ سے حسد رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے اہل بیت خلافت کے زیادہ مستحق ہیں۔ ان کوفیوں نے اسی طرح کی اور باتیں کیں یہاں تک کہ حضرت زید ان کوفیوں کے ساتھ کوفہ روانہ ہو گئے اور داؤد بن علی مدینہ منورہ واپس ہوئے۔ جب حضرت زید شہر کوفہ میں داخل ہوئے مسلمہ بن کہیل نے آپ سے خدا کی قسم دے کر پوچھا کہ اب تک آپ کے ہاتھ پر کتنے لوگوں نے بیعت کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ۸۰ ہزار افراد نے۔ مسلمہ نے پوچھا ان میں سے کتنے افراد نے اب تک اپنے اس

عہد کو آخری حد تک نبھایا آپ نے فرمایا تین سو افراد نے۔ مسلمہ نے پھر پوچھا آپ کے دادا آپ سے افضل تھے یا آپ ان سے افضل ہیں۔ حضرت زیدؓ نے فرمایا میرے دادا مجھ سے افضل تھے۔ مسلمہ نے پھر پوچھا کہ وہ دور آپ کے دور سے زیادہ بہتر تھا یا یہ آپ کا دور زیادہ بہتر ہے۔ حضرت زیدؓ نے فرمایا ان کا دور زیادہ بہتر تھا۔ اس پر مسلمہ نے کہا کہ اس دور کے لوگوں نے آپ کے اجداد کے ساتھ وفا نہ کی۔ آپ اس دور کے ان لوگوں سے کیا طمع رکھتے ہیں۔ اب آپ مجھے اجازت دیں تاکہ اس دیار میں آپ کا آسیب میں نہ دیکھ سکوں۔ حضرت زید نے انہیں اجازت دی کہ یمامہ چلے جائیں اور انہیں رخصت کیا۔

اسی دوران حضرت عبداللہ بن حسن نے بھی آپ کو ایک نصیحت آمیز خط لکھا مگر چونکہ مشیت ایزدی حضرت زید کی شہادت سے متعلق ہوگئی تھی۔ (اور شہید ہونا ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا) اس خط کا بھی حضرت زید پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ پھر کوفہ میں لوگوں کو دعوت دینے میں مشغول ہو گئے اور چند مرتبہ قبیلہ میں اس غرض کیلئے تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۲۲ھ کا محرم کا مہینہ شروع ہوا اور اس سال حضرت زید نے اپنے معتقدین سے کہا کہ اپنی استعداد کے مطابق حکومت وقت کے خلاف خروج کرو اور عہد پورا کرو۔ اس دوران سلیمان بن سراقہ باہلی کوفہ سے یوسف بن عمرو (والی کوفہ) کے پاس جو ولایت حیرہ میں تھا گیا اور اس کو حضرت زید اور ان کے ساتھ اہل کوفہ کے مل جانے سے آگاہ کیا۔ یوسف اس تحریک کو کچلنے کے لئے کمر بستہ ہو گیا۔ وہ کوفہ آیا اور کوتوال اور چوبداروں کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ شہر میں پھیل جائیں اور ان کا سراغ لگائیں۔ اسی دوران کوفہ کی بعض مقتدر شخصیات جنہوں نے حضرت زید کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ حضرت زید کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ اللہ پاک آپ پر رحم فرمائے۔ آپ بتائیں کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ان دونوں حضرات کے بارے میں بجز نیکی و خیر کے کلمات کے کچھ نہیں کہتا۔ ان دونوں خلفاء کو جب خلافت کا کام

سونپا گیا انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کیا۔ اس پر ان لوگوں نے
کہا کہ پھر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بنو امیہ نے تم پر ظلم نہیں کیا۔ حضرت زید نے
فرمایا بنو امیہ کو حضرت ابوبکر سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ بنو امیہ نے تو ہم پر بھی اور
خود اپنے نفس پر بھی ظلم کیا ہے اور ہم آپ لوگوں کو فرقان حمید (قرآن [illegible]ید) اور
سنت رسول اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں کہ بدعتوں کو ترک کر دیں۔ [illegible] نہیں
ہے۔ یوسف (والی کوفہ) کو حضرت زید کی اس گفتگو کی بھی اطلاع پہنچ گئی [illegible] نے
کوتوال شہر حکم بن صلب کو حکم دیا کہ ہر محلّہ کے لوگوں پر کڑی نظر رکھیں [illegible] زید
سے نہ مل سکیں۔ حکم بن صلب نے اس فرمان پر عمل شروع کر دیا۔ دوسرے لوگوں کو
حضرت زید کی تلاش تھی اور حضرت زید اس رات فعوبہ بن اسحاق بن زید بن حارثہ
انصاری کی سرائے سے ایک جماعت کے ساتھ مشعل بردار جلوس کی شکل میں (اعلان
انقلاب کرتے ہوئے) نکلے اور لوگ اپنے مخصوص انداز میں "یا منصور امت" کے
نعرے لگانے لگے اور ان کے بہت سے حامی مسجد میں تھے۔ جب دن نکلا تو حضرت زید
نے اہل بیت کی کمی محسوس کی۔ ایک قول کے مطابق پانچ سو افراد اور دوسری روایت
کے بموجب دو سو اٹھارہ (۲۱۸) اشخاص آپ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ آپ اس صورت
حال سے مغموم ہو گئے اور آپ نے فرمایا سبحان اللہ ! کل تو میں نے چالیس ہزار افراد
شمار کئے تھے باقی لوگ کہاں چلے گئے۔ لوگوں نے کہا اے رسول اللہ کے فرزند !
یوسف نے ان لوگوں کو مسجد میں بند کر دیا ہے اور آنے جانے کے راستے پر بھی بندش
لگا دی ہے۔ آپ نے فرمایا لا حول ولاقوۃ الا باللہ ظاہر ہے اس کثیر مجمع ہی سے
آخر مسجد میں کتنے افراد سما سکیں گے۔ ادھر (والی کوفہ) یوسف کوفہ کے نواح میں ایک
ٹیلہ پر کھڑا فوجی دستوں کو یکے بعد دیگرے حضرت زید سے جنگ کیلئے بھیج رہا تھا۔
دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل کافی دیر تک رہے پھر (اچانک) یوسف بن عمرو
ثقفی کے علم بردار نے حضرت زید پر حملہ کیا اور چاہا کہ ان پر شمشیر کا وار کرے مگر
(حضرت زید کے ساتھی) نضر بن خزیمہ سامنے آگئے اور ان کی ایک ہی ضرب سے وہ

علم بردار لڑکھڑاتا ہوا نیچے گرا۔ حضرت زید کناسہ گئے تو دیکھا ایک گروہ پوری طرح مسلح تھا۔ آپ نے اپنے سر مبارک کو ننگا کر دیا اور ایک ہی حملہ سے ان کے درمیان تفرقہ ڈال دیا۔ یوسف بن عمرو ثقفی اسی طرح ٹیلہ پر کھڑا ہوا کوتوال اور چوبداروں کو نام لے لے کر پکارتا اور حضرت زید سے لڑنے کیلئے بھیج رہا تھا۔ حضرت زید ان کو شکست دیتے جاتے اور (کوفیوں کو غیرت دلانے کیلئے) نعرے لگاتے جاتے کہ اے کوفہ والو اپنا وعدہ پورا کرو کہ یہ تمہارے مدد کرنے کا وقت ہے اور بعض بے وفا آپ کی آواز سنتے مگر اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتے تھے۔ ادھر یوسف ثقفی نے سپاہیوں سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جو بھی زید کا سر اسے پیش کرے گا ہزار درہم انعام پائے گا تو سپاہی (اس انعام کے لالچ میں) قتل پر اور زیادہ حریص ہو گئے تھے اور حضرت زید کے ساتھیوں کو قتل کر کے ان کا سر تن سے جدا کر کے یوسف کو پیش کر رہے تھے۔ اس طرح حضرت زید کے ساتھی (تیزی سے) کم ہونا شروع ہو گئے تو حضرت زید نے نصر بن خزیمہ سے کہا کہ کوفہ والوں نے ہمارے ساتھ وہی کچھ کیا ہے جو ہمارے دادا (حضرت امام حسینؓ) کے ساتھ کیا تھا۔ نصر نے کہا اے رسول اللہ کے فرزند میں دوستی نبھا رہا ہوں اور جب تک جسم و روح کا رشتہ قائم ہے میں برابر تلوار چلاتا رہوں گا۔ اب ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ ہم کسی طرح جامع مسجد کے دروازے تک پہنچ جائیں (جہاں ہمارے حامی کافی تعداد میں موجود ہیں) اور اپنے ساتھیوں سے مدد مانگیں۔ کیا عجب کہ وہ لوگ جو بیعت کر چکے ہیں اور وہاں موجود ہیں ہماری مدد کیلئے جامع مسجد سے باہر نکل آئیں۔ چنانچہ حضرت زید حملہ کرتے ہوئے مسجد کے درازہ تک آئے اور جو شامی وہاں کھڑے تھے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے کوفہ والو! ذلت سے فخر کی طرف' غربت سے تونگری کی طرف اور گمراہی سے سچائی اور حق کی طرف لوٹ آؤ۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے کوشش کی کہ مسجد کا دروازہ کھول دیں اور باہر آجائیں لیکن مخالفین میں سے کچھ لوگ مسجد کی چھت کی طرف دوڑے اور اوپر سے ان پر پتھر پھینکنے لگے اور اس طرح ان کے لئے رکاوٹ پیدا کر دی۔ مسجد کے

دروازہ پر شدت سے جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت زید کے حامیوں کی سربرآوردہ شخصیات نصر بن خزیمہ' محارب بن زید بن حارثہ اور زیاد بن عبدالرحمان اپنے ٦٧ ساتھیوں کے ہمراہ اس جنگ میں کام آئے جن کے سروں کو تن سے جدا کر کے یوسف بن عمرو ثقفی کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت زید کے حامیوں کی حالت اب کمزور ہو گئی اور وہ شدید زخمی ہو گئے مگر حضرت زید پوری ثابت قدمی سے لڑتے رہے یہاں تک کہ مخالفین نے تیروں کی بارش شرع کر دی۔ ان میں سے ایک تیر حضرت کی مبارک پیشانی پر لگا۔ آپ گھوڑے سے نیچے گر گئے۔ آپ کو معرکہ کار زار سے اٹھا کر آپ کے حامی اپنی ایک سرائے میں لے گئے اور بذریعہ جراحی تیر آپ کی پیشانی سے نکالنے کی کوشش کی کہ بعد میں آپ کا علاج ہو سکے مگر قضاد قدر کو اور کچھ منظور تھا۔ تدبیر کارگر نہ ہو سکی اور حق سبحانہ و تعالیٰ سے جا ملے۔ انا للله وانا الیہ راجعون آپ کے جسم مبارک کو ایک آبی راستے کے قریب قبر میں دفن کر دیا (ایک روایت کے مطابق لوگوں نے یوسف کے خوف سے آپ کی قبر سطح زمین کے برابر بنائی اور اس پر نہر کا پانی جمع کر دیا کہ پہچانی نہ جا سکے)۔ یوسف نے بہت کوشش کی کہ آپ کی قبر کا پتہ لگائے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بالاخر اس نے ایک غلام کو (جو کھیت میں پانی دے رہا تھا) جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی کہ وہ قبر کا پتہ بتائے۔ اس (نبطی) غلام نے جان کے خوف سے قبر کی نشاندہی کر دی۔ یوسف (والی کوفہ) نے حضرت زید کی لاش کو قبر سے نکالا' سر تن سے جدا کیا اور وہ سر ہشام بن عبدالملک کو (دمشق) بھیج دیا اور باقی جسم برہنہ کر کے کناسہ میں سولی پر لٹکا دیا۔ متعدد روایات سے یہ ثابت ہے کہ جس وقت آپ کے جسم مبارک کو سولی پر لٹکا دیا گیا اسی شب ایک مکڑی نے آپ پر اس طرح جالا بن دیا کہ آپ کے پوشیدہ حصہ کا ستر ہو گیا۔ چار سال تک آپ کو سولی پر لٹکا رکھا گیا۔ جب ہشام بن عبدالملک کا بھتیجا (ولید ثانی بن یزید بن عبدالملک) حکمران بنا تو اس نے والی کوفہ کو لکھا کہ ان کی (حضرت زید شہید کی) ہڈیوں کو جلا کر دریا برد کر دیا جائے۔ حضرت زید کی عمر شریف (شہادت کے وقت)

۴۲ سال تھی۔ بعض ثقہ بزرگوں سے منقول ہے کہ جب حضرت زید کو سولی پر چڑھایا گیا تو انہوں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ (ناراضگی کے باعث) چوبدار کی طرف سے پشت کئے ہوئے اس سے فرما رہے ہیں انا للله و انا الیه راجعون، میرے فرزند کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔

حضرت زید شہیدؒ کے چار بیٹے تھے، یحییٰ، حسین ذوالدمعہ، عیسیٰ موتم الاشبال، محمدؒ

ذکر حضرت یحییٰ بن زید شہیدؒ

آپ کی والدہ کا نام ربط بنت عبداللہ بن محمد الحنفیہ تھا۔ آپ کے والد بزرگوار (حضرت زید شہید) کے ساتھ جب یہ (مذکورہ) واقعہ پیش آیا تو آپ خراسان چلے گئے اور وہاں بلخ میں اپنی سرائے میں قیام کیا۔ جب ہشام بن عبدالملک کا ۱۲۵ھ میں انتقال ہوا اور ولید ثانی حاکم بنا تو والی کوفہ یوسف بن عمرو ثقفی نے نصر سیار کو لکھا کہ یحییٰ کو گرفتار کر کے عراق بھیج دو۔ نصر نے بڑی تلاش اور جستجو کی اور حضرت یحییٰ کے خادم کو پکڑ لیا، اسے دردناک اذیتیں پہنچائیں۔ اور حضرت یحییٰ کے پکڑوانے کو کہا۔ خادم نے انکار کیا تو نصر نے حکم دیا کہ اسے تین سو کوڑے لگائے جائیں۔ خادم نے قسم کھائی کہ اگر ہزار تلواریں بھی اس پر ماری جائیں تب بھی وہ حضرت یحییٰ کے متعلق کچھ نہ بتائے گا نہ ان کی اطاعت سے روگردانی کرے گا۔ خادم کے بیٹے قریش کو جب احساس ہوا کہ وہ اس کے باپ کو جان سے مار دیں گے تو وہ بول اٹھا تم اس بوڑھے کو ایذائیں مت دو۔ میں یحییٰ کو تمہارے حوالہ کرتا ہوں۔ قریش کے بتانے پر نصر سیار نے حضرت یحییٰ کو پکڑ کر نظربند کر دیا اور ولید کو اطلاع دی۔ ولید نے نصر کو پیغام بھیجا کہ یحییٰ کو قید سے آزاد کر دے۔ اس پر نصر نے حضرت یحییٰ کو دو ہزار دینار دے کر کہا کہ وہ خراسان سے نکل جائیں۔ چنانچہ یحییٰ مرو سے سرخش اور وہاں سے نیشاپور تشریف لائے۔ یہاں چند تاجر آپ کی خدمت میں آئے۔ آپ نے ان سے کہا مجھے آپ کے چند سواری کے جانوروں کی ضرورت ہے۔ اس کا جب وقت ہوگا میں ان کی

قیمت ادا کر دوں گا تب آپ وہ سواری کے جانور لے آئیں۔ والی نیشا پور عمرو ابن زرارہ نے نصر سیار کو اطلاع دی کہ یحییٰ نیشاپور آئے ہیں اور انہوں نے یہ اقدام کیا ہے۔ نصر نے اسے پیغام بھیجا کہ میں نے یحییٰ سے طے کیا تھا کہ وہ خراسان میں نہ رہے۔ تو اگر وہ خراسان سے چلا جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اس سے جنگ کرو۔ ادھر عمرو ابن یوسف نے کچھ سوار اور پیادے بھیج دیئے کہ یحییٰ کا تعاقب کریں۔ یہ لوگ جب حضرت یحییٰ کے قریب پہنچے تو انہوں نے کہا کہ ہم یہاں جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے ہیں اور میں خود یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ عمرو نے تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو پکڑ لینے کا فرمان جاری کیا۔ حضرت یحییٰ کے حامیوں نے جو تعداد میں ستر تھے (مستعدی کی حالت میں) اپنے ہاتھ تیروکمان پر رکھ دیئے۔ عمرو ابن زرارہ جنگ چاہتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد حضرت یحییٰ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں عراق جانا چاہتا ہوں مگر اب یہ صورت حال پیش آجانے کے سبب وہاں جانا مشکل لگ رہا ہے۔ آپ لوگ مصلحت کس میں سمجھتے ہیں کہ کدھر کا رخ کیا جائے۔ آپ باہم مشورہ اور استخارہ کے بعد جرجان کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ جانے والوں کی تعداد سات سو تک پہنچ گئی۔ نصر بن سیار کو جب پتہ چلا تو اس نے بھی جرجان کی طرف اپنا رخ موڑ دیا اور مسلم بن الاجود الاردی کو دو ہزار سواروں کے ساتھ بطور مقدمتہ الجیش روانہ کر دیا' جرجان کے اطراف میں جنگ کی نوبت پیش آگئی۔ چاشت کے وقت سے ظہر کی نماز کے وقت تک لڑائی جاری رہی۔ حضرت یحییٰ کے حامیوں نے اس دوران کوشش کی اور مسلم بن الاجود سے اجازت طلب کی کہ نماز ظہر ادا کر لیں اور نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد دوبارہ صف بندی ہو مگر اس کے سپاہ نے قتال شروع کر دیا اور سلیم نے اپنے تیر اندازوں کو حکم دیا کہ تیروں کی بارش شروع کر دیں۔ حضرت یحییٰ کے اکثر سپاہی ان تیروں کی زد میں آکر گرتے گئے یہاں تک کہ ایک تیر حضرت یحییٰ کے بھی لگا اور وہ شہید ہو گئے۔ اس مسلم نا مسلمان نے آپ کے سر مبارک کو تن سے جدا کیا اور نصر سیار کو بھیج دیا اور مسلم بن الاجود نے آپ کے باقی جسم کو دو

دیگر افراد ابو الفضل اور ابو ابراہیم کے ساتھ نصر سیار کے حکم کے بہ موجب جرجان میں سولی پر لٹکا دیا۔ ایک عرصہ بعد جب ابو مسلم خراسانی کا خراسان میں غلبہ ہوا اس نے عزم کر لیا کہ آپ کے جسد مبارک کو سولی سے اتار کر دفن کر دے۔ حضرت یحیٰ کی شہادت سن ۱۲۵ھ میں ارغوا کے مقام پر بروز جمعہ عصر کے وقت واقع ہوئی جبکہ آپکی عمر شریف صرف اٹھارہ سال تھی۔ آپ کا سر مبارک جب ولید کے پاس پہنچا تو اس نے آپ کے سر کو مدینہ منورہ بھیج دیا تاکہ حضرت یحیٰ کی والدہ ربط کے بازو میں دفن کر دیا جائے اور آپکی نسل منقطع ہو گئی۔ انا للله وانا الیہ راجعون

حضرت زید شہید کے دوسرے صاحبزادے حسین ذوالدمعہ' تیسرے صاحبزادے عیسیٰ موتم الاشبال اور چوتھے صاحبزادے محمد تھے۔سید حسین بن زید شہیدؒ بڑے عالم اور دیندار تھے۔ ۸۰ سال عمر پاکر سن ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے۔

ذکر حضرت عیسیٰ موتم الاشبال

حضرت زید شہید کے تیسرے صاحبزادے حضرت عیسیٰ موتم الاشبال کی کنیت ابویحییٰ تھی۔ چونکہ اکثر شیر کا شکار کیا کرتے اس لئے موتم الاشبال آپ کا لقب ہو گیا یعنی شیر کے بچوں کو یتیم کرنے والا۔ موتم اسم فاعل کا صیغہ بمعنی یتیم کرنے والا اور اشبال جمع شبل (شین کا زیر) بمعنی شیر کا بچہ۔

آپ عالم اور شاعر تھے اور ابراہیم قتیل بن عبداللہ محض بن حسن مثنیٰ بن امام حسنؓ کے وصی اور ان کے علم بردار تھے۔ سن ۱۴۵ھ میں ابراہیم کے قتل کے بعد روپوش ہو گئے تھے۔ منصور نے آپ کی تلاش میں اپنے بڑے سراغ رساں بھیجے مگر وہ اس کے ہاتھ نہ لگ سکے تاآنکہ سن ۱۶۶ھ میں آپ نے وفات پائی اور حسن بن صالح نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور خفیہ طور پر آپ کو دفن کر دیا۔ صحیح قول کے مطابق آپ کی عمر ۴۶ سال تھی اس لئے کہ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے وقت آپ ایک

سال کے تھے اور حضرت عیسیٰ موتم الاشبال کے چار صاحبزادے تھے (احمد مختفی، زید، محمد، حسین عصارہ)۔ احمد مختفی عالم زاہد اور فقیہ تھے۔ علم فقہ میں آپ کی ایک تصنیف بھی ہے۔ آپ کی والدہ عاتکہ بنت الفضل بن عبدالرحمان بن عباس بن حارث ہاشمیہ تھیں۔ رشید کے عہد میں قید ہوئے پھر رہا کر دیئے گئے۔ بصرہ میں روپوشی کی زندگی بسر کی اور سن ۲۴۰ھ میں رحلت فرمائی۔

سادات بارہہ و گلاوٹھی و بلگرام

حضرت عیسیٰ موتم الاشبال کے دوسرے بیٹے زید تھے جو شام میں تھے۔ تیسرے بیٹے محمد اور چوتھے حسین عصارہ تھے۔ سادات بارہہ و گلاوٹھی و بلگرام کا نسب حضرت عیسیٰ موتم الاشبال کے تیسرے بیٹے محمد بن عیسیٰ سے ملتا ہے۔ حضرت محمد بن عیسیٰ کے فرزندگان و اخلاف بہت تھے جو اطراف دیار میں پھیل گئے تھے۔ آپ کے ایک صاحبزادے سید علی تھے جن کے صاحبزادے سید حسین اور ان کے صاحبزادے سید علی عراقی اور ان کے صاحبزادے سید حسن اور ان کے سید علی تھے۔ عمدۃ المطالب میں ہے کہ حضرت محمد بن عیسیٰ موتم الاشبال کے بہت اولاد تھی اور یہ لوگ بہت سے شہروں اور ملکوں میں پھیل گئے تھے اور آپ کی تمام اولاد کا نسب علی عراقی بن حسین بن علی بن محمد مذکور کی طرف راجع ہے۔ آپ عراق تشریف لائے اور یہیں اقامت اختیار کر لی۔ اہل حجاز میں وہ عراقی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اپنے پیچھے آپ نے پانچ بیٹے چھوڑے۔ ان میں بعض کی اولاد کم تھی اور بعض کثیر اولاد تھے۔ اب آپ کی بقیہ اولاد دو حضرات سے ہے۔ مختصر عمدۃ المطالب کی رو سے وہ دو ابوالحسن دیمکی (جن کے فرزندگان و اخلاف بہت ہوئے) اور ابو محمد الحسن تھے آخر الذکر ابو محمد الحسن نے دو بیٹے چھوڑے علی اور ابوالطیب عبدالوہاب کہ جنہیں ہبہ کہتے ہیں اول الذکر علی کی اولاد اہواز میں تھی جو چند بھائی تھے اور آخر الذکر ابوالطیب عبدالوہاب کے ایک بیٹا تھا جو قتل ہوا۔ اہواز بصرہ و فارس کے درمیان خورستان کے علاقہ میں ہے۔ یہ سات

شہر ہیں جن کے مجموعہ کو اہواز کہتے ہیں (قاموس)۔

اول الذکر سید علی کے بیٹے سید زید درحقیقت اپنے جد امجد سید زید شہید کے آرائش گلستان و فرزند رشید (و فخر خاندان سادات) تھے۔ ان کے لائق بیٹے سید عمر آسمان سیادت کے مہر درخشاں و فلک نجابت کے ماہ تاباں تھے۔ ان کے فرزند سید یحیٰ سید السادات و مجموعہ کمالات تھے۔ ان کے فرزند ارجمند سید حسین جوہر تیغ شجاعت و شہسوار میدان جوانمردی تھے۔ آپ نے واسط میں سکونت اختیار فرمائی۔ ان کے فرزند رشید سید داؤد جن کی قوت و رعب و دبدبہ بڑے بڑے آہنی پیکروں کو نرم کر دیتا تھا ان کے صاحبزادے سید ابو الفرح واسطی سادات کرام کی برگزیدہ شخصیت تھے۔ خاندان نبوی کے عالم سید عبدالجلیل بلگرامی اپنے نسب نامہ میں لکھتے ہیں لوگوں کا کہنا ہے کہ سید ابوالفرح واسطی کے چار صاحبزادے تھے' سید ابوالفراس' سید ابو الفضائل سید داؤد' سید معزالدین عرف بندہ' سید ابوالفرح واسطی اپنے ان چاروں بیٹوں کے ساتھ کسی سلسلے میں واسط سے باہر نکلے۔ سیر کرتے اور سفر کرتے ہوئے غزنیں تشریف لائے۔ غزنیں کے لوگوں نے آپ کو جانچنا چاہا اور آپ کا امتحان لیا اور آپ کی برکات و کرامات دیکھ کر دل و جان سے آپ کے معتقد ہو گئے۔ آپ نے کچھ عرصہ یہاں قیام کیا پھر اپنے بیٹے سید معز الدین کے ساتھ واسط لوٹ گئے جبکہ آپ کے دوسرے صاحبزادگان ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان میں سادات بلگرام کے جد امجد سید ابوالفراس جانخبیر میں' سید ابو الفضائل' چھاترود میں اور سید داؤد تہن پور میں اقامت پذیر ہوئے۔ سید ابو الفرح واسطی کی قبر واسط میں ہے۔ سید ابوالفراس بن سید ابوالفرح واسطی شجاعت' بہادری و مردانگی میں اسم بامسمیٰ تھے۔ ابو الفراس (ف کے زیر کے ساتھ) بروزن کتاب شیر کی کنیت ہے (قاموس) آپ کے دس فرزند تھے۔ ایک سید محمد تھے جن کے اولاد نہ ہوئی۔ دوسرے سید ابوالفرح ثانی جو اپنے دور کے دانشور اور عظیم رہنماء تھے ان کے صاحبزادے سید حسین فضائل حسنی و خصائل حسینی کے جامع اپنے معزز آباؤ اجداد کے صالح و نیک فرزند تھے۔ کہتے ہیں کہ سب

سے پہلے جس بزرگ نے بلگرام کا قصد کیا وہ یہی سید حسین تھے۔ یہ جب بلگرام کے نواح میں پہنچے تو انہوں نے موضع اینٹولی میں ایک اونچی جگہ اپنا خیمہ نصب کیا۔ اس موضع میں ایک مسلمان تھا جو کافروں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے طور پر کسی طرح حضرت سید حسین کی خدمت میں پہنچا اور حضور ﷺ کی نیاز ایک گائے آپ کو پیش کی۔ حضرت سید صاحب نے اس گائے کو ذبح کیا اور اپنے ساتھیوں معتقدوں کے ساتھ وہ کھانا تناول فرمایا۔ یہ خبر جب بلگرام کے سردار کو پہنچی تو وہ راجہ سانڈی کے پاس استغاثہ لے کر گیا کہ چند مسلمان یہاں آگئے ہیں وہ ہماری گاؤ ماتا کو مار رہے ہیں اور ہمارے دین کی توہین کر رہے ہیں راجہ سانڈی غصہ سے بدحال ہو گیا اور قنوج کے راجہ ٹوڈرمل تنور کے ساتھ مل کر حضرت سید حسین اور ان کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوا سید صاحب نے کچھ جنگ کی لیکن پھر ساتھیوں کی قلیل تعداد کی بنا پر تسخیر بلگرام کا ارادہ ترک فرما دیا۔ سید حسین کے ایک صاحبزادے سید علی تھے جو اپنی سخاوت و شجاعت کے باعث اپنے نام کا مصداق اور امیرالمومنین حضرت علیؓ کے خصائل حمیدہ کو زندہ کرنے والے تھے۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ سید محمد صغریٰ' سید جعفر' سید احمد اور سید معزالدین

ان چار بیٹوں میں سید محمد نے بلگرام میں' سید جعفر نے بڈولی میں' سید احمد نے دہرسو میں اور سید معزالدین نے جاخبیر میں مستقل اقامت اختیار کی' کہتے ہیں کہ یہ سید معزالدین بادشاہ کے رسولدار (قاصد و ایلچی) بنے اس لئے ان کی اولاد رسولدار کے لقب سے مشہور ہوئی۔ انتہی کلامہ (یہاں عبدالجلیل بلگرامی کا کلام ختم ہوا)

بارہہ کے بعض نامور دانشوروں کی تحریروں سے پتہ چلتاہے کہ سید ابوالفرح واسطی اپنے سب بیٹوں کے ہمراہ ہندوستان کیلئے روانہ ہوئے۔ کچھ عرصہ ضلع خراسان میں رہے پھر غزنیں پہنچے۔ یہاں سلطان محمود غزنوی نے آپ کا استقبال کیا اور انتہائی

تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آیا۔ اپنی ایک بیٹی کو حضرت ابوالفرح واسطی کے صاحبزادے سید داؤد کی زوجیت میں دے دیا۔ کچھ عرصہ یہاں قیام کے بعد سید ابوالفرح واسطی نے دہلی جانے کا ارادہ کیا اور لاہور پہنچے۔ یہاں آپ نے کچھ عرصہ قیام فرمایا لیکن بعد میں آپ واسط کی طرف لوٹ گئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے دو صاحبزادے بھی واسط واپس ہوئے۔ اور آپ کے تین صاحبزادے سید داؤد' سید فاضل اور سید فضائل میں سے ہر ایک نے ڈیڑھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ سرہند شریف کے نواح میں سکونت اختیار کی۔ سید داؤد نے تہن گدہ' پائل اور چرکہ میں' سید فاضل نے انبالہ کی طرف اور سید فضائل نے جاج میں قیام فرمایا۔ اور ان کی اولاد ان مقامات کی نسبت سے پھر تہن پوری۔ چھاترودی اور ججیری کہلائی۔ ان تینوں بھائیوں کو جب مزید جمعیت فراہم ہوئی تو یہ شاہی زمین پر قابض ہو گئے۔ جب بادشاہ بہلول لودھی فوت ہوا تو اس کا بیٹا سکندر لودھی تخت نشین ہوا اور جب اس نے انتظام مملکت سنبھالا تو کشمیر و ملتان وٹھٹھہ کے صوبوں سے بادشاہ کیلئے خراج کی رقم اور تحف و ہدایا آنے شروع ہوئے۔ سادات کی فوج نے وہ سارے تحفے مع نقد و جنس اور گھوڑے ضبط کر لئے۔ سلطان سکندر لودھی کو جب یہ خبر ملی تو وہ سخت غصہ میں آگیا اور اس نے پچاس ہزار سوار ان سادات کی سرکوبی کیلئے بھیجے۔ سید بھوا بخاری نے جس کی عمر سو سال سے متجاوز تھی اور جو سلطان بہلول لودھی کا وزیر رہ چکا تھا بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ سادات سے لڑنا اور ان کا خون بہانا اپنی عاقبت خراب کرنا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ پانچ ہزار ہیں' انہی علاقوں سے دس ہزار سوار کا لشکر جرار ان کے ساتھ ہے اور ان علاقوں سے ان کے مزید فوج حاصل کرنے کا بھی امکان ہے تو یہ زیادہ بہتر ہے کہ ان کو شفیع بنا کر ملازم رکھ لیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کے فرمان کے مطابق اس کا ایک مصاحب سلطان خان چند افراد کے ساتھ ان سادات کرام کے پاس گیا اور بادشاہ کی طرف سے انتہائی اعزاز و اکرام کے ساتھ ان تین بھائیوں میں سے ہر ایک کیلئے سہ سہ ہزاری کا منصب پیش کیا اور کہا کہ ہنگامہ و فساد

برپا کرنا آپ کی شان کے لائق و مناسب نہیں ہے۔ آپ کے لئے بہتر ہے کہ بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لیں۔ سادات نے جواب دیا کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی ابتداء خلافت سے آج تک ہم نے کسی کی ملازمت نہیں اختیار کی ہے، ہاں اگر آپ چاہیں تو یہ صورت ممکن ہے کہ جن علاقوں میں آپ کے بادشاہ کے خلاف سرکشی و فساد برپا ہے ان کی سرکوبی کیلئے ہم کام کریں۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم کے مطابق یہ حضرات قصبہ بونی سے سوار لے کر چلے۔ سب سے پہلے گڑھ مکیشتر پر حملہ کیا اور چار ہزار باغیوں کو قتل کیا۔ دوسرے روز ہستنا پور گئے اور دوہزار کو تہ تیغ کیا۔ یہ خبر جب بادشاہ سکندر لودھی کو پہونچی تو اس نے ان کے لئے قیمتی خلعت اور خدمت کیلئے لونڈیاں بھیجیں۔ اور دریائے گنگا و جمنا کے درمیانی علاقوں کے متعلق کہا کہ مفسدوں سے پاک کر کے یہ علاقہ اپنے قبضہ میں لائیں۔ چنانچہ ان بھائیوں نے وہ علاقہ اپنے درمیان اس طرح تقسیم کر لیا کہ سید فاضل دریائے گنگا کے کنارے آباد ہو گئے۔ سید فضائل دریائے جمنا کے کنارے آباد ہو گئے اور سید داؤدان دونوں بھائیوں کے درمیانی علاقہ میں اقامت پذیر ہو گئے۔ جب بابر قلندر بادشاہ تخت نشین ہوا تو تمام ملک میں افراتفری پھیل گئی اور بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اودی پورو پر مانڈل کا راجہ رانا سالکار دس لاکھ سوار و پیادہ فوج کے ساتھ بابر قلندر سے جنگ کیلئے دہلی کی جانب روانہ ہوا ضلع بارہہ میں بھی ان دنوں بڑا فساد برپا ہوا۔ وہاں ہندوؤں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ سید محسن نے کمال بہادری سے بزور شمشیر اس فساد و بغاوت کو فرو کیا۔ یہاں سادات کے ۸۴ بڑے دیہات تھے اور دو ہزار سات سو افراد زمیندار تھے۔ انتھی (بارہہ کے بعض دانشوروں کی تحریروں کا خلاصہ ختم ہوا)

اس عاجز مولف کے پاس ایسا مواد موجود ہے جس میں ثقات کی روایت سے یہ ثابت و متحقق ہے کہ حضرت سید ابو الفرح واسطی پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی کے دور حکومت میں جہاد کی غرض سے سندھ و پنجاب تشریف لائے اور یہاں جہاد کیا۔ جہاد میں فتح و کامرانی کے بعد آپ نے موضع

دہامری میں اقامت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد آپ واسط واپس ہوئے۔ آپ کے صاحبزادگان میں سے سید داؤد' سید فضل' سید فضائل اور سید عوض نے چار مقامات تہن پور' مجہیر چہاترود اور کوندنی میں سکونت اختیار کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سلاطین اسلام نے ان بزرگوں کی اولاد کو ان کی شان کے مناسب نمایاں ترقیوں سے نوازا' اور انہوں نے مختلف موضعوں اور قصبوں کی بنیاد رکھی اور ہندوستان میں جا بجا سکونتیں اختیار کیں۔

تعجب ہے کہ سید عبدالجلیل بلگرامی نے جہاں سید ابوالفرح واسطی کے صاحبزادگان کے نام شمار کرائے ہیں وہاں سید عوض کا نام نہیں لکھا ہے۔ حالانکہ آپ کے چار بیٹوں کا ہندوستان آنا اتنا مشہور ہے کہ بھاٹ اور خوشامدی گویئے تک یہ جانتے ہیں اور گاتے ہیں۔

تہن پوری یکی آبی چہاترودی کلوار
مجہیری جگمگ رہی سرن کوندنی وار

گلاؤٹھی سینٹھ اورباربہہ کے بعض قصبات کے کچھ سادات سیدعوض کوندنی وار کی اولاد سے ہیں۔ انکے بیٹے ہیں شریعت و طریقت کے جامع سیدعلاؤالدین' ان کے بیٹے ہیں خلف الرشید سید فرید' ان کے صاحبزادے ہیں راس رؤس ورئیس سید ولیں۔ ان کے صاحبزادے ہیں خلاصہ اتقیائی کونین سید حسین ان کے بیٹے ہیں مقبول رب العالمین سید تاج الدین' ان کے بیٹے ہیں۔ نیک دل و نیک آئین سید شمس الدین' ان کے صاحبزادے ہیں' ابن آل خیرالمرسلین سید علاؤالدین' ان کے صاحبزادے ہیں۔ مقبول بارگاہ احد سید احمد' ان کے بیٹے ہیں رہبردین متین سید کمال الدین' ان کے بیٹے ہیں شریعت آگاہ سید فتح اللہ' ان کے صاحبزادے ہیں طریقت پناہ سید عبداللہ ان کے صاحبزادے ہیں سیادت و نجابت قرین سید حسام الدین' ان کے بیٹے ہیں' مقبول بارگاہ تعالیٰ و تبارک سید مبارک اور یہ سید مبارک وہ بزرگ ہیں جنہوں نے بابر

بادشاہ کے دور میں قصبہ گلاؤٹھی کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف بخشا اور یہاں تشریف لائے۔ ان کے صاحبزادے ہیں۔ عالی قدر و پسندیدہ سیر سید اکبر اور یہ سید اکبر وہ بزرگ ہیں جن کے نام بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے فرامین جاری ہوئے۔ ان کے صاحبزادے ہیں۔ مقبول جناب باری سید مداری' ان کے بیٹے ہیں مزین باخلاق حسن سید محمد عرف لُمن' ان کے بیٹے ہیں جامع شریعت و طریقت سید امان اللہ' ان کے صاحبزادے ہیں' صاحب دولت و دین سید محمد امین اور یہ سید محمد امین وہ بزرگ ہیں جنہیں اورنگزیب عالمگیر بادشاہ کی طرف سے پلول کی خدمت سپرد تھی اور اسی لئے ان کی اولاد پلولیہ (یاپلولیان) کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کے صاحبزادے ہیں ابن اتقیاء سید محمد رضا ان کے بیٹے ہیں۔ مقبول کبریا سید محمد بقاء اور یہ سید محمد بقاء وہ بزرگ ہیں جن کے ذمہ فوجی خدمات تھیں اور بادشاہ محمد شاہ کے سواران خاص کے رسالہ کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ میں نے اپنے جد امجد سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی سواری کا ایک گھوڑا مرگیا یا کسی معرکہ میں کام آگیا۔ آپ اس گھوڑے کی تلاش میں بڑے فکر مند ہو گئے۔ اسے بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ آخر آپ نے سنا کہ ایک سردار کے پاس ایک گھوڑا ہے۔ مگر وہ اپنی ذاتی برائی اور شرارت و سرکشی کے باعث اس قابل نہیں ہے کہ جس پر سواری کی جا سکے۔ آپ اس سردار کی خدمت میں پہنچے اور اس گھوڑے کی خریداری کا ارادہ ظاہر کیا۔ سردار نے کہا کہ گھوڑا تو موجود ہے مگر کس کی طاقت ہے کہ اس گھوڑے کو کھول سکے اور اس پر سواری کر سکے۔ سید محمد بقاء نے فرمایا کہ پہلے اس گھوڑے کی قیمت مقرر کر لی جائے پھر میں وہ گھوڑا دیکھوں گا۔ سردار نے کہا کہ اس کی قیمت کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ ہم پر تو یہ بھی احسان کافی ہو گا کہ اس گھوڑے کو آپ ہمارے اصطبل سے نکال کر باہر لے جائیں۔ (کیونکہ اس گھوڑے کا ہمارے اصطبل میں رہنا ہمارے لئے درد سر بنا ہوا ہے)۔ الغرض آپ قیمت طے ہو جانے کے بعد اس گھوڑے کے قریب تشریف لائے اور گھوڑے کے کان میں کچھ کہا۔ گھوڑے کا وہ بات سننا تھا کہ آپ کا ایسا مطیع و فرمانبردار ہو گیا کہ وہ

اسے بغیر لگام ڈالے اپنے گھر لے آئے اور پھر ساری عمر اس گھوڑے نے کبھی شرارت و سرکشی نہ کی یہاں تک کہ کبھی خواتین اور بچے بھی اسے کھولتے اور باندھتے تھے۔ ان سید محمد بقاء کے صاحبزادے ہیں جامع شریعت و طریقت اور سزاوار عزت و برتری سید خدا بخش خوشنویس قادری' آپ خوشنویسی کے فن میں ماہر اور یگانہ روزگار تھے۔ اسی طرح تیر اندازی کے بھی مشہور استاد تھے۔ ہمیشہ مراقبہ و مجاہدہ میں مشغول رہتے اور ذکر و فکر جو حضرات صوفیاء کے اشغال سے عبارت ہے اس میں مصروف رہتے۔ نادر شاہ کے واقعہ کے بعد ۱۱۵۲ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ فن خوشنویسی میں آپ کے استاد منشی عبدالکریم تھے جو محمد شاہ بادشاہ کی حکومت میں سرکاری پروانہ نویس ہونے کا اعزاز رکھتے تھے۔ اس فن میں منشی عبدالکریم سے آپ نے تکمیل کی اور دہلی کے اساتذہ سے آپ نے تیراندازی سیکھی۔ آپ جوانی میں ہی پٹنہ عظیم آباد چلے گئے تھے اور وہاں آپ نے خوب ترقی کی۔ حضرت مجیب اللہ شاہ مرحوم قادری ساکن پھلواری سے بیعت ہوئے' ۱۸۴۰ بکرماجیتی میں جبکہ آپ ادھیڑ عمر تھے قحط سالی کے باعث مع قبائل و خاندان قصبہ گلاؤٹھی سے بریلی کی جانب ہجرت کر گئے۔ وہاں آپ نے بڑی عزت کے ساتھ زندگی بسر کی اور ایک عالم آپ کی شاگردی سے فیضیاب ہوا۔ تقریباً" پچیس سال آپ نے وہاں قیام فرمایا۔ اور پھر اپنے وطن مالوف (گلاؤٹھی) واپس تشریف لائے اور وہاں ۱۲۴۴ھ میں انتقال فرمایا۔ اس عاجز نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح نظم کی ہے۔

چو سید خدا بخش عالیجناب — کہ عالم زفیضش شدہ کامیاب
عبادت گزار و ریاضت شعار — مطیع شریعت طریقت و ثار
مرید جناب مجیب اللہ بود — کہ از اولیاء گوی سبق ربود
باورادو اشغال بودش کمال — مراقب الی حضرت ذوالجلال
نکو سیرت و خوب خلق و ولی — ہفتہ بذکر خفی و جلی

بخوشخط نویسی جہاں اوستاد — تبعلیمی تیرو کمان ... ...

پئے فیض عالم رواں سوئے او — مسخر جہاں گشتہ ازخوئے او

بنازم کہ او جد امجد مرا — ازیں نسبتش فیض بجد مرا

بیامرزد اورا خدائے کریم — کند روح اورا بہ جنت مقیم

بعمر نود سالہ آں پاک ذات — مخلد بریں بردہ رخت حیات

ز ذی قعدہ روز دہ و چار بود — کہ آں پاک خو عزم جنت نمود

بتاریخ او گفت ہاتف پگاہ — بہشت بریں باد آرام گاہ

۱۲۴۴ھ

(عالیجناب سید خدا بخش کے فیض سے کثیر مخلوق کامیاب و کامران ہوئی۔ آپ بڑے عبادت گزار تھے۔ بڑی ریاضت فرماتے۔ شریعت کے متبع تھے اور طریقت آپ کا لباس تھا۔ آپ جناب مجیب اللہ کے مرید تھے جو اولیاء میں بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے۔ حضرات صوفیاء کے اور ادو اشغال میں آپ مرتبہ کمال پر فائز تھے اور اللہ پاک کے حضور آپ حالت مراقبہ میں رہتے۔ نیک سیرت خوش اخلاق اور ولی تھے۔ ہمیشہ ذکر خفی و جلی میں مشغول رہتے۔ خوشنویسی میں آپ استاد جہاں تھے اور تیروکمان کے فن کے ماہر، حصول فیض کیلئے ایک عالم آپ کی طرف متوجہ تھا اور دنیا آپ کی خوش اخلاقی سے مسخر تھی۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ وہ میرے جد امجد تھے۔ آپ کی اس نسبت سے مجھے بہت فیض حاصل ہوا۔ اے خدائے کریم تو ان کی مغفرت فرما دے اور ان کی روح کو جنت میں ٹھکانا عطا فرما۔ اس پاک روح نے نوے سال کی عمر میں خلد بریں (جنت) کی طرف سفر اختیار کیا۔

ذوالقعدہ کی ۱۴ تاریخ تھی جب اس پاک خونے جنت الفردوس کا ارادہ کیا۔ وقت سحر غیبی آواز نے ان کی یہ تاریخ کہی۔ بہشت بریں باد آرام گاہ (۱۲۴۴ھ) جنت الفردوس آپ کی آرام گاہ ہو۔ آپ قصبہ گلاوٹھی کی ایک جانب مدفون ہیں۔ آپ کے

صاحبزادے، سادات خاندان کیلئے قابل فخر ہستی اور شریف و معزز گھرانے کے چشم و چراغ سید علی بخش خوشنویس (اللہ پاک آپ کو عزت و نیک نامی کے ساتھ زندہ و سلامت رکھے)۔ آپ کی خصائل حمیدہ و عادات پسندیدہ اتنی زیادہ ہیں کہ زبان قلم ان کے بیان سے قاصر ہے اور عبارت ان کی تحریر سے عذرخواہ۔ آنجناب کی ولادت باسعادت ۱۱۹۵ھ میں ہوئی۔ جب سن شعور کو پہنچے تو سب سے پہلے آپ نے اپنے والد بزرگوار سے خوشنویسی سیکھی اور اس کی تکمیل کی شہر بریلی کے علماء سے آپ نے عربی و فارسی کتب پڑھیں۔ یمین الدولہ سعادت علی خان بہادر کے دور حکومت میں آپ بغرض حصول سند و صحت خط دوبارہ لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں اس دیار کے سردار خوشنویساں بلکہ اس دور کے پیشوائے خطاطان حافظ نور اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر خوب مشق کی اور خط نستعلیق کی تکمیل کی۔ پھر ان استاد خطاطین کی رحلت کے بعد ان کے صاحبزادے حافظ محمد ابراہیم کی خدمت میں رہ کر مزید مشق کی اور استادوں کا درجہ حاصل کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ایام شباب ہی میں آپ منشی خدا بخش خان بہادر کے توسط سے نواب شوکت گنج بہادر کو خوشنویسی سکھانے کیلئے عہدہ خوشنویسی پر مامور ہو گئے۔ یہ منشی خدا بخش خان بہادر ساکن امیٹھی تھے اور کامل تخلص فرماتے تھے اور رئیس فرخ آباد کے نائب مختار سرکار کی ملک اودھ سے متعلق امور کی خدمت بجا لاتے تھے۔ اس وقت سے تاحال کہ ۱۲۷۳ھ کا آخر ہے سید علی بخش خوشنویس بدستور سرکار رئیس نامدار کے ملازم ہیں اور اب ریاست فرخ آباد فائز النور جناب عالی جناب مفضل حسین خان بہادر دام اقبالہ کے وجود سے بہرہ مند و رونق پذیر ہے اور سید علی بخش خوشنویس اسی طرح استادی کے عہدہ پر فائز ہیں اور معزز و محترم ہیں۔ کثیر مخلوق جس نے بذریعہ تلمذ آپ سے فیض حاصل کیا آپ کی ممنون احسان اور آپ کی شائستگی پاکیزہ اخلاق اور پسندیدہ اطوار کی مداح ہے۔ شاعر نے آپ کی مدح میں کہا اور سچ کہا۔

بسر کار رئیس فرخ آباد | علی بخش ایک مرد باصفا ہے
کہ ومہ خلق سے ہیں اس کے راضی | سیادت برتبت باالقا ہے
بہت آقا سے ہے اس کو محبت | نہایت خیرخواہ و با وفا ہے
ثنا خواں فیض کا ہے اس کے عالم | زبان خلق پر اس کی ثناء ہے
وہ سارے خوشنویسوں کا ہے استاد | وہ استادوں کا سارے پیشوا ہے

خوشنویسی گویا وہ آرائش اور نقش و نگار ہے جس سے آپ کے پورے وجود کو مزین کیا گیا ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

دانی کہ خوشنویسی مایاں زبہر چیست
مائیم واسطی و قلم نیز واسطے ست

(تمہیں کچھ معلوم ہے کہ یہ ہماری خوشنویسی کس کے لئے ہے۔ ہم واسطی ہیں اور قلم بھی واسطہ ہے)۔

اس خوشنویسی سے قطع نظر دقیق و نازک خیال مصنفین کی فارسی کتب (مثلاً ظہوری' طغرا' دیوان ناصر) کے معانی و مطالب کی تحقیق میں بھی آپ کو کامل دستگاہ حاصل ہے۔ عربی گھوڑوں اور ہندی و حجازی تلواروں کی شناخت میں بھی آپ استادوں کے سربراہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے رؤساء اور مقتدر امراء جب بھی تلوار یا گھوڑوں کی خریداری کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے آپ سے معائنہ کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی تصنیف رسالہ شمشیر مسمی بذوالفقار من اس کی شاہد ہے۔

مولوی جمیل الدین صاحب شیخپوری سلمہ' اللہ تعالٰی نے اس رسالہ کی تاریخ کے سلسلہ میں فرمایا۔

سید عالی نسب والا تبار　　حسب ارشاد رئیس نامدار
چوں. رسالہ موجزے تالیف کرد　　در بیان تیغہائے آبدار
زد رقم تاریخ تالیفش جمیل　　حسب نام او حسینی ذوالفقار

(رئیس نامدار کے حسب ارشاد حضرت سید علی بخش نے جو عالی نسب ہیں اور بزرگ خاندان سے وابستہ چمکتی دمکتی تلواروں کے بارے میں جب ایک مختصر رسالہ تالیف کیا تو جمیل الدین نے اس کے نام کی مناسبت سے اس کی تاریخ کہی۔ "حسینی ذوالفقار")

"گلدستہ فراست" کے نام سے آپ کا ایک اور مولفہ رسالہ بھی ہے جس میں آپ نے متد اول و عام مزاج گھوڑوں کی شناخت سے بحث کی ہے اور اچھے اور برے گھوڑوں کے بارے میں بتایا ہے۔ یہ تالیف بھی ہمیشہ آپ کا نام زندہ رکھے گی۔ آپ کو چونکہ ائمہ معصومین سے بڑی الفت و محبت تھی اور یہ محبت (ائمہ معصومین) مسلمانوں کیلئے باعث نجات ہے۔ ائمہ کبار کی شان میں مدحیہ اشعار کہنے کی طرف آپ کی طبیعت کا شدید میلان تھا۔ چنانچہ آپ نے اس سلسلہ میں چند رسائل بھی تالیف فرمائے ہیں۔

یہ کمترین خلائق سید محمد حسینی (الملتجی الی اللہ الخالق) انہی سید علی بخش خوشنویس کا بیٹا ہے۔ اس فقیر حقیر کی ولادت بروز بدھ جمادی الاول ۱۲۲۳ھ اول وقت ہوئی۔ چار پانچ سال ہی کی عمر سے اپنے جد امجد سید خدا بخش مغفور کی خدمت بابرکت میں رہ کر ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ یہاں تک کہ جب عمر دس سال ہوئی تو اپنے والد ماجد سید علی بخش کے ساتھ قلعہ فرخ آباد گیا اور وہاں متوسط کتابیں پڑھیں۔ اس وقت ریاست فرخ آباد میں عالی جناب نواب شوکت گنج بہادر مرحوم مسند نشین عزت و اقبال تھے۔ غرضیکہ فارسی کتابیں مثلاً سکندر نالہ، ظہوری، پنج رقعہ اور مینابازار والد بزرگوار سے بکمال تحقیق پڑھیں۔ دیگر کتابیں بھی مثلاً رسالہ ہانسوی، عروض سیفی و رسالہ معمولہ مولوی جامی پڑھیں۔ اس کے بعد مولوی بدل خاں صاحب مرحوم سے جو

ولی کامل اور فقیہ یکتا تھے برکت کے طور پر میزان عربی کے کچھ اسباق پڑھے۔ حصول علم عربی کا شوق پھر اس عاجز کو افضل العلماء و خلاصۃ الاتقیاء حضرت مولوی عبدالحق صاحب گوپاموی کی خدمت فیض موہبت میں لے گیا جہاں اس عاجز نے علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ اس کے بعد مشیت ازلی کو کچھ ایسا منظور ہوا کہ فرخ آباد کی سکونت ترک کر دی اور تکمیل تحصیل علوم کے ارادہ سے شاہجہاں آباد چلا گیا۔ ۱۲۴۰ھ میں شاہجہاں آباد پہنچ کر المشتہر فی الافاق مولانا محمد اسحٰق محدث کی خدمت فیضدرجت سے مستفید ہوا اور کتب احادیث کی سماعت و قرات میں مشغول ہوا اور صحیح بخاری، جامع ترمذی اور مشکوۃ وغیرہ کتب حدیث کی سند لی۔ دیگر علوم کی کتابیں بھی وہاں دوسرے مشہور استادوں سے پڑھیں۔ اس طرح تین سال گزرنے پر اپنے وطن واپس ہوا۔ پھر روزی کی تلاش میں بریلی کی جانب چلا گیا اور کسب معاش میں مشغول ہوگیا۔ اس کے بعد بلند شہر میں اقامت اختیار کی اور سات آٹھ سال راحت و آرام میں گزارے۔ اس دوران اس عاجز نے چند کتب و رسائل تالیف کئے۔ زبان فارسی و قواعد فارسی کا شوق ابتداء عمر ہی سے دامن گیر تھا چنانچہ قواعد فارسی میں رسالہ "جامع القوانین" تالیف کیا۔ قافیہ نظم کے بارے میں ایک رسالہ "ایجاز القوافی" کے نام سے تحریر کیا۔ اردو کی دو مثنویاں "عشق انگیز" اور "عشق آمیز" بھی اس عاجز کی تصانیف ہیں۔ دوستوں کی خواہش پر "حل الحساب" کے نام سے ترجمہ خلاصۃ الحساب زبان ہندی میں تحریر کیا۔ اسی طرح دوسرے چند رسائل بھی اس فقیر کی تالیف ہیں۔ چونکہ انسان کمزور مخلوق ہے اور اسے کسب معاش اور روزی کی تلاش سے چارہ نہیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ۱۲۵۸ھ میں حضرت والد ماجد وطن میں تشریف فرما ہوئے اور آپ نے فرخ آباد جانے کا ارادہ فرمالیا اور اس نیاز مند سے بھی فرمایا کہ اس وقت مناسب یہی ہے کہ تم بھی میرے ہمراہ فرخ آباد چلو۔ چونکہ یہ عاجز ایک عرصہ سے خانہ نشین تھا اور کچھ امور ایسے تھے کہ بغیر کسی کی ہمراہی کے کسی دوسرے شہر کا سفر نہ ہوسکتا تھا حسب الارشاد میں حضرت والد ماجد کی ہمراہی میں فرخ آباد جانے پر آمادہ ہوگیا۔ فرخ آباد پہنچا

تو کچھ تو سابقہ واقفیتیں تھیں اور کچھ جناب موصوف کی وساطت سے حضور رئیس نامدار و امیر عالی مقدار نصیر الدولہ معین الملک نواب تجمل حسین خاں بہادر کی خدمت میں رسائی ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں آپ نے ایسی قدر دانی فرمائی اور طبیعت کو وہ انشراح نصیب ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ دربار گہربار میں زیادہ تذکرہ علمی مسائل' احادیث اور شعر و شاعری کا رہا۔ اس فقیر نے چونکہ علوم متعارفہ میں کافی محنت کی تھی وہ رئیس نامدار اس تحریر و تقریر سے کافی محظوظ ہوئے۔ جب مجھے فرخ آباد میں دو تین ماہ کا عرصہ گزر گیا تو میں نے وہاں سے واپسی کا ارادہ کیا اور رئیس نامدار کی خدمت میں جاکر اجازت طلب کی۔ آپ نے زبان فیض ترجمان سے فرمایا ۔ مابدولت کو تمہارا بعد بار خاطر ہے لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اس سرکار کے موجود ما حضر پر قناعت کرو۔ ہم سپاہی زادہ ہیں اور تمہاری وضع بھی سپاہیوں جیسی ہے۔ یہاں سے نہ جاؤ۔ ہمارے سامنے موجود رہو۔ بہتر طور تمہاری پرورش کا سامان ہوتا رہے گا۔ چونکہ عرصہ دراز سے یہ سرکار اس فقیر کے خاندان کی جائے پناہ اور ٹھکانا رہے تھے اور والد ماجد بھی یہاں مقیم اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے اور دوسرے بھائی بھی یہاں ملازم تھے۔ ان چند وجوہ کی بنا پر حکام وقت کی نوکری کے ارادہ کو عاجز نے ذہن سے نکال دیا اور گوشہ عافیت میں رہنے کو پسند کیا اور اپنے فنون کی تکمیل یعنی تفاسیر و احادیث میں لگ گیا۔ رئیس نامدار نے خطوط نویسی کا عہدہ اس عاجز کو تفویض کیا۔ روزانہ عشاء کے بعد ایک دو رکوع قرآن مجید کی تلاوت فرماتے اور اس کا ترجمہ اس فقیر کی زبان سے سنتے۔ جب تک ان امیر نامدار کی حیات رہی یہ فقیر آرام و راحت اور خوشیوں کی زندگی گزارتا رہا۔ چونکہ چرخ کج رفتار انقلاب حالات کے در پے ہے اور حالات میں بسا اوقات تبدیلی آتی رہتی ہے رئیس نامراد کو جو بیماری لاحق تھی اس میں شدت واقع ہوئی اور میں کیا کہوں اور کیا لکھوں۔ آپ ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۶۴ھ کو اس دار فانی سے دار عقبیٰ کی طرف رحلت فرما گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ۔ آپ کے خادمین اور اہل شہر کو آپ کی رحلت سے کتنا رنج اور غم ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔

اس صدمہ جانکاہ کے سلسلہ میں اس عاجز کے کچھ اشعار ہیں جو پیش خدمت ہیں۔

دریں ماتم سرائے فتنہ را کیست	کز آشوب حوادث بے خطر زیست
ہمہ کار جہاں بے اعتبار ست	خزان ست آنچہ پنداری بہار ست
دریں عالم نشانے از بقا نیست	نہ بینی آنکہ تاراج فنا نیست
دریں عالم ہمہ کس را فنا ہست	نمیرد آنکہ آں ذات خدا ہست
چہ بندی دل بریں دنیائی فانی	کہ خواہی بست رخت زندگانی
چو ناچار است از بگسستن دل	برین و آں نباید بستن دل
بہ پیشت داستانے می نگارم	غم جان جہانے می نگارم
قلم کو آں بیاں رای نگارد	ز چشمش اشک حسرت می در آرد
زمیر الدولہ آں نواب مرحوم	جہانے از وفاتش گشتہ مغموم
رئیس نامدار فرخ آباد	ہزاراں مغفرت بر جان او باد
تجمل داشت ازنامش نگینش	نمایاں فر اقبال از جبینش
چو آثار سعادت از جبیں یافت	مورخ سال میلادش ہمیں یافت
زہنگام رضاعت تا جوانی	ریاست می نمود و حکمرانی
اگر دفتر ز اوصافش نگارند	سزای وصف او گفتن نیا رند
اسکندر ہزاراں صولتے داشت	ریاست از و جودش عظمتے داشت
بہ حسن وضع رعنائی جہاں بود	بلطف و خلق در عالم نشاں بود
مسخر عالم از خوئے کریمش	جہاں شاداں ز الطاف عمیمش
شجاعت را بزورش افتخارے	ز اخلاقش سخاوت پیشکارے
اگر در متش درویش رفتے	ز اعزازش بسان گل شگفتے

باکرام و بلطف و مہربانی　　باہل علم کر دے قدر دانی
کسان شہر ازد خوشنود بودند　　دعا ہا در حق او می نمودند
نیا مد بردلی ازوی غبارے　　نہ بردہ سائل ازوی انتظاری
مثال بلبل خوش داستانی　　بہر فن داشتے خوشتر بیانی
گہی علم حدیث و فقہ و تفسیر　　بہ آئین مبیں می کرد تفسیر
گہی تقریر میکر دی مسائل　　کہ دلہا سوئے او میگشت مائل
گہی از طب مطالب یاد میکرد　　گہی حال کواکب یاد میکرد
گہی از موسقی اسرار می گفت　　گہر در رشتہ اظہار می سفت
چناں در موسقی و سازش اعجاز　　کہ او ستادان بشا گردیش ممتاز
بمردم خرم و خندان شسے　　چو طوطی از تبسم لب بہ بستے
دل مائل بہ خوبان جہاں داشت　　بدل خار فراق گل رخاں داشت
باشعار خوش و دلچسپ و رنگیں　　بمجلس ریختی طرح نو آئیں
بطرح نو غز لہا را بگفتی　　در معنی بہ سلک نظم سفتی
بدرد دل گہی اشعار خواندی　　گہر ہای معانی بر فشاندی
بہ فن شاعری طبع رسا داشت　　مزاج نکتہ سنج و نکتہ زا داشت
بہرشب بزم جان افروز کردی　　شب عیش و ترنم روز کردی
گہی در جلوتی باہم نشیناں　　گہی در خلوتی بامہ جبیناں
گہی از عشقبازی داستانی　　گہی از حال محبوباں بیانی
بہر شب بزم رنگین ساز کردی　　در عشرت بخود برباز کردی
بعلم و عقل دانای زماں بود　　فلاطون و ارسطوی جہان بود
ہنرمنداں بعہدش خرم و شاد　　بعالم رفتہ نام فرخ آباد

فیقانش که نیکاں جمله بودند — پیشیش جان نثاری می نمودند

ل جان نثاراں لطفها داشت — بہر ساعت ہزاراں لطفها داشت

ام و مراحم خاص میکرد — گہی الطاف و گہہ اخلاص میکرد

یں عیش و تنعم از دل و جان — مدامش بود شغل درس قرآں

تفاسیر کلام الله شنیدی — بغور و فکر بر آیت رسیدی

ز رحمت آیتی چوں آمدی پیش — شدی شاداں و فرحاں در دل خویش

در احوال قیامت ذکر می شد — ز روز حشرد نشرش فکر می شد

چو پیشش آمدی ذکر قیامت — بدل کردی اثر فکر قیامت

بنا گہہ از قضائی آسمانی — که دروی اختیار کس ندانی

بصد حسرت سوئی دار الجناں رفت — فغا نہا سوئی ہفتم آسماں رفت

چو بست و پنج سال از عمر او رفت — ز دنیا با ہزاراں آرزو رفت

چو آں جان جہاں زیر زمیں رفت — صدائی گریہ بر چرخ بریں رفت

ہزار افسوس آں جان جہان مرد — بصد حسرت بصد غم نوجواں مرد

چو' از درد و غم آمد انتقالش — شدہ "از درد و غم" تاریخ سالش

۱۳۶۴ھ

بہ جنت جائے آں عالیجناب ست — بفضل ایزدی غفراں ماب ست

(مولف رسالہ ھذا سید محمد حسینی واسطی نے اپنے محسن نصیر الدولہ معین الملک نواب تجمل حسین خاں بہادر کی وفات حسرت آیات پر ان مذکور بالا پچپن اشعار میں اپنے غم و اندوہ کا بلیغ اظہار فرمایا ہے جن میں اس عالم کی بے ثباتی و ناپائیداری' مسئلہ فنا و بقاء' رئیس فرخ آباد نواب تجمل حسین خاں کے اوصاف حمیدہ' ان کی علم دوستی و مختلف علوم و فنون میں ان کی مہارت' ان کی قدردانی و غریب پروری' ان کی شعر گوئی میں مہارت اور بذلہ سنجی' ان کی محفل آرائی اور نکتہ سنجی' فن موسیقی پر ان کی دسترس

اور جلوت و خلوت کی رنگینیاں، ان کی مثالی عقل و دانائی و فلاطون و ارسطو طبیعت، ان کی ہنر شناسی و محبوبیت اور رفقاء و قدردانوں کی سرپرستی، جان نثاروں پر ان کا لطف و کرم اور مراحم خسروانہ، درس قرآن سے ان کا شغف اور تفسیر کلام اللہ سے ان کا پیار آیات رحمت سن کر ان کی طبیعت کی شادمانی اور احوال قیامت سنکر ان کی رقیق القلبی اور فکر مندی اور بالآخر کارکنان قضا و قدر کے سامنے ان کی بے بسی اور ۲۵ سالہ جوان موت۔ آخری تین اشعار میں حضرت مولف فرماتے ہیں : ہزار افسوس کہ دنیا کی وہ محبوب شخصیت ختم ہوئی۔ کتنی حسرت اور کتنا غم ہے اس جوان موت پر! ان کا انتقال چونکہ درد و غم سے وقوع پذیر ہوا تو "از درد و غم" ۱۲۶۳ھ ان کا سال وفات قرار پایا۔ تو اللہ پاک کے فضل و کرم سے جو گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ عالی جناب نواب تجمل حسین خان کا مستقر جنت الفردوس ہو)۔

ان امیر نامدار (نواب تجمل حسین خاں) کے انتقال کے بعد ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۳ھ نواب امداد حسین خاں بہادر ناصر جنگ مرحوم کے صاحبزادے نواب عالی جناب معلی القاب نواب تفضل حسین خاں بہادر نصرت جنگ زیب مسند آرائی ریاست فرخ آباد ہوئے۔ ان عالی مرتبت فرمانروا کی پسندیدہ حلم و مروت، اچھے اخلاق، ذاتی شجاعت و فطری سخاوت کا کیا کہنا۔ اے اللہ ان کا اقبال و مرتبہ زیادہ فرما اور ان کے اجلال و دبدبہ کو دگنا کر دے۔

یہ عاجز ان امیر نامدار کے عہد حکومت میں ترک سواروں کی رسالہ داری میں خاص نویسی کے عہدہ پر فائز ہے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ ان عالی مرتبت امیر کو باکرامت زندہ سلامت رکھے۔ (نقل) ابھی چار ماہ ہی کا عرصہ گزرا تھا کہ ۲۲ نومبر۱۸۵۶ء رئیس نامدار، دام اقبالہ، کے اشارہ اور مولوی محمد وزیر علی صاحب نائب سرکار کی تجویز پر ریاست سے چند مفسدوں کو نکالنے کے سلسلے میں بولر صاحب بہادر ایجنٹ قلعہ والا تشریف لائے۔ اس پر عجیب و غریب بے چینی اور خوف و ہراس کی کیفیت پیدا ہوئی۔

ہر شخص کو اپنی جان کا خوف لاحق ہوگیا۔ ہر آدمی خائف و ہراساں و لرزاں نظر آتا تھا۔ جو لوگ مشہور پہلوان تھے ان تک نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا۔ کیا عرض کروں! اس عاجز نے بھی اللہ پاک کے فضل پر نظر کرتے ہوئے گوشہ عافیت میں بیٹھ جانے ہی کو اختیار کیا کہ اچانک ایک دن سرکاری اہلکار نے دروازہ پر آکر مجھے دستک دی۔ میں نے دروازہ پر آکر اس سے صورت حال دریافت کی تو اس نے قدرے سخت لہجہ میں مجھ سے کہا کہ حضور والا (بولر صاحب بہادر ایجنٹ) اور نائب صاحب (مولوی محمد وزیر علی صاحب نائب سرکار) نے آپ کو بلایا ہے۔ چونکہ مجھ سے کوئی قصور سرزد نہ ہوا تھا اور نہ ہی میں نے کسی جرم کا ارتکاب کیا تھا تو مجھے اپنی ملازمت ختم ہونے کا اندیشہ تو نہ تھا تاہم جیسا کہ حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ نے اپنی کتاب "گلستان" میں لومڑی کی حکایت بیان کی ہے مجھے دوسرے طرح طرح کے اندیشے ضرور لاحق ہوگئے۔ بظاہر خوش خوش لیکن ڈرا ڈرا دل لیکر میں دربار کی طرف چل پڑا۔ جب عالی مرتبت کی ڈیوڑھی پر پہنچا تو پتہ چلا کہ صاحب بہادر (بولر صاحب بہادر ایجنٹ) واپس تشریف لے جا چکے ہیں۔ بہرحال مولوی صاحب نائب سرکار کی شرف خدمت سے مشرف ہوا اور دور جا کر بیٹھ گیا۔ آپ نے ہاتھ کے اشارہ سے مجھے قریب آنے کو کہا۔ جب میں قریب گیا تو آپ نے میرے کان میں کہا کہ حضور والا (بولر صاحب بہادر ایجنٹ) آپ کے متعلق ذہین' امانت دار اور دیانت شعار جیسے الفاظ استعمال فرما رہے تھے اور حکم صادر فرمایا ہے کہ مابدولت خانگی امور اور جائیداد سے متعلق کام کی نگرانی آپ کے سپرد کر دیں تاکہ کامل احتیاط' ذہانت و دانشمندی سے یہ امور چلائے جاسکیں۔ اس عاجز نے چند وجوہ کی بنا پر یہ ذمہ داری قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی مگر حضرت والا نے قبول نہ فرمایا اور ہر طرح مجھے تسلی دی اور میری تقویت فرمائی۔ بالاخر میں نے قبول کرلیا اور حسب الحکم اس سرکاری خدمت سے نوازا گیا۔ میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ اس کام میں کسی طرح کی خیانت نہ ہونے دوں گا۔ اب جبکہ اس عاجز کی عمر

۵۱ سال ہے اور مزاج کی کمزوری اور طبیعت کا ضعف لاحق ہوگیا ہے اور یہ شعر جسے تذکرہ نویسوں نے مرزا خلقی کیطرف منسوب کیا ہے زبان پر ہے۔

رسید بر سر بالیں بوقت نزعم یار
چراغ زندگیم شام مرگ روشن شد

(میرا محبوب میرے سرہانے ایسے وقت پہنچا جب مجھ پر نزع کا عالم طاری تھا۔ میری زندگی کا چراغ موت کی شام ہی روشن ہوا)

اور مرزا اسد اللہ خان غالب کا یہ اردو شعر ذہن میں ہے۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

یہ عاجز اس سرکار دولت مدار میں انتہائی دلجمعی سے سپرد کردہ امور کی انجام دہی میں سرگرم عمل ہے۔ حق سبحانہ و تعالٰی اس سرکار کو کامیاب و بامراد رکھے۔ بحرمتہ النبیؐ و آلہ الامجاد

اس عاجز کے دو چھوٹے بھائی ہیں۔ (نمبر۱ مولوی امیر بخش اور نمبر۲ سید حیدر بخش)۔ مولوی امیر بخش طبیب و خوشنویس ہیں اور اخلاق حسنہ سے آراستہ۔ فرخ آباد کے رئیس نامدار کی سرکار میں طبابت کے عہدہ پر فائز ہیں اور صاحبزادگان کی استادی کے فرائض پوری عزت اور احترام سے نبھا رہے ہیں۔ آپ کے اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ سے متاثر کثیر مخلوق آپ سے فیضیاب ہو رہی ہے۔ سلمہ اللہ تعالٰی۔ اور عاجز کے دوسرے چھوٹے بھائی سید حیدر بخش ہیں کہ رئیس نامدار کے مصاحبین میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا ہے جس کا نام غلام اہل بیت ہے جس کی ولادت شہر فرخ آباد میں ۱۲۶۸ھ میں ہوئی۔ اللہ تعالٰی ان دونوں باپ بیٹوں کی حفاظت فرمائے۔

اس عاجز کا نکاح قاضی محمد اصلح الدین ساکن قصبہ سیانہ کی صاحبزادی سے ۱۲۳۶ھ میں منعقد ہوا لیکن اس زوجہ سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ البتہ بطن حرم سے حیات بخش، ثبات بخش اور الٰہی بخش کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے انہیں علم کا خاصا حصہ دیا اور خدا انہیں سلامت رکھے موجود ہیں۔ اور (میرے خسر صاحب) قاضی محمد اصلح الدین، مولانا شیخ نظام الدین جرجانی کی اولاد سے ہیں۔ حکام وقت کی طرف مقدمات کے فیصلوں سے متعلق عہدہ پر جسے منصف و صدر امین کہتے ہیں فائز تھے اور بڑے نامور تھے۔ ظاہر شریعت کے متبع اور بڑے متقی انسان تھے۔ اس عاجز نے ان کی تاریخ وفات اس طرح کہی ہے۔

اصلح الدین محمد قاضی	بود ازو بر که و بر مهه راضی
زاہد و عابد و عالم عامل	مفتی فقه و فرائض کامل
عهده فصل قضا با میداشت	راضی از خویش و رعایا میداشت
چوں بفردوس باسائش خفت	"زیں جهاں کرد قضاء" ہاتف گفت

۱۲۵۲ھ

(قاضی محمد اصلح الدین سے ہر چھوٹا بڑا خوش تھا۔ وہ پاکباز، عبادت گزار اور علم و عمل والے تھے۔ علم فقہ کے مفتی تھے اور علم فرائض پر عبور رکھتے تھے۔ مقدمات کے فیصلے کرنے کے کام پر مامور تھے اور اس میں ان سے کیا اپنے اور کیا رعایا سب مطمئن تھے۔ انہوں نے جب انتقال فرمایا اور فردوس بریں میں جا سوئے تو ہاتف غیبی نے ان کی تاریخ کہی زیں جہاں کرد قضاء)

۱۲۵۲ھ

قاضی محمد اصلح الدین کے والد بزرگوار قاضی محمد صلاح الدین علم فقہ اور علم

فرائض میں کامل و وسیع دستگاہ رکھتے تھے۔ شرح و قایہ اور فقہ کی دیگر درسی کتابیں بڑی خوبی سے پڑھایا کرتے تھے۔ آپ کی تصنیف ایک کتاب "جامع المناقب" کے نام سے ہے جس میں آپ نے مختلف مسائل جمع فرمائے ہیں۔ ۱۲۲۸ھ کے قریب آپ نے انتقال فرمایا۔

قاضی محمد اصلح الدین کے صاحبزادے محمد اعزالدین ابتداء حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہاں خوب ترقی کی۔ پھر چودہ پندرہ سال بعد اپنے وطن واپس لوٹے۔ اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد سیانہ کے قاضی بنے اور بخوبی یہ کام انجام دیا۔ ستر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ خوش اخلاق اور مہذب تھے۔ آپ کی تاریخ وفات اس طرح کہی گئی۔

چوں اعز الدین محمد از قضا — زیں جہاں بے بقا کردہ سفر
بہر سال فوت آں عالی مقام — گفت رضواں "قاضی نیکو سیر"
۱۲۶۷ھ

(قضائے الٰہی سے جب محمد اعز الدین نے اس جہان فانی سے سفر اختیار کیا تو اس عالی مقام کی سال وفات کیلئے رضوان جنت نے کہا قاضی نیکو سیر ۱۲۶۷ھ کہ وہ نیک سیرت قاضی تھے)

اب ان قاضی محمد اعزالدین کے فرزند محمد عطاء اللہ جو جوان صالح، خوش سیرت و خوش وضع ہیں سیانہ کے قاضی کے عہدہ پر مامور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے۔

مخفی نہ رہے کہ اس عاجز کا مذہب سنت جماعت ہے۔ متبع حدیث اور جس مسئلہ میں حدیث نہ ملے اس میں امام اعظم ابوحنیفہ کوفی کا مقلد ہوں اور سچے دل سے یہ ارادہ ہے کہ کہاں کوئی صاحب باطن ملے اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر (بذریعہ بیعت) سلسلہ بہشیہ چشتیہ میں داخل ہو جاؤں۔ اے اللہ میری آرزوئیں پوری فرما

اور میرے اعمال کی اصلاح فرما۔

قرآنی آیت کل من علیها فان کے بموجب جب ہر فرد بشر کو موت کا جام پینا اور حیات مستعار کے جامہ سے کنارہ کش ہونا ہے تیس سال سے زائد عرصہ ہوا جب میں یہ حدیث پڑھ رہا تھا اکثر اعمار امتی بین الستین و السبعین (میری امت میں سے اکثر کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہوں گی)۔ تو دل میں یہ بات القاء ہوئی کہ اس عاجز کی عمر تقریباً ۶۵ سال ہوگی تو لفظ محمد بخش مرحوم کے عدد کے مطابق میرا سال وفات ۱۳۸۸ھ ہوگا اور صحیح بات تو اللہ ہی جانتا ہے جو ابتداء پیدا کرنے والا ہے اور آخر میں جس کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ یااللہ! اس بندۂ مسکین کے گناہوں کو معاف فرما اور اپنی خصوصی رحمت سے مجھے بخش دے۔ الٰہی بطفیل شفیع المذنبین رحمته للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سکرات موت' منکر و نکیر کے سوال' قبر کی وحشت' لحد کی تنگی اور روز محشر کے خوف سے نجات عطا فرما اور ابدی جنت عنایت فرما۔ یا اللہ تو غفور ہے اور تو رحیم و ودود ہے۔

چو بسن ہست رخت زندگانی   چہ بندم دل بریں دنیائی فانی
چو عمر امت خیر النبیین   بود اکثر میان شصت و سبعین
مرادر دل زسی سال ایں خیال ست   کہ عمرم نیز شصت و پنج سال ست
چو سال رحلتم گردید معلوم   دلم گفتا "محمد بخش مرحوم"
۱۳۸۸ھ

الٰہی بندہ شرمندہ ام من   ز خجلت سر بپا افگندہ ام من
نباشم بعد مرگ خود ہراساں   بود نزع و سوال قبرم آساں
زہول محشرم جان در گداز ست   ولی فضلت الٰہی کارساز ست
چہ باشد کز پئی ذات پیمبرؐ   گناہم عفو گردد روز محشر
گناہم را الٰہی عفو سازی   بایں تشریف سید را نوازی

(جب زندگی کا ساز و سامان بالآخر بندھنا ہے تو پھر اس فانی دنیا کے ساتھ دل کیوں لگاؤں۔ چونکہ حضرت خیر الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی عمریں اکثر ساٹھ اور ستر کے درمیان ہوں گی تو مجھے گذشتہ تیس سال سے یہ خیال دامنگیر ہے کہ میری عمر ۶۵ سال ہوگی۔ اس طرح جب مجھے اپنا سال وفات معلوم ہوگیا تو میرے دل نے کہا (کہ تیرا سال وفات) ۱۲۸۸ھ محمد بخش مرحوم (کے لفظ میں) ہے۔ الٰہی! میں (اپنے گناہوں کے باعث) شرمندہ ہوں اور ندامت سے میرا سر گویا پاؤں میں پڑا ہے۔ (الٰہی کرم فرما کہ) موت کے بعد میں ہراساں نہ ہوں۔ نزع کو اور قبر کے سوالات کو میرے لئے آسان فرما دے۔ محشر کے خوف سے میرا دل پریشان ہے لیکن یا الٰہی تیرے فضل سے میرا کام بن جائے گا۔ کیا اچھا ہو کہ تو اپنے پیارے پیغمبرؐ کے ذات گرامی کے طفیل محشر کے دن میرے گناہوں سے درگذر فرما دے۔ الٰہی میرے گناہوں کو معاف فرما اور سید کو اس شرف سے نواز دے)۔

اس سے پیشتر اس عاجز نے اپنے نسب نامہ کو اردو نظم میں تحریر کیا تھا۔ چونکہ اسلاف کرام کے حالات بڑی شرح و بسط کے ساتھ لکھ دیئے گئے ہیں تو یہاں اس نظم کی تحریر کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اختصار کے پیش نظر وہ شجرۂ نظم پیش خدمت ہے۔

ہے کسکو میرے ساتھ نسب میں برابری ۔۔۔ طوبیٰ سے میرے شجرہ کو ہے فوق و برتری
ختم الرسل(۱) ہیں شجرۂ علیاء کے میری اصل ۔۔۔ تابندہ آفتاب سپہر پیمبری
بنت الرسول فاطمہ زہرا بتول پاک ۔۔۔ مشہور جن و انس بپا کیزہ گوہری

ہے اس کا زوج شیر خدا(۲) مرتضیٰ علیؑ | حامی دین و قامع بنیان خیبری
فرزند اسکا خامس آل عبا(۳) حسینؑ | کی جس نے بحر صبر و رضا میں شناوری
زین العباد(۴) آدم آل حسین سبط | اسود حجر نے جس کا کیا فیصل داوری
زید شہید(۵) کشتہ تیغ جفائے دہر | مانند جد متاع شہادت کا مشتری
عیسیٰ(۶) کہ جس کا موتم الاشبال تھا لقب | کرتے تھے صید شیر بفرط دلاوری
سید محمد اشرف(۷) امجاد اتقیاء | ذوالمجد ذوالکرم گہر کان سروری
سید علی(۸) کہ مخزن علم و کمال تھے | فرخندہ اختر فلک جاہ و برتری
سید حسین(۹) نخل گلستان ارتضیٰ | آرائش بہار گلستان رہبری
سید علی عراقی(۱۰) کہ مشہور خلق تھے | پائے عراق نے قدم اسکے سے برتری
سید حسین ابن علی(۱۱)، سید علی(۱۲) | تابندہ جس کے چہرہ سے انوار حیدری
عالی جناب سید والا مقام زید(۱۳) | پائی جہاں نے خلق سے جسکے معطری
سید عمر محیط(۱۴) سعادت کے درناب | اسلاف ساں سلالہ ارحام عنصری
زید سوم(۱۵) کہ معدن فضل و کمال تھے | ممتاز روزگار سزاوار برتری
یحییٰ(۱۶) کہ زندہ کرتے تھے دلہائے مردہ کو | عاجز ہے اسکے وصف میں نطق سخنوری
سید حسین(۱۷) مفتخر خاندان فضل | شمع جہاں فروز شبستان رہبری
داؤد(۱۸) نرم کرتے تھے آہن دلوں کے دل | با صد کمال قوت معنی و ظاہری
والا نسب ابو الفرح واسطی(۱۹) نژاد | ماحی نقش بدعت و آثار کافری

نوٹ: ابوالفراس اور ابوالفرح ثانی درمیان میں رہ گئے ہیں۔

حضرت سید ابوالفرح واسطی حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انیسویں پشت میں ہیں

سید عوض(۲۰) سلالہ امجاد نامدار | عالم میں متصف بہ سخا و دلاوری
سید علاؤ الدین(۲۱) بہ سمو و علو قدر | مصداق نام لائق اعزاز و برتری
سید فرید(۲۲) گوہر یکتائی بحر فضل | ہے کسکو اسکے فضل و کرم سے برابری

من بعد مقتدائی جہاں ویس(۲۳) ذوالکرم — عالی نزاد حاکم شرع پیمبری

سید حسین(۲۴) زبدۂ سادات واسطی — کرتے تھے آفتاب نمط ذرہ پروری

من بعد تاج دین(۲۵) گہر فرق افتخار — تھی مفتخر بفقر بعین تونگری

من بعد شمس دین(۲۶) کہ فروغ نگاہ سے — رکھتے تھے خلق میں اثر کیمیاگری

سید علاء دین(۲۷) نظر اسکی سے دائما — تھے مشتری متاع سعادت کے مشتری

من بعد اس کے سید احمد(۲۸) ہیں باصفا — ذات جمیل اس کی ہے تعریف سے بری

پھر فخر دو د مان سیادت کمال دین(۲۹) — باصد کمال و حشمت و جاہ و خرد وری

من بعد اس کے حضرت فتح اللہ(۳۰) نامدار — تھی جس کو ملک دیں پہ سراسر مظفری

من بعد اس کے حضرت عبداللہ(۳۱) مقتدا — تھے باذل و سخی و جوانمرد اور جری

سید حسام دین(۳۲) کہ باب حسام خود — عالم سے محو کرتے تھے آثار کافری

سید مبارک(۳۳) اشرف سادات باوقار — ذوالفخر ذوالمکارم اہل المفاخری

عالیجناب سید اکبر(۳۴) خجستہ فر — ہیں جسکے نام پر لکھے اسناد اکبری

سید مداری(۳۵) نجم شریعت کے تھے مدار — دائر مراد پر نہ ہو کیوں چرخ دائری

سید محمد(۳۶) اسکا تھا فتحن لقب بہ خلق — جد القبیلہ تھے بہ لبان برادری

حق انتباہ سید امان اللہ(۳۷) مقتدا — باعلم و فضل رکھتے تھے وضع سپہ گری

سید امین(۳۸) کہ موتمن شاہ عصر تھے — رکھتے تھے تن پر خلعت زیبائی سروری

سید رضا(۳۹) پھر ان کے محمد بقا(۴۰) پسر — فرزند ان کے میر خدا بخش قادری(۴۱)

پھر فخر روزگار علی بخش(۴۲) نامدار — ہے جسکو خوشنویسی میں اعجاز برتری

وہ نخل سایہ دار کرامت ہے دائما — سر پر ہمارے اسکے رہے سایہ گستری

سید محمد(۴۳) اب ہوں میں عالم کا انتخاب — مولا سے ملتجی ہوں بصد عون و یاوری

تھے یک ہزار و دو صد و ہفتاد و چار سال — لکھا جو میں نے شجرۂ علیا بشاعری

اب سید امان اللہ بن سید نتھن (دیکھئے شجرہ مذکورہ بالا نمبر ۳۷) کے صاحبزادگان سید محمد امین اور سید فیض اللہ کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ سید محمد امین کے تین فرزند تھے۔ نمبرا سید محمد رضا نمبر ۲ سید نور محمد اور نمبر ۳ سید سعد الدین۔ (ا) سید محمد رضا کے چار بیٹے تھے۔ (نمبرا سید محمد بقاء نمبر۲ سید حسن رضا نمبر ۳ سید محمد عطاء اور نمبر ۴ سید نور الھدیٰ)۔ نمبرا سید محمد بقاء اس عاجز مولف کے دادا سید خدا بخش کے والد تھے۔ اور ان کے اور کوئی دوسرا بیٹا نہ تھا۔ نمبر ۲ سید حسن رضا۔ ان کے ایک بیٹا امام بخش تھا جسکا انتقال بریلی میں ہوا اور وہیں مدفون ہے۔ ان امام بخش کے ایک بیٹا حسین بخش تھا جس کا ۱۳۵۲ھ میں بیسلپور تعلقہ ضلع بریلی میں انتقال ہوا۔ ان کی زوجہ مسماۃ بولن ابھی حیات ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی قبرتیار کرالی ہے۔ نمبر ۳ سید محمد عطاء۔ ان کی دو صاحبزادیاں تھیں : ایک اس عاجز مولف رسالہ کی دادی اور دوسری نانی تھیں۔ نمبر ۴ سید نور الھدیٰ۔ یہ خوشنویس، خوش مزاج اور ماہر و بے مثل تیرانداز تھے۔ ۱۳۰۰ھ کے قریب بریلی میں انتقال فرمایا اور شاہ دانا ولی کے پہلو میں مدفون ہیں۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک بیوی سے سید کرامت علی اور دوسری سے سید ولایت علی۔ جن کا شہر بریلی ہی میں نکاح ہوا۔ سید ولایت علی تو لاولد ہی انتقال فرما گئے۔ البتہ سید کرامت علی جنہوں نے گلاؤٹھی میں ۱۳۴۵ھ میں انتقال فرمایا دو بیٹے اپنے پیچھے چھوڑے : سید نعمت علی اور سید الفت علی۔ سید نعمت علی تھانہ دار اور داروغہ کے عہدہ پر فائز اور ممتاز رہے اور غازی پور میں ۱۳۷۰ھ میں انتقال فرمایا اور اپنے پیچھے کوئی بیٹا نہ چھوڑا جبکہ سید الفت علی اپنے بچوں کے ساتھ قصبہ سیانہ میں اپنے ماموں شاہ وحید اللہ کے یہاں قیام پذیر ہیں (اللہ تعالیٰ ان کو زندہ سلامت رکھے) اور شاہ وحید اللہ اپنے بزرگوں کی مسند پر جلوہ نشین ہیں۔ اخلاق حسنہ و اوصاف حمیدہ سے متصف ہیں۔ آپ کے باطنی کمال اور ظاہری جمال کا کیا کہنا۔ اس عاجز مولف نے ایسے خوبصورت اور خوب سیرت کم دیکھے ہیں۔ راقم کے ساتھ انتہائی نرمی و شفقت کا

معاملہ فرماتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار شاہ حفیظ اللہ مرحوم فقر و ریاضت و تقویٰ میں نامور اور شہرہَ آفاق تھے۔ ۱۲۲۷ھ کے قریب انتقال فرمایا اور شاہ وحید اللہ صاحب کے چچا شاہ محمد عطاء اپنے ایام شباب میں بشوق الہٰی سیر و سیاحت کیلئے نکلے' بیعت ہوئے اور سلون کے بزرگوں سے خرقہ خلافت لیا۔ اور پھر سیانہ واپس آئے۔ مشہور ہے کہ وہ بڑے عبادت گزار' شاغل' کاسب اور ریاضت شعار تھے۔ اپنی زندگی ہی میں اپنے قبرستان میں ایک جگہ بنا لی تھی جہاں راتوں کو عبادت الہٰی میں مشغول رہتے تھے۔ ۱۲۰۰ھ کے اواخر میں انتقال فرمایا۔ جناب کے مزار کا پتہ نہ چل سکا۔

نمبر ۲ سید نور محمد ۔ آپ کے دو بیٹے تھے : سید حبیب اللہ اور سید عبدالکریم۔ سید عبدالکریم کی ایک بیٹی تھیں جو سید علی اصغر اہل مدرسہ ہاپوڑ سے منسوب ہوئیں۔ اب ان کی اولاد مدرسہ قصبہ ہاپوڑ میں عزت و احترام کی زندگی گزار رہی ہے۔ اور سید حبیب اللہ کے بیٹے مجیب اللہ تھے جن کا انتقال ۱۲۴۸ھ میں گلاؤٹھی میں ہوا۔ ان کے دو بیٹے سید خورشید علی اور سید برکت اللہ اور چند بیٹیاں تھیں۔ سید خورشید علی حکام وقت کے ساتھ اعلیٰ عہدہ پر فائزہ ہیں۔ اس عاجز پر بڑی شفقت فرماتے ہیں اور سید برکت اللہ بھی اچھے عہدہ پر سرفراز ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندہ سلامت رکھے۔

نمبر ۳ سید سعد الدین ۔ آپ کے ایک بیٹا بوعلی تھا جس کا ۱۲۲۸ھ میں انتقال ہوا۔ ان بوعلی کا بیٹا اعظم علی تھا جو اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز تھا اور جس کا شہر کول میں ۱۲۵۷ھ میں انتقال ہوا۔ ان اعظم علی کا بیٹا معظم علی تھا۔ جو ان خوش شکل و خوش وضع اور سرکاری عہدہ پر فائز۔ اس کے ایک بیٹی تھی۔ اللہ پاک اسے زندہ سلامت رکھے۔ (یہاں تک مولف رسالہ ھذا کے پردادا کے دادا سید محمد امین کے بیٹوں پوتوں پڑپوتوں کا حال بیان ہوا۔ اب انہی سید محمد امین کے بھائی سید فیض اللہ کا بیان ہوتا ہے)۔

سید فیض اللہ کے ایک بیٹے عظمت اللہ عرف اجمیری تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے : نمبرا شمس الدین نمبر ۲ قمرالدین اور نمبر ۳ سید علی۔ نمبرا شمس الدین کے بیٹے سرفراز علی تھے جو انگریزوں کی عملداری سے قبل غارتگروں کے ہنگامہ میں شہید ہوئے اور ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔

نمبر ۲ قمرالدین کے صاحبزادے بخش اللہ تھے اور بخش اللہ کے صاحبزادے حافظ قادر بخش تھے۔ جنہوں نے ۱۳۲۹ھ کے قریب انتقال فرمایا۔ بخش اللہ کے ایک صاحبزادی بھی تھیں اور نمبر ۳ سید علی کے صاحبزادے ظفر علی تھے جو بلند شہر میں سکونت پذیر رہے۔ دس بارہ سال ہوئے کہ ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کے ایک صاحبزادی تھیں جن کا نکاح حافظ قادر بخش سے ہوا۔ ان کا بھی انتقال ہوچکا ہے۔

(گذشتہ سطور میں مولف رسالہ ھذا کے پرداداکے دادا سید محمد امین (۳۸) کے بیٹوں پوتوں پر پوتوں کا بیان تھا) اب (ان سید محمد امین کے پردادا) سید مداری(۳۵) ولد سید اکبر ولد سید مبارک کی بعض اولاد در اولاد کا شجرہ ۱۲۷۴ھ تک کا بیان کیا جاتا ہے۔ ان میں ایک سید فضل علی تھے، بڑے مرتبے اور عزت والے کہ سب بھائی ان کا کہا مانتے اور بغیر ان کی مرضی خاندان کا کوئی بڑا کام انجام نہ پاتا تھا۔ آپ نے نوے سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ میر غلام حسین مفتون نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح کہی قطع تاریخ۔

یافت چوں فضل علی سید سادات وفات
زین عزا زلزلہ افتاد بریں نہ طارم
ہاتف از غیب پئی سال و ھش گفت کہ بود
صبحدم روز سہ شنبہ ز صفر یاز دھم

۱۲۳۵ھ

(سید سادات فضل علی نے جب وفات پائی تو آسمان کی بلندیوں میں بھی ماتم کے باعث زلزلہ سا آگیا۔ ہاتف غیبی نے آپ کے ماہ و سال وفات کے بارے میں کہا "بود صبحدم روز سه شنبه ز صفر یازدهم" ۱۲۳۵ھ (صبح کا وقت تھا دن منگل کا اور ماہ صفر کی گیارہ)۔ سید فضل علی کے دو صاحبزادے تھے:

نمبرا سید غلام علی اور نمبر۲ سید غلام سرور نمبرا سید غلام علی اخلاق حسنہ کے مالک تھے اور اہل فقر سے محبت کرتے تھے۔ تقریباً ۱۲۴۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے صاحبزادے سید عبدالمجید صالح' سعادت مند اور نیک طینت جوان ہیں۔ نواب محمد علی خاں عرف نواب دولہ تعلقدار شمس آباد کے دفتر میں ملازم ہیں۔ ان کے ایک فرزند ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ نمبر۲ سید غلام سرور آپ کے حسن وجاہت اور محاسن اخلاق کے بیان سے زبان قلم قاصر ہے۔ اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں انہوں نے خوب نام پایا۔ بہت اچھے سرکاری عہدہ پر فائز تھے۔ ۱۲۴۱ھ میں حالت جوانی میں انتقال فرمایا۔ اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے۔ نمبرا سید ولایت علی نمبر۲ سید واجد علی نمبر۳ سید ہدایت علی اور نمبر۴ سید فدا علی اور یہ سب بیٹے پسندیدہ اوصاف اور اخلاق حسنہ کے مالک تھے اور اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ نمبرا سید ولایت علی کے تین صاحبزادے ہیں۔ عنایت علی' حافظ مہر علی اور تیسرے حافظ مہربان علی۔ نمبر۲ سید واجد علی کے دو صاحبزادے ہیں: عبدالکریم اور عبدالحکیم نمبر۳ سید ہدایت علی کے ایک صاحبزادی ہیں اور نمبر۴ سید فدا علی کے دو صاحبزادے مولوی محمد حسین اور احمد حسین۔ مولوی محمد حسین فارسی اور عربی کتابوں کی تحقیق اور دوسرے علوم محاسبات (ریاضی وغیرہ) میں اپنے تمام ہمعصروں سے سبقت لے گئے ہیں۔ اور احمد حسین صالح جوان اور نیک طینت ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو زندہ سلامت رکھے۔ سید عبدالحفیظ جن کی عمر ۹۰ سال سے زیادہ ہوئی۔ ۱۲۳۰ھ میں انتقال فرما گئے اور چار بیٹے چھوڑے: حیدر علی' روشن علی' رحم علی' ظفر علی۔ اب یہ سب وفات پا چکے ہیں اور ان سب کے بیٹے

موجود ہیں جیسے شجرہ میں بیان ہوا۔ اللہ پاک ان سب کو زندہ سلامت رکھے۔ سید خیرات علی ولد غلام مرتضیٰ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے سید خورشید علی کو متبنی بنا لیا تھا اور انہی کے نام اپنی میراث کر دی۔ آپ نے ۱۳۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔ سید ثابت علی اور مہابت علی کے لڑکیاں ہوئیں۔ کوئی لڑکا نہ ہوا۔ سید قربان علی بن کریم الدین اور حرمت علی ابن سید حسین علی ابن محمد ماہ ثابت علی کے نواسے زندہ ہیں۔ سید جواہر علی اوصاف حمیدہ کے مالک' وجیہ اور خوش اخلاق تھے۔ ۱۳۶۴ھ کے اواخر میں انتقال فرمایا۔ سید امیر علی ابن مدد علی خوبصورت جوان اور نیک طینت ہیں۔ طبیعت میں ظرافت ہے۔ شطرنج کے استاد ہیں۔ سید مدد علی و جواہر علی کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ کے منصب پر تھا لہذا ان کے خاندان والوں کو منصب دار کہتے ہیں اور چونکہ سید امیر علی کے والد زیادہ تر دہلی میں مقیم رہے تو وہ دہلی والے مشہور ہوگئے۔ نواب شمس الدین خان ابن نواب احمد بخش خان بہادر جاگیردار فیروزپور کے فارسی کے استاد سید فرحت علی بڑی اچھی صفات کے مالک تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۵۰ھ کے اواخر میں ہوا۔ ان کے صاحبزادگان میں سید اہتمام علی اخلاق حسنہ کے مالک اور شیریں گفتار تھے۔ فنون سپاہ گری میں خصوصاً بندوق داغنے کے فن میں انہیں خوب مہارت حاصل تھی۔ یہ عاجز مولف بھی انکا شاگرد تھا اور سید قاسم علی جو ایام شباب میں روزگار کے سلسلے میں شہر ناگپور چلے گئے تھے اور وہاں تقریباً تیس سال اقامت پذیر رہے آخری عمر میں پھر اپنے وطن واپس آگئے تھے۔ انہوں نے ۱۳۶۵ھ کے اواخر میں انتقال فرمایا۔ ان کے صاحبزادے سید مہربان علی پنجاب کی طرف چلے گئے تھے۔ آجکل بھرت پور میں باعزت ملازمت پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ سید فیاض علی بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ اکثر شاہجہاں آباد رہتے ہیں۔ خط نستعلیق خوب لکھتے ہیں اور قرآن پاک کی تجوید و قرات کے ساتھ خوبصورت تلاوت کرتے ہیں۔ آپ کے چند بیٹے ہیں۔ سب اچھی عادات و خصائل کے مالک ہیں۔ اللہ

تعالیٰ سب کو سلامت رکھے۔

اب دوسرے سادات کرام کا جو اس قصبہ گلاؤٹھی کے متوطن ہیں بیان شروع کرتے ہیں۔ چونکہ ان سب کے حالات بیان کرنے کے لئے تو ایک طویل کتاب کی ضرورت ہے لہٰذا اس رسالہ میں صرف بعض شرفائے کرام کا بیان ہوگا۔

جاننا چاہیے کہ اس قصبہ میں زیادہ تر سید بڈھن کی اولاد مقیم ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیگر تمام سادات سے پہلے مقام جہارسہ سے آکر یہاں مقیم ہوئے۔ عالم والا' ناصر والا اور جمال الدین والا اور دوسرے خاندان ان کی اولاد ہیں۔ جو کچھ مجھے پتہ چلا ہے اور تحقیق کرسکا ہوں وہ تحریر کرتا ہوں۔ سید ابوالفرح واسطی تک ان کا نسب نامہ اس طرح ہے:۔

سید بڈھن ابن سید مصطفیٰ ابن سید نصیر الدین ابن سید احمد ابن
سید علاء الدین ابن سید شمس الدین ابن سید تاج الدین ابن سید
حسین ابن سید ویس ابن سید فرید الدین ابن سید علاء الدین
ابن سید عوض ابن سید ابوالفرح واسطی نمبر۱۹

سید بڈھن کے چند فرزند تھے۔ تمن' بہلن اور جمال الدین۔ تمن کے دو بیٹے تھے : مظفر اور عالم۔ مظفر کے بیٹے ناصر' ناصر کے بیٹے وہاب اور وہاب کے بیٹے وارث تھے جیسا کہ شجرہ نمبر۱ میں آتا ہے۔ سید وارث بن سید وہاب بن ناصر بن مظفر ابن تمن ابن بڈھن۔ سید قادر بخش اچانک انتقال فرما گئے۔ چونکہ ان کا کوئی صلبی و پشتی نہ تھا قحط کے ایام میں انہوں نے ایک بچہ کو گود لیا اور متبنیٰ بنا لیا اور اپنی جائیداد اس کے نام کر دی۔ سید محبوب علی سواروں کے دفعداری کے عہدہ پر فائز تھے اور اپنے ساتھیوں میں ایک امتیازی شان رکھتے تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں انہوں نے دمہ کے عارضہ میں وفات پائی۔ ان کے صاحبزادے سید صاحب علی بہت ہی اچھی صفات کے

مالک تھے۔ خوش نویسی اور علم حساب مساحت وغیرہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ اللہ انہیں زندہ سلامت رکھے۔ ان کی اولاد میں عباس علی، پنجتن علی اور منصف علی موجود ہیں اور سید بڈھن کی اولاد میں سید عطاء اللہ کے صاحبزادگان کے علاوہ دو بیٹیاں بھی ہیں۔ نمبر۱ حلیمہ نمبر۲ عظیمہ۔ حلیمہ آگے چل کر امام بخش پسر چاند کی دادی بنیں جبکہ عظیمہ سید رمضان علی ولد مراد علی کی دادی ہوئیں۔

سید بڈھن تک ان کا نسب نامہ اس طرح ہے :۔
عطاء اللہ ابن فتح محمدابن سیدوارث ابن وہاب ابن ناصر ابن مظفرابن تمن ابن سیدبڈھن

سید یاد اللہ نے چوروں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ ان کے بیٹے بشارت علی اپنی بیوی کیوجہ سے بلند شہر میں رہتے تھے اور ان کے بیٹے سعادت علی خوبصورت جوان تھے اور بلند شہر کے خزانہ کی جمعداری کے عہدہ پر فائز تھے۔ ۱۳۶۰ھ کے بعد انتقال فرمایا۔ ان کے بیٹے معشوق علی مجنونانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ عظیم اللہ عرصہ دراز ہوا انتقال فرما گئے۔ ان کے بیٹے سید امانت علی مسماۃ وزیر النساء بنت حکیم سید مدد علی کے ہمراہ (جو اپنے شوہر جمال الدین ساکن سیانہ کے پاس حیدر آباد گئیں) فرخ آباد سے حیدر آباد چلے گئے اور وہاں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوگئے۔ کچھ سال بعد ان کے بھائی سید شجاعت علی بھی حیدر آباد آگئے۔ سید شجاعت علی کے بیٹے تراب علی اور فدا علی وطن میں موجود رہے۔ سید محبت علی وطن ہی میں ہیں اور بڑی خوبیوں اور حسن اخلاق کے مالک ہیں۔ اللہ پاک ان سب کو زندہ سلامت رکھے۔ سید نعمت علی بھی حسن اخلاق سے متصف اور زندہ سلامت ہیں۔ اللہ پاک انہیں بھی زندہ سلامت رکھے۔ قاضی فیض اللہ جو اپنے بھائیوں میں نامور ہوئے اس قصبہ کے قاضی تھے اور یہ کام انہوں نے اپنے لئے مخصوص کرلیا تھا۔ آپ نے ۱۳۲۵ھ کے اواخر میں انتقال فرمایا۔ آپ کے صاحبزادے قاضی عنایت اللہ کمال اخلاق سے متصف اور بڑی خوبیوں

کے مالک تھے۔ آپ نے ۱۲۵۰ھ کے اواخر میں انتقال فرمایا۔ آپ کے چند بیٹے تھے۔ ان میں سے سید فضل اللہ قصبہ کے قضا کے عہدہ پر فائز تھے۔ اللہ پاک ان کو زندہ سلامت رکھے۔

حکیم امان اللہ ماہر طبیب تھے۔ ان کے صاحبزادے حکیم مدد علی بھی فن طبابت کا خوب علم رکھتے تھے۔ ۱۲۳۰ھ کے بعد انتقال فرمایا۔ ان کے بیٹے حکیم اسد علی بیماروں کا علاج کرنے کے سلسلہ میں بے مثل ہیں۔ اس عاجز راقم الحروف سے بڑی نرمی سے پیش آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ سید ہدایت اللہ نے بڑھاپے میں انتقال فرمایا۔ ان کے صاحبزادے شمس الدین کا بھی انتقال ہوچکا ہے۔ شمس الدین کے صاحبزادے معصوم علی پنجاب چلے گئے اور وہیں جوانی میں انتقال فرمایا۔ انا للله و انا الیہ راجعون سید صفدر علی مسماۃ وزیر النساء کے ہمراہ حیدر آباد چلے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ان کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک کی سید محبت علی سے اور دوسری کی سید مفضل حسین ابن حکیم اسد علی سے شادی ہوئی۔ اور سید نجابت علی کی ایک صاحبزادی تھیں۔ مسماۃ کریمہ جن کا سید عنایت علی سے نکاح ہوا اور ان کریمہ النساء کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ قمر علی کے صاحبزادگان اہتمام علی اور غالب علی کا عین عالم شباب میں انتقال ہوا۔ قمر علی کے ایک بیٹی تھیں جو مولوی نور اللہ کے نکاح میں آئیں اور اب انتقال کرچکی ہیں۔

سید تمن ابن سید بڈھن کی اولاد مین دوسرے سید ابو تراب تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ نمبر۱ غریب اللہ اور نمبر۲ سید ابوالحسن۔ نمبر۱ غریب اللہ اچھے اخلاق اور اچھی سیرت کے مالک تھے۔ ۱۲۶۰ھ کے بعد آپ نے انتقال فرمایا۔ ان کے صاحبزادے سید طالب علی کا ان کے والد بزرگوار کے انتقال کے سات آٹھ سال بعد اچانک انتقال ہوا۔ اب ان کے بچے موجود ہیں۔ نمبر۲ سید ابو تراب کے دوسرے بیٹے سید ابوالحسن کا عرصہ دراز ہوا انتقال ہوگیا ہے۔ ان کا صحیح سال وفات مجھے یاد نہیں ہے۔ سید

ابوعلی اور غالب علی ان کے بیٹے تھے۔ سید ابوعلی کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف بیٹیاں تھیں اور غالب علی مرد آزاد اور نیک طینت ہیں۔ اب بھی زندہ ہیں۔ چونکہ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے انہوں نے سید ولایت علی کے صاحبزادے سید عنایت علی کو قرابت کے سبب متبنیٰ بنا لیا ہے۔

سید تمن کی اولاد میں دوسرے سید امام علی نمبر۱' سید احسان علی نمبر۲ اور سید اہتمام علی نمبر۳ تھے جو سید ثابت علی ابن سید میرابن سید والی ابن سید محی الدین ابن سید عالم ابن سید تمن ابن سید بڈھن کے صاحبزادگان تھے۔ نمبر۱ سید امام علی کے دو بیٹے ہیں : انتظام علی اور مبارک علی۔ دونوں ذہین اور لائق ہیں۔ نمبر۲ سید احسان علی کے ایک بیٹا مشیت اللہ تھا جس کا حال ہی میں عین جوانی میں انتقال ہوا ہے اور سید حسین علی کے تین بیٹے ہیں : صاحب علی۔ حاکم علی اور عالم علی اور نمبر۳ سید اہتمام علی اچھے اخلاق کے مالک ہیں۔ کشتی و پنجہ لڑانے اور زور آوری میں بہت مشہور ہیں۔ ان کے بیٹے کا نام عمر شیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو زندہ سلامت رکھے۔

سید تمن کی اولاد میں دوسرے سید خورشید علی ابن سید رمضان علی ابن سید میر ابن سید والی ہیں جن کے چند بیٹے ہیں محبوب علی اور یعقوب علی۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے۔

سید تمن کی اولاد میں دوسرے سید مہابت علی اور مولوی نجابت علی ابن سید حسن علی ابن سید محی الدین بن سید عادل الیٰ آخرہ ہیں۔ سید نجابت علی اور ان کے صاحبزادے جواہر علی کا ۱۳۲۵ھ کے بعد انتقال ہوا۔ نجابت علی کی ایک بیٹی مسماۃ وزیر النساء کا سکندر آباد میں نکاح ہوا اور جواہر علی کی بیٹی مسماۃ عمدۃ النساء کا سید امیر علی ابن سید مدد علی سے نکاح ہوا۔ اور سید مہابت علی کے چند بیٹے تھے : سید نجف علی' شجاعت علی اور حیدر علی۔ نجف علی اب بھی مجلس میں قضا کے کام پر مامور ہیں اور

ان سب بھائیوں کے اولاد ہے۔

سید بڈھن کے بیٹے سید جمال الدین کی اولاد میں دوسرے کم افراد باقی بچے ہیں۔ عصمت اللہ اور ان کے اخلاف موجود ہیں۔

سید بھلن ابن سید بڈھن کی اولاد میں دوسرے سید مخدوم بخش بن سید محمد مسیح ہیں جن کا ۱۲۶۰ھ کے بعد انتقال ہوا۔ ان کی اولاد میں ایک نمبرا سید امیر علی ہیں جن کی تقریر بڑی پر اثر اور گفتگو بڑی شیریں ہے۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کے صاحبزادے امراؤ علی پنجاب کی طرف چلے گئے جہاں آج کل وہ اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ نمبر ۲ اور دوسرے سید وزیر علی جو اوصاف حمیدہ سے متصف ہیں۔ پہلی بیوی سے ان کے چند صاحبزادگان ہیں : جاوید علی، تراب علی اور ممتاز علی اور دوسری بیوی سے بھی چند لڑکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو زندہ سلامت رکھے۔

سید بھلن کی اولاد میں دوسرے بچن علی ولد امین الدین اور کچھ دوسرے حضرات موجود ہیں۔ کلن بن سید بڈھن کی اولاد میں دوسرے سید منجھلی ہیں جنکی اولاد کا شجرہ نمبر۴ اس طرح ہے اور اس میں شبہ ہے کہ یہ کلن مذکور سید بڈھن کی اولاد سے ہیں یا نہیں۔ سید نظام الدین کی ایک صاحبزادی مسماۃ سعادت النساء تھیں جن کا نکاح سید نور الھدیٰ ابن سید محمد رضا سے ہوا۔ اور سید شمس الدین فارسی کتابوں کی تحقیق میں وسیع دستگاہ اور تجربہ رکھتے تھے۔ اچھے خوشنویس تھے۔ زیادہ تر رامپور میں مقیم رہے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ان کے صاحبزادگان سید قمر علی اور غلام چشتی کا ۱۲۵۰ھ کے بعد انتقال ہوا۔ قربان علی ابن سید قمر علی کی بیشتر شاہجہاں آباد میں اقامت رہی اور ان کا اپنے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں عالم شباب میں انتقال ہوا۔ ایک بیٹا مسمی حسن علی چھوڑا جس کا موضع سراوہ میں قیام ہے اور سید نثار علی بہادر اور عالی ہمت ہے۔ اس کے چند بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندہ سلامت رکھے۔ اور سید عنایت علی کہ علم کے

زیور اور دیگر اچھے اوصاف سے متصف ہیں اور اچھے سرکاری عہدہ پر فائز ہیں۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندہ سلامت رکھے۔ اور سید کریم الدین رامپور میں سکونت رکھتے تھے وہیں انتقال فرمایا۔ ان کے صاحبزادے سید قربان علی اس عاجز مولف سے بڑی محبت فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ سید غلام محمد بڑھاپے میں نابینا ہونے کے باعث ۱۲۲۸ھ کے قریب ایک کنوئیں میں گر پڑے اور اس طرح ان کا انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے سید محمد بخش اپنے والد کی حیات ہی میں ایام شباب ہی میں انتقال فرما گئے۔ انہوں نے تین بیٹے چھوڑے ایک سید جمال الدین جن کا ۱۲۳۸ھ میں جوانی میں انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے حکیم سید طالب علی جو علم و کمال کے زیور سے آراستہ ہیں زندہ ہیں اور انہوں نے اس عاجز مولف سے کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ دوسرے سید مبارک علی جن کا بھی ایام جوانی ہی میں انتقال ہوا۔ اس عاجز مولف کے ساتھ بڑا تعلق رکھتے تھے۔ فیفعل اللہ ما یشاء (اللہ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے)۔ ان کے صاحبزادے سید تارک علی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ تیسرے محبت علی اس عاجز مولف کے ساتھ بہت ہی زیادہ تعلق برتتے اور بڑی محبت فرماتے تھے۔ روزگار کے سلسلے میں پنجاب کی طرف گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ان کے صاحبزادگان حافظ الطاف علی اور مظہر علی زندہ ہیں۔ اس عاجز مولف نے ان کی تاریخ وفات اس طرح نظم کی ہے تاریخ۔

چہ گویم ز درد فراق کسی — کہ میکرد شفقت بحالم بسی

محب قدیمی شفیق ولی — نکو خلق سید محبت علی

شب و روز پیشم خیال دی ست — جگر دوز جاں سوز حال وی ست

چو فکر معیشت دلش تنگ کرد — باضلاع پنجاب آہنگ کرد

در آنجا بمطلوب خود کام یافت   بر آسود و یکچند آرام یافت
بنوده بجز چند ماہش قرار   کہ پیک اجل کرد پیشش گزار
مگر بوده خاکش ازانجا خمیر   کہ ایں گو نہ شد رفتش ناگزیر
کمر بستہ از خانہ بردش اجل   خط زندگانی ستردش اجل
بہ پنجاب رفت وبہ پنجاب مرد   غم فرقت خویش و احباب برد
در آنجاز خویش و تبارش بنود   بجز بیکسی ہیچ یارش بنود
چو موت غریبش سید شنفت   "محبت علی رفت ای وائی" گفت

۱۲۶۸ھ

(میں ایسے شخص کے درد فراق کے بارے میں کیا کہوں جو میرے حال پر اتنی زیادہ شفقت رکھتا تھا میرا پرانا محب اور ولی شفیق۔ اچھے اخلاق کا مالک سید محبت علی۔ شب و روز میرے سامنے انہی کا خیال ہے کہ ان کا حال کیسا جگر ٹکڑے کرنیوالا اور جاں سوز تھا۔ روزگار کی فکر نے جب ان کا دل پریشان کیا تو انہوں نے پنجاب کے اضلاع کا ارادہ کیا۔ وہاں انہیں اپنی مرضی کا کام مل گیا اور چند روزہ آسودگی و راحت کا سامان ہوگیا۔ ابھی اس بات کو چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ ان کے پاس موت کا پیغام آگیا۔ شاید ان کا وہیں دفنایا جانا مقدر تھا کہ اس طرح ان کے وہاں جانیکا سلسلہ ناگزیر اور ضروری ہوگیا۔ گویا موت ان کو اپنے گھر اور وطن سے نکالنے پر کمربستہ ہوگئی اور اس نے ان کے خط زندگی کو محو و صاف کر ڈالا۔ وہ پنجاب چلے گئے اور پنجاب ہی کی آغوش میں ہمیشہ کیلئے سو گئے اور اسطرح اپنوں اور احباب کے غم فرقت کو سمیٹ لیا۔ وہاں پنجاب میں ان کا نہ کوئی اپنا تھا نہ اولاد نہ خاندان۔ صرف بیکسی تھی جو وہاں ان کی دوست تھی۔ جب حضرت سید نے اپنی غریبی کی موت کا سنا تو کہا "محبت علی رفت ای وائی" ۱۲۶۸ھ (ہائے افسوس محبت علی رخصت ہوا)۔

اس قصبہ کے ساکنوں میں دوسرے اشخاص سید وجیہ الدین اور قطب الدین کی

اولاد ہیں۔ ان کے چند خاندان ہیں۔ سید ابوالفرح واسطی تک ان کا نسب اس طرح ہے:۔

سید وجیہ الدین ابن سید لاڈو ابن سید امین الدین ابن سید حسین
ابن سید عمر ابن سید احمد ابن سید علاء الدین ابن سید شمس
الدین ابن سید تاج الدین ابن سید حسین ابن سید ولیس ابن فرید
بن سید علاء الدین ابن سید عوض ابن سید ابوالفرح واسطی

اسی طرح سید قطب الدین کا نسب نامہ ہے جو وجیہ الدین کے حقیقی بھائی یا پھر ان کے بھتیجے تھے۔ سید قطب الدین کی اولاد میں سید حیات اللہ عرف سید جوھر ہیں۔ سید قطب الدین تک ان کا نسب اس طرح ہے:۔

حیات اللہ ابن فاضل ابن سید اعظم ابن سید لاڈو ابن فتح الدین
عرف کدا ابن سید قطب الدین بن سید لاڈو ------

حیات اللہ کے تین فرزند تھے نمبر ا عزت اللہ نمبر ۲ ارشد علی نمبر ۳ عظمت اللہ نمبر ا عزت اللہ کے بیٹے قدرت اللہ کی خوبصورت عادات و خصائل کے متعلق کیا عرض کروں۔ تمام لوگ ان سے راضی و خوش تھے۔ وہ دنیوی معاملات میں بڑے ہوشمند تھے۔ اس عاجز مولف نے ان سے چند کتابیں پڑھی ہیں۔ فارسی اور اس کے قواعد کا خوب علم رکھتے تھے۔ ۱۲۶۰ھ کے اواخر میں انتقال فرمایا۔ نزع کے وقت پوری طرح ہوش و حواس میں تھے۔ قدرت اللہ کے تین بیٹے تھے (میر غلام حسین مفتون۔ سید غلام عباس اور سید واجد علی)

میر غلام حسین جو مفتون تخلص کرتے تھے فارسی کتابوں کی تحقیق، شعر گوئی اور نثر نویسی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اس عاجز مولف کو ان سے تلمذ کا شرف بھی حاصل ہے۔ اپنے ایام شباب میں وہ اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز تھے۔ بینائی چلی جانے

کے باعث سرکار سے پنشن مل گئی۔ خصوصاً تاریخ گوئی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ قلعہ بھرتپور کی فتح کی تاریخ اس طرح کہی ہے۔ قطعہ تاریخ۔

بنام ایزدچہ زیبا فتح کردند ‏ ‏ ‏ حصار چرخ فرسا فتح کردند
مہاراجہ بدر رفت و ہمی گفت ‏ ‏ ‏ حصار بھرتپور رافتح کردند

۲۵۵ ‏ ‏ ‏ ۲۰۸۱

(خدا کا نام لیکر کیا خوبصورت چیز فتح کی۔ آسمان چھونے والا قلعہ فتح کیا۔ مہاراجہ باہر نکلا اور اس نے کہا "حصار بھرتپور را فتح کردند" بھرت پور کا قلعہ فتح کر لیا۔ ۲۰۸۱ کے عدد سے ۲۵۵ کا عدد یعنی مہاراجہ کا عدد نکال دیں۔ ۲۰۸۱ ۔ ۲۵۵ = ۱۸۲۶ء : سال فتح قلعہ بھرت پور نکل آئے گا)۔

نواب تجمل حسین خان بہادر رئیس فرخ آباد کی تاریخ جلوس ریاست اس طرح نظم کی۔ قطعہ تاریخ جلوس۔

سال و ماہ جلوس ہمایوں ‏ ‏ ‏ ہاتف غیب بہ سحر بیانی
گفت "جلوس بمسند والا ‏ ‏ ‏ یاز دھم ز ربیع الثانی"

۱۲۴۱ھ

(ہاتف غیبی نے جادو بیانی سے کام لیتے ہوئے مبارک جلوس کے سال اور مہینہ کے بارے میں کہا "جلوس بمسند والا یاز دہم ز ربیع الثانی" (۱۲۴۱ھ) کہ بلند مسند پر جلوس ربیع الثانی کی گیارہ تاریخ کو تھا)۔

میر رحمت اللہ صاحب کی بنا کردہ تعمیر مسجد کا مادۂ تاریخ (صرف دو لفظوں سے) نکالا۔

رحمت خدا ۱۲۵۳ھ

(میر غلام حسین مفتون نے) ۱۲۵۰ھ کے بعد (کسی سال) انتقال فرمایا۔ ان کی دو صاحبزادیاں تھیں' ایک جس کا میرے کتخدا شدہ بھائی سید حیدر بخش اور دوسری کا سید حشمت علی ابن علیم اللہ سے نکاح ہوا۔

قدرت اللہ کے دوسرے بیٹے (اور میر غلام حسین مفتون کے بھائی) سید غلام عباس تھے جو رئیس رامپور کے یہاں باعزت عہدہ پر تھے۔ تین چار سال کا عرصہ ہوا انہوں نے وہیں انتقال فرمایا۔ سید بنیاد علی ان کے صاحبزادے پنجاب کیطرف چلے گئے اور وہاں ملازم ہیں۔ اللہ پاک انہیں سلامت رکھے۔ قدرت اللہ کے تیسرے بیٹے سید واجد علی جو شہر مراد آباد میں سرکاری ملازم تھے اور عزت و امتیاز کے مالک تھے اچھے نثر نگار تھے۔ ۱۲۵۹ھ میں مراد آباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے سید حیات اللہ جو خوشنویسی اور حساب میں اچھی مہارت رکھتے ہیں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ (یہاں تک حیات اللہ کے فرزند عزت اللہ کے خاندان کا بیان تھا اب حیات اللہ کے دوسرے دو بیٹوں ارشد علی اور عظمت اللہ کے خاندان کا بیان شروع ہوتا ہے)۔

نمبر ۲ ارشد علی کے بیٹے ذوالفقار علی تھے۔ ان کے بیٹے مولوی ناصر علی۔ ان کے بیٹے حکیم سید محبوب علی اور ان کے بیٹے حکیم سید محمد علی۔ سید ذوالفقار علی اعمال حاضرات اور دفع خبائث جنیات میں ناقابل بیان مہارت رکھتے تھے اور مولوی ناصر علی علم و تقویٰ سے آراستہ اور فقہی مسائل کے مستند عالم تھے۔ ۱۲۵۰ھ کے قریب انتقال فرمایا۔ حکیم سید محبوب علی اور ان کے صاحبزادے سید محمد علی بحیثیت طبیب سرگرم عمل ہیں اور عاجز مولف پر بہت مہربان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو زندہ سلامت رکھے۔

نمبر ۳ عظمت اللہ کے بیٹے امام الدین۔ ان کے بیٹے حسین علی' ان کے بیٹے منشی نجیب علی اور عالم علی اور مظفر علی۔ یہ تینوں بھائی اس عاجز مولف پر بہت مہربان ہیں اور بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو سلامت رکھے۔ سید حسین علی نے ۱۲۶۰ھ کے بعد انتقال فرمایا۔

سید قطب الدین کی اولاد میں سید احمد علی بن محمد علی بھی تھے۔ بیٹیوں کے علاوہ ان کے کوئی اولاد نہ رہی۔

سید وجیہ الدین کی اولاد میں خاندان متولیان بھی ہے۔ امام علی متولی ابن غلام اشرف ابن شکر اللہ ابن نعمت اللہ ابن خیر اللہ بزرگ ابن عبدالمجید ابن سکندر ابن سید وجیہ الدین۔ امام علی کا ۱۲۵۰ھ کے بعد انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادگان میں سید جواہر علی بھی آخرت کو سدھار گئے۔ ان کے دو صاحبزادے سید ارشاد علی اور سید فدا علی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ اور سید ثابت علی ابن سید امام علی متولی بھرت پور میں سوار ان رسالہ کے زمرہ میں ملازم ہیں اور عاشق علی اور رفیق علی ان کے صاحبزادے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو زندہ سلامت رکھے۔ اسی خاندان کے علیم الدین بن ثناء اللہ ابن غلام اشرف ہیں جو جوانی کی عمر میں وطن سے باہر گئے اور تیس سال سے مفقود الخبر ہیں۔ معلوم نہیں کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔ ان کے صاحبزادے حشمت علی جوان صالح نے ۱۲۷۳ھ کے بعد انتقال کیا۔ ایک بیٹا جعفر علی ان کی یادگار ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے زندہ سلامت رکھے۔ یہ حشمت علی مولوی ناصر علی کے نواسے تھے جبکہ یہ جعفر علی میر غلام حسین مفتون کے نواسے ہیں اور سید خیر اللہ ابن شکر اللہ کے دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک کا نکاح ان کے چچا زاد ثناء اللہ سے اور دوسری کا مولوی ناصر علی سے ہوا۔

سید وجیہ الدین کی اولاد میں دوسرے اصلح علی اور فتح علی بھی ہیں اور یہ دونوں بیٹے ہیں سید میر ابن سید محمد ابن سید مسعود ابن سید بلاقی ابن سید محمد شریف

ابن سید احمد ابن سید نصر اللہ ابن سید الہ بخش ابن سید سکندر ابن سید وجیہ الدین کے سید اصلح علی فارسی کتابوں کا اچھا علم رکھتے تھے خصوصاً ابوالفضل دفتر دوم کا۔ روزگار کے سلسلہ میں کلکتہ کی طرف گئے۔ وہاں ایک خاتون سے نکاح کیا۔ اس سے ایک بیٹا خدابخش پیدا ہوا۔ دوسری بیوی جو وطن میں تھیں ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی لٰہذا خدابخش ان کی تمام متروکہ جائیداد کا مالک بن گیا۔ اگرچہ اس ترکہ کے سلسلے میں ان کے برادر زادگان میں کافی تنازع ہوا اور دشمنیوں تک نوبت آئی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ان خدا بخش کے دو بیٹے ہوئے ایک خلیفہ واجد علی اور دوسرا صاحب علی۔ صاحب علی کا انتقال ہوا اور اس نے ایک بیٹا احمد علی چھوڑا اور خلیفہ واجد علی بڑے ہوشمند اور کام والے آدمی ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔ (اور سید وجیہ کی اولاد میں جو دوسرے سید فتح علی ہیں) ان فتح علی کے چند صاحبزادے ہیں : سید فضل علی، کرامت علی، نجابت علی اور جواہر علی۔ سید فضل علی اپنی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں نامور اور ممتاز ہیں۔ ان کے صاحبزادے سید مشیت اللہ بھی بڑی عزت رکھتے ہیں۔

سید فضل علی کے دوسرے بھائی بھی بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ سید جواہر علی مدرس ہیں، ان کے صاحبزادے ولایت علی بھی اس قصبہ کے مدرس اور نیک و قابل جوان ہیں۔ اللہ تعالٰی ان سب کو سلامت رکھے۔

سید وجیہ الدین کی اولاد میں دوسرے سید نجیب علی امین اللہ حفیظ اللہ اور رحمت اللہ ہیں اور یہ بیٹے ہیں، خلیفہ عبداللہ ابن سید عزیز اللہ ابن سید عبدالکریم ابن خالق دیا، ابن سید معین الدین ابن سید وجیہ الدین کے۔ یہ چاروں بھائی جو سب وجاہت، حسن عادات اور خوبیوں کے مالک تھے۔ ان میں اب صرف رحمت اللہ حیات ہیں جو نئی اور پرانی قرابتوں کے باعث قصبہ گوٹھاؤلی میں مقیم ہیں۔ ان سب بھائیوں کی اولاد موجود ہے، اللہ تعالٰی ان سب کو زندہ سلامت رکھے۔

سید وجیہ الدین کی اولاد میں دوسرے سید ثابت علی اور عنایت علی ہیں' جو بیٹے ہیں سید مدد علی ابن سید کرم علی ابن سید غلام علی ابن سید الہدی ابن سید معین الدین ابن سید وجیہ الدین کے۔ سید عنایت علی اس جہاد کے سلسلہ میں جسے مولوی محمد اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی صاحب مرحوم نے لاہور کے قرب و جوار میں شروع کیا تھا وہاں چلے گئے وہاں سے ان کی وطن واپسی نہ ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ سید ثابت علی جو اخلاق حسنہ سے متصف ہیں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے' اور سید الہدی شاہ اورنگزیب عالمگیر کے دربار میں کسی خدمت پر مامور تھے۔ یاد اللہ ' روح اللہ کے خاندان میں بہت کم افراد کا پتہ چلا ہے۔ یہ عاجز مولف ان کے نسب نامہ سے واقف نہیں ہے۔ سید کرم علی کا ۱۲۳۰ھ کے بعد انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے سید معظم علی موجود ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے' حافظ نجف علی خوبصورت میٹھی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کلام اللہ کی تلاوت کیا کرتے تھے کہ جملہ سامعین کو بہت بھلا لگتا۔ انہوں نے رامپور کے حافظوں قاریوں سے قرآت کلام مجید سیکھی تھی۔ اس قصبہ کے اکثر ساکنوں کو اس سلسلہ میں ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ۱۲۵۰ھ کے بعد انہوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کے صاحبزادگان میں ایک سید امداد علی ہیں جو فارسی کتابوں کی تحقیق میں بڑی دستگاہ رکھتے ہیں اور شعر بھی خوب کہتے ہیں۔ اس عاجز مولف کے ساتھ بڑی شفقت رکھتے ہیں اور ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز ہیں۔ دوسرے سید ولایت علی ہیں جو بڑی خوبیوں کے مالک ہیں' اللہ تعالیٰ ان سب کو سلامت رکھے۔

جاننا چاہئے کہ اس قصبہ میں "میر صاحب" اور "سید" کے الفاظ صرف سادات کرام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ تبعاً دیگر شرفاء کرام کیلئے بھی بولے جاتے ہیں' جیسے افغانوں کے دیس میں خان صاحب کا لفظ۔

سید تاج الدین رسالدار ابن سعدالدین ابن شکراللہ گڑھ مکیشر کے قدیم

ساکن حضرت گنج بخش صدیقی کی اولاد سے ہیں۔ اس قصبہ میں بڑی عزت و احترام کے ساتھ سکونت پذیر ہیں اور اعلیٰ خاندانوں سے انہوں نے اپنا سلسلہ قرابت قائم کیا ہے۔ رسالداری کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے اب سرکار سے پنشن پاتے ہیں۔ پختہ کنواں بنوایا ہے اور ان کا آموں کا باغ ہے۔ ۱۲۵۰ھ کے بعد آپ نے انتقال فرمایا۔ تین نامور بیٹے چھوڑے۔ ان میں سے ایک سید منہاج الدین جو رسالداری کے عہدہ پر فائز تھے اور اپنے بھائیوں میں بڑی عزت پانے والے۔ ۱۲۶۰ھ کے بعد انتقال فرمایا۔ ان کے دو بیٹے ہیں' بڑے بیٹے سید ضیاء الدین (اور چھوٹے سید علاء الدین) یہ اخلاق حمیدہ کے محاسن سے متصف ہیں اور معزز سرکاری عہدہ پر فائز ہیں۔ ان سیدضیاء الدین کے دو بیٹے ہیں ایک فضل عظیم جو حافظ قرآن ہیں اور دوسرے کرم عظیم اور یہ دونوں بھائی صالح جوان ہیں۔ سید ضیاء الدین کے چھوٹے بھائی سید علاء الدین ذاتی و صفاتی دونوں خوبیوں سے متصف ہیں۔ اس عاجز مولف کی دلجوئی کرتے ہیں اور مجھ پر مہربان ہیں۔ اپنے ساتھیوں میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ سید علاء الدین کے بھی ایک بیٹا نجم الدین ہے جس نے ابھی قرآن مجید حفظ کیا ہے اور دوسرا نذیر الدین ابھی چھوٹا ہے۔ اللہ پاک ان سب کو سلامت رکھے۔

(سید منہاج الدین کے دو دوسرے بھائی سید بدر الدین اور تیسرے سید امام علی تھے) دوسرے بھائی سید بدر الدین اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں۔ ان کے چند اخلاف ہیں۔ اللہ پاک انہیں زندہ سلامت رکھے۔ تیسرے بھائی سید امام علی جن کا اس عاجز مولف کے خاندان کے ساتھ بڑا ارتباط تھا' انتقال فرما گئے ہیں۔ ایک بیٹا انتظام علی ان کی یادگار ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے سلامت رکھے۔

یہاں کے قدیم خاندانوں میں ایک پیرزادگان کا خاندان ہے۔ سید حسن رضا جو اپنے بھائیوں میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے دو فرزند ہیں ایک علی رضا اور دوسرے محمد رضا۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت

رکھے۔ دوسرے یوسف علی اور غلام محی الدین اور چھن علی مجذوب۔ ان تینوں بھائیوں میں اب غلام محی الدین موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کے نرینہ اولاد نہ تھی صرف بیٹیاں تھیں۔ ان کے بزرگوں میں شیخ ابراہیم کا بیعت و خلافت کا تکیہ تھا' لہٰذا یہ حضرات پیرزادہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ سید حسین علی ابن محمد ماہ۔ اس جگہ کے متوطّین میں سے دوسرے محمد غوث بن قاضی عنایت ہیں جو بلند شہر کے قدیم ساکن عباسی ہاشمی ہیں' چونکہ محمد غوث کا نکاح سعد اللہ ابن ہدایت اللہ ابن خیر اللہ ابن عبدالمجید ابن سکندر ابن وجیہ الدین کی صاحبزادی سے ہوا' لہٰذا انہوں نے اس قصبہ میں بود و باش اختیار کی اور اسی کو وطن بنا لیا۔ نظام الدین کی ایک صاحبزادی مسماۃ رشیدہ کا ان کے برادر زادہ امیر علی سے نکاح ہوا۔ عرصہ ء دراز سے یہ امیر علی مفقود الخبر ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں ہیں۔

اس قصبہ کے متوطّین میں دوسرے سید رحمت اللہ اور حافظ احسن اللہ ہیں' ساکن قدیم بدر پور مولوی سید نعیم اللہ کے بیٹے جو امام ہشتم امام موسیٰ علی رضا کی نسل سے سادات گردیزی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قصبہ کے سادات سے چونکہ ان کی قریبی رشتہ داریاں تھیں' لہٰذا ان دونوں بزرگوں نے ۱۳۰۰ھ کے اوائل میں یہاں سکونت اختیار کی۔ سید احسن اللہ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے سید عنایت اللہ نے اپنے چچا کے سایہ ء عاطفت اور سرپرستی میں پرورش پائی اور اچھے اخلاق اور اعلیٰ صفات سے متصف ہوئے۔ آپ کے تین نامور بیٹے ہیں (نمبر۱ حکیم انعام اللہ ' نمبر۲ حافظ اکرام اللہ ' نمبر۳ حافظ نعیم اللہ) پہلے بیٹے حکیم انعام اللہ طب اور عملی حکمت کے فن میں اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہیں اور سرکاری طبیب کی حیثیت سے مخلوق خدا کے علاج معالجہ میں اعجاز عیسوی رکھتے ہیں' اور ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔ دوسرے بیٹے حافظ اکرام اللہ ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ وہ قرآن مجید کے حفاظ کے سردار ہیں دیگر فارسی علوم میں بھی وسیع دستگاہ رکھتے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے اس عاجز مولف سے کتابیں پڑھی ہیں۔ تیسرے بیٹے حافظ نعیم اللہ ہیں جنہوں نے حال ہی

میں قرآن مجید پکا یاد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو سلامت رکھے۔

سید رحمت اللہ بڑے جلیل القدر، عالی ہمت اور ذی جاہ شخص تھے۔ کم ایسے بھائی ہونگے جنہیں ان سے کسی نہ کسی طرح کوئی فیض نہ پہنچا ہو اور مراعات حاصل نہ ہوئی ہوں۔ آپ ہر سال کئی بار عام لنگر کرتے، جس میں قصبہ کا ہر آنے جانے والا مہمان ہوتا۔ آپ نے چند پختہ کنویں تیار کرائے تھے اور ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، میر غلام حسین مفتون نے جس کی تاریخ تعمیر لفظ "رحمت خدا" (۱۲۵۳ھ) سے نکالی۔ یہ مسجد انتہائی مضبوط بنیادوں پر تعمیر کی گئی۔ آپ کی تعمیر کردہ عمارتوں میں ایک جدید عیدگاہ بھی ہے۔ اپنی رہائش کیلئے آپ نے ایک انتہائی خوبصورت وسیع و عریض پختہ اور گچ کاری کا ایسا مکان تعمیر کرایا کہ اس قصبہ میں اور کوئی دوسرا اس جیسا نہیں ہے۔ انتہائی نیک نامی کے ساتھ زندگی گزارنے کے بعد اس جہان فانی سے آپ نے ۱۲۶۵ھ میں عالم باقی کی طرف کوچ کیا، آپ کی قبر کے گرد چار دیواری اور اوپر گنبد بنا ہے۔

نمرد آنکہ ماند پس ازوی بجائی
پل و مسجد و چاہ و مہمان سرای
(جس شخص کی موت کے بعد اس کے تعمیر کردہ پل مسجد کنوئیں
اور مہمان سرائے باقی رہ جائیں وہ زندہ ہے مرا نہیں ہے)

آپ نے دو بیٹے یادگار چھوڑے۔ سید برکت اللہ اور شرافت اللہ۔ اپنے ہمعصروں میں دونوں ممتاز۔ سید برکت اللہ کے چند صاحبزادے ہیں۔ ان میں سید اسد اللہ اور کرم اللہ کلام پاک حفظ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے۔

اس قصبہ کے ساکنان میں محمد واسع اور محمد غوث کی اولاد بھی ہے۔ شیخان صدیقی موضع ٹیکری کے قدیم ساکن۔ اس عاجز مولف کو ان کے نسب نامہ کا علم نہیں ہے۔ مولوی صبغتہ اللہ بھی ان میں سے تھے۔ وزیر عماد الملک غازی الدین خان بہادر

کی سرکار میں ملازمت کے دوران جب ہاتھی پر سوار وطن آتے تو دوسرے بھائیوں کا لحاظ کرتے ہوئے' قصبہ میں پا پیادہ داخل ہوتے۔ سید امام علی اعمال دفع جنات کی حاضراتی میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور مخلوق کی منفعت کیلئے عملیات و تعویذات بہت کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر شاجہاں آباد میں رہتے تھے۔ ۱۲۴۰ھ کے اواخر میں سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کے صاحبزادگان غلام سرور اور غلام چشتی بھی انتقال فرما چکے ہیں اور کوئی اولاد بھی نہیں چھوڑی ہے۔

حافظ علیم اللہ اور فضل علی' حبیب اللہ کے فرزند ہیں۔ انہیں قرآن کریم بہت اچھا یاد ہے۔ حافظ علیم اللہ بڑے زاہد اور متقی انسان تھے۔ ایام شباب میں انتقال فرمایا اور کوئی اولاد نہ چھوڑی اور حافظ فضل علی نابینا ہیں اور زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندہ سلامت رکھے۔ سید امام بخش ابن چاند اب کمزور اور بوڑھے ہیں۔ علی بخش وغیرہ ان کے اخلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ عصمت اللہ نے بڑھاپے میں انتقال فرمایا اور کوئی اولاد نہ چھوڑی۔ ان کے برادر زادہ ثناء اللہ بھی انتقال فرما چکے ہیں' ان کے ایک بیٹا تھا کہ باپ کی زندگی ہی میں انہیں داغ مفارقت دے گیا۔ حافظ سراج الدین جو حفظ قرآن مجید کے استاد اور روزمرہ کے ضروری حساب کے اچھے واقف کار ہیں دوسروں کو تعلیم دینے میں منفعت رساں ہیں آپ نے ۱۲۷۰ھ کے بعد سفر آخرت اختیار فرمایا۔ آپ کے چھ صاحبزادگان ہیں۔ تاج الدین' مولوی معز الدین' حافظ شمس الدین' جلال الدین اور سعید الدین' سوائے تاج الدین یہ سب جداگانہ اوصاف سے متصف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو زندہ سلامت رکھے۔ سید امداد علی کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے' ان کے اخلاف میں مولوی نور اللہ بڑے متقی پرہیزگار اور اخلاق حسنہ کے مالک ہیں۔ مزاج میں بڑی شفقت ہے اور عربی کے علوم متعارفہ میں بڑی دستگاہ رکھتے ہیں' دوسرے خیر اللہ ہیں جو ہوشیاری و دانائی میں طاق اور خصائل حسنہ میں یگانہ آفاق ہیں۔ اس وقت بھرت پور میں ملازم ہیں۔ یہ دونوں بھائی اس عاجز مولف کے ساتھ رفاقت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت

رکھے اور حافظ فصیح الدین اور نصیر الدین کے بارے میں یہ کہ حافظ فصیح الدین کو کلام پاک خوب یاد ہے۔ شب و روز یاد الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے تقویٰ و طہارت اور زبان کی حفاظت کے بارے میں سب متفق اللفظ ہیں اور سب کو اس کا اعتراف ہے اور حافظ نصیر الدین خط نسخ خوب لکھتے ہیں اور سرکاری مدرسہ میں مدرس ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ میر امام الدین ساکن قصبہ رٹول نے رشتہ داریوں کے باعث اس قصبہ کو اپنا وطن بنایا اور عزت و احترام کے ساتھ زندگی گزاری۔ ۱۲۵۰ھ کے اواخر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے تین فرزند ہوئے (نمبر ۱ حافظ کریم الدین ، نمبر ۲ سید عظیم الدین' نمبر ۳ نظام الدین) حافظ کریم الدین بڑے متقی اور پرہیز گار تھے۔ اپنے والد سے پہلے انتقال فرمایا۔ دوسرے سید عظیم الدین بڑی خوبیوں کے مالک اور بڑے با اخلاق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے اور تیسرے نظام الدین کہ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور ان سب کی اولاد موجود ہے۔

سید غلام غوث ابن امین الدین جو مولانا نظام الدین جرجانی کی اولاد سے تھے صورت کی وجاہت اور سیرت کے محاسن کے ساتھ متصف تھے اور اپنے بھائیوں میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔ اچھے عہدہ پر فائز تھے اور عزت کے مالک تھے۔ ۱۲۶۵ھ کے اواخر میں انہوں نے آخرت کا سفر اختیار کیا۔

ان کے فرزندگان میں منشی فیض الحسن ہیں۔ جوان صالح' خوبصورت اور خوش سیرت' اوصاف حمیدہ اور اخلاق برگزیدہ سے متصف ' نثر نگاری میں سب سے سبقت لے گئے ہیں۔ ایسے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں کہ اپنے ہم عصروں کیلئے قابل رشک' اضلاع پنجاب میں بڑی عزت کے مالک ہیں۔ اس عاجز مولف کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندہ سلامت رکھے۔ سید علیم الدین ابن سید عزیز اللہ عظیم آباد کی جانب اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ بڑی لیاقت اور شان سے مصروف کار ہیں' اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔

نور محمد نے جو موضع سروندہن کے قدیم ساکن اور وہاں کے سادات میں سے تھے اس قصبہ کو اپنا وطن بنایا۔ ان کے پانچ بیٹے تھے (نمبر۱ عادل' نمبر۲ رحمت اللہ' نمبر ۳ بادل' نمبر۴ رفیع' نمبر۵ شفیع) پہلے عادل جن کے بیٹے محمد بلاقی' ان کے علی بخش' ان کے عباس علی سلمہ' دوسرے رحمت اللہ جن کے بیٹے منور علی اور ان کے خواجہ بخش کہ فن پٹہ کے خلیفہ ہیں اور اس عاجز مولف کے دوست اور ان خواجہ بخش کے بیٹے رونق علی ہیں' تیسرے چوتھے اور پانچویں بادل' رفیع اور شفیع کہ تینوں لا ولد رہے۔

شہرواسط کی بنیاد رکھے جانیکا ذکر

اب شہرواسط کی بنیاد رکھے جانے کا بیان اور قصبہ گلاؤٹھی اور تاریخ اسلام دہلی کا بیان ضروری سمجھا گیا اور اس لئے لکھا جاتا ہے۔ شہرواسط جو حضرت ابو الفرح واسطی کا جائے پیدائش ہے' اس کی بنیاد اس طرح رکھی گئی کہ حجاج کی حکومت کے دور میں جب شامی عراق پہنچے اور عراقیوں کے گھروں میں فروکش ہوئے تو ایک رات ایک شامی نے حالت مستی میں خانہ ء خدا میں ایک لڑکی سے طمع کی۔ بات جنگ تک پہنچی اور اس سلسلہ میں ایک قتل بھی ہو گیا۔ یہ بات جب حجاج بن یوسف کو پہنچی' اس رات اسے خیال آیا کہ ایک شہر تعمیر کیا جائے تاکہ اس کا لشکر وہاں قیام کر سکے۔ وہ ایسی جگہ پسند کرنا چاہتا تھا جہاں اکثر اوقات اس کی فوج ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ حجاج ایک دن سواری پر سوار ہو کر نکلا اور جائزہ لینے لگا کہ کون سا قطعہ ء زمین اس کام کیلئے مناسب ہو گا کہ ناگاہ اسے ایک راہب نظر آیا جو اونٹ کے کجاوہ پر سوار چلا جا رہا تھا۔ جب وہ راہب اس جگہ پہنچا جہاں اس وقت واسط شہر آباد ہے تو اس کے اونٹ نے پیشاب کیا۔ وہ راہب اسی وقت سواری سے نیچے اترا اور اس مٹی کو جو پیشاب سے ملوث اور خراب ہو گئی تھی سمیٹ کر اٹھایا اور اس گندی مٹی کو دریائے

دجلہ میں پھینک دیا۔ حجاج بن یوسف نے اس راہب سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ راہب نے کہا ہم نے قدیم کتابوں میں دیکھا ہے کہ اس جگہ ایک مسجد تعمیر ہو گی اور قیامت کے دن لوگ اس مسجد میں خدا کا نام لینے کیلئے قیام کریں گے۔ حجاج نے اسی روز تعمیر شہر کی بنیاد کیلئے احکام صادر کر دیئے اور جس جگہ راہب نے سواری کے پیشاب سے نجس ہونے والی مٹی سمیٹ کر پھینکی تھی اس جگہ مسجد کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا۔

اس شہر کو اس لئے واسط کہتے ہیں کہ بصرہ اور کوفہ کے وسط میں واقع ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اصل واسط دریا میں ڈوب گیا تھا۔ دوسرا شہر اسی ساحل پر آباد ہو گیا اور اس شہر واسط کو واسطۃ القصب (بانس کا واسطہ) بھی کہتے ہیں کیونکہ واسطی بانسری وہاں خوب دستیاب ہے۔

ذکر آبادی قصبہ گلاوٹھی

قصبہ گاوٹھی اس عاجز مولف کا وطن ہے۔ یہ قصبہ دہلی کے مشرقی جانب دو منزل پر واقع ہے ' اس کی آب و ہوا معتدل ہے اور یہاں کے ساکن صاحب کمال۔ عام خیال یہ ہے کہ نویں صدی ہجری نبویؐ میں شیر شاہ یا سلیم شاہ کے دور حکومت میں ایک افغانی گلاب خان نے اپنے نام پر آباد کرکے اس کا نام گلاب بسی رکھا تھا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ اور زبان کی تبدیلیوں کے باعث بعد میں یہ گلاب بستی کا نام تبدیل ہو کر گلاوٹھی ہو گیا۔ چونکہ یہاں کے سادات کرام کو جاگیریں عطا ہوئیں اور یہاں کی سکونت انہوں نے مستقل اختیار کر لی اور افغانوں کے مال و ثروت میں کمی آنا شروع ہوئی اس قصبہ کا نام ''سادات پور'' پڑ گیا۔

اس قصبہ میں زمانہ ء قدیم کی ایک مسجد ہے جس میں مختلف ادوار میں ترمیم و تبدیلی ہوتی رہی ہے' حال ہی میں سادات کرام نے اس کی توسیع اور تزئین و آرائش

کی اخروی سعادت حاصل کی' اس عاجز مولف نے اس کی تاریخ تعمیر و تزئین کو اس طرح نظم کیا ہے' قطعہ تاریخ

چہ سرائیم وصف ایں مسجد — کہ دگر مسجد قبا آمد
وچہ مسجد بود. کہ ہر خشتش — بہ محک زر اتقاء آمد
کعبہ ء حاجت خلائق ہست — قبلہ ء مقصد و دعا آمد
مسجد و صحن و چاہ شیر نیش — .طہور و بصد صفا آمد
نیست معلوم حال ایں مسجد — کہ بہ عصر کہ پادشا آمد
لیک پیش سکونت سادات — ایں رفیع البنا بپا آمد
کہنہ گردید گنبد و سقفش — شق بدیوار جا بجا آمد
دل سادات رابہ ترمیمش — حسن توفیق رہنما آمد
صرف کردند ابیض واحمر — ہمہ راپیش حق جزا آمد
شکر للہ کہ بہتر از سابق — طرح ایں خانۂ خدا آمد
بہر تاریخ او عالم قدس — "یافت تعمیر نو" ندا آمد

۱۳۶۷ھ

(میں اس مسجد کی کیا وصف بیان کروں۔ یہ گویا دوسری مسجد قبا ثابت ہوئی ہے۔ یہ کیا عجیب پاکیزہ مسجد ہے جس کی ہر اینٹ تقویٰ کے سونے کی کسوٹی سے پرکھی ہوئی آئی ہے۔ یہ مسجد مخلوق کے لئے کعبہ حاجت اور مقصد و دعا کا قبلہ ہے کہ یہاں مخلوق خدا حاجت روائی کیلئے بھی آتی ہے اور دعا و کامیابی مقاصد کیلئے بھی۔ یہ مسجد' اس کا صحن اور میٹھا کنواں بصد صفا و پاکیزگی قلب تعمیر ہوئے ہیں۔ اس مسجد کے بارے میں پوری طرح تو معلوم نہیں کہ کس بادشاہ کے دور میں پہلی بار تعمیر ہوئی لیکن اتنی بات ضرور معلوم ہے کہ یہاں سادات کرام کی آمد سے پہلے تعمیر کر دی گئی تھی۔ اس مسجد کا گنبد اور اس کی چھت پرانی ہو گئی تھی اور اس کی دیواروں میں جابجا

دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ اس مسجد کی تعمیر میں ترمیم و تبدیلی کیلئے سادات کرام کے دل میں خیال پیدا ہوا اور انہیں اس کی حسن توفیق نصیب ہوئی۔ انہوں نے اس میں اس کام کیلئے سفید (چاندی) و سرخ (سونا) صرف کیا اور سب کو اللہ پاک کے یہاں اس کی جزاء ملی۔ اللہ کا شکر ہے کہ پہلے کے مقابلہ میں یہ مسجد اب بہتر طور پر تعمیر ہو گئی ہے۔ عالم قدس کی جانب سے اس کی تاریخ تعمیر کیلئے ندا آئی "یافت تعمیر نو" (۱۲۶۷ھ) کہ اس مسجد نے نئی تعمیر پائی)

اور اس مسجد کے سامنے دو مزار فائز الانوار ہیں اور یہ مزار ان شہداء کرام کے ہیں جو سید سالار مسعود غازی کے ہمراہ یہاں آئے تھے (رحمہم اللہ) اور دوسرے مزارات بھی ہیں اور گنجینہ ء شہداء ہے اور اس قصبہ میں جنوب کی جانب جو مسجد ہے اسے سید رحمت اللہ نے تعمیر کیا جیسا کہ ان کے ذکر میں بیان ہو چکا ہے اور قصبہ کے شمال میں چارمی مسجد ہے جو ابتداء پختہ نہ تھی اور بالفعل اسے سید عظیم اللہ بن سید عزیز اللہ نے پختہ کرایا۔

فتح الاسلام دہلی

جیسا کہ تاریخ کی معتبر کتابوں مثلاً "ہفت اقلیم" اور "تاثر قطبی" وغیرہ میں دہلی میں اسلام کی فتح کے متعلق ہے کہ وہ قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ہوئی اور ہندوستان میں احوال اسلام کے بارے میں دوسری کتابوں میں ہے اب اس کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ سلاطین اسلام میں پہلا شخص جس نے ہندوستان کا قصد کیا، امیر ناصر الدین سبکتگین ہے۔ جب یہ امیر ہندوستان آیا تو قنوج کا راجہ جے پال اس سے مقابلہ اور اس کے استیصال کیلئے دوڑا۔ حدود پشاور میں دونوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ آخر اس طرح صلح نامہ طے ہوا کہ راجہ جے پال امیر

ناصر الدین سبکتگین کو پچاس ہاتھی مع چند لاکھ سکہ پیش کرے گا۔ جب یہ صلح کا معاہدہ طے پا گیا تو امیر ناصر الدین غزنیں واپس چلا گیا۔ راجہ جے پال جب قنوج واپس ہوا تو اس نے عہد شکنی کرتے ہوئے عہد نامہ کی شرائط پوری کرنے سے انکار کر دیا۔ امیر ناصر الدین انتقام کے ارادہ سے نکلا اور فاتح و کامران ہوا۔ ناصر الدین سبکتگین کی وفات ۳۸۷ھ میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔

امیر ناصر الدین سبکتگین کا بیٹا سلطان محمود سبکتگین جب تخت پر بیٹھا تو اس نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا اور ۳۹۲ ھ میں پشاور کے قریب جنگ ہوئی۔ سلطان محمود سبکتگین کامیاب ہوا۔ اس نے اس معرکہ میں دشمن کے پانچ ہزار افراد کو قتل کیا۔ راجہ جے پال کو پندرہ افراد کے ہمراہ جس میں اس کا بیٹا اور بھائی بھی تھا گرفتار کیا اور کامیاب و کامران غزنیں لوٹا۔ اس طرح سلطان محمود سبکتگین نے ہندوستان پر بارہ حملے کئے۔ ہندوستان کے حکمرانوں اور راجاؤں کو ہر بار زیر و زبر کرتا اور کثیر مال غنیمت سونا چاندی جوہرات اور ہاتھی ساتھ لے کر اپنے وطن لوٹتا۔ پانچ مرتبہ اس نے ہندوستان میں اقامت بھی کی اور کچھ عرصہ یہاں ٹھہرا۔ ۴۲۱ھ میں سلطان محمود نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اس کے بعد سلطان مسعود بن سلطان محمود نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ۴۲۴ھ میں غزنیں سے ہندوستان پر حملہ کیا اور قلعہ سرستی کو جو کشمیر کے راستہ میں واقع ہے فتح کیا اور بہت سا مال غنیمت حاصل کیا (حضرت سالار مسعود غازی جن کا مزار بہرائچ میں واقع ہے' سلان محمود غزنوی کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ ۵۵۷ھ میں ایک معرکہ میں کفار کے مقابلہ میں لڑتے ہوئے انہوں نے وفات پائی) سلطان مسعود نے ایک بار پھر ۴۲۷ھ میں ہندوستان پر لشکر کشی کی اوز قلعہ ہانسی کو فتح کرتا ہوا پانی پت کی طرف بڑھا اور اس کے بعد امیر ابو محمد بن مسعود کو طبل و علم دے کر لاہور میں چھوڑ گیا۔ خسرو ملک سلاطین غزنویہ کا آخری حکمران تھا۔ اس کے عہد تک پھر سلطان محمود کی اولاد ہی نے اپنا اقتدار قائم رکھا اور کسی نے بھی دہلی کی طرف اقدام نہ کیا۔ یہاں تک کہ سلطان معز الدین محمد سام و مشہور بہ سلطان

شہاب الدین غوری، ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا اور ۵۸۳ھ میں خسرو ملک کو گرفتار کر لیا۔ ۵۸۷ھ میں سرستی کے کنارہ اس کا اجمیر کے راجہ پتھورا سے شدید مقابلہ ہوا، جس میں شہاب الدین غوری کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۵۸۸ھ میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کیلئے وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا اور اسی جگہ جہاں گزشتہ مرتبہ جنگ ہوئی تھی اس کا پھر راجہ پتھورا سے معرکہ ہوا۔ راجہ پتھورا اور اس کے بھائیوں کو قتل کرکے وہ اس کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔ سلطان شہاب الدین غوری نے اپنے پسندیدہ غلام قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں اپنا نائب بنایا اور غزنیں واپس چلا گیا۔ اس کو ایبک اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی چنگلی (چھوٹی انگلی) ٹوٹی ہوئی تھی۔ قطب الدین ایبک نے دہلی کو راجہ پتھورا کے آدمیوں سے چھین لیا اور ۵۸۹ھ میں دہلی کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا اور اس تاریخ سے پھر دہلی (جو اب تک دار الکفر تھا) سلاطین اسلام کی تخت گاہ بن گیا۔ انہی سلطان معزالدین محمد سام نے پھر قنوج پر حملہ کے ارادہ سے ہندوستان کا رخ کیا۔ قنوج کا حکمران آٹھ سو سے زیادہ ہاتھیوں اور ایک لشکر گراں کے ساتھ اٹاوہ کے نواح میں مقابلہ پر آیا مگر اس نے شکست کھائی اور سلطان اس فتح کے بعد غزنیں لوٹ گیا۔ آخری عمر میں پھر ایک بار جب لاہور کے نواح کے چند کھوکروں نے علم بغاوت بلند کیا تو پٹنہ کے ارادہ سے وہ ہندوستان آیا اور اس کے بعد واپس لوٹ گیا۔ ویک کے مقام پر ۳ شعبان ۶۰۲ھ کو اس کا انتقال ہوا۔ سلطان معزالدین کا برادر زادہ سلطان غیاث الدین محمود پھر تخت پر بیٹھا۔

قطب الدین ایبک جسے ہندوستان میں سلطان کی نیابت سپرد تھی اسے نئے سلطان نے امارت و بادشاہی کی مہر بھیجی اور سلطان کا خطاب عنایت کیا۔ اب قطب الدین ایبک نے لاہور میں سریر سلطنت پر جلوس کیا اور ہندوستان کے بہت سے علاقے فتح کئے۔ ۶۰۷ھ میں وہ ایک مرتبہ تیز رفتار گھوڑے پر سوار چلا جا رہا تھا کہ اچانک گھوڑے سے گرا اور راہی ملک عدم ہو گیا، اس کے بعد اس کے بیٹے آرام شاہ بن سلطان قطب الدین ایبک کو لوگوں نے تخت پر بٹھایا مگر چونکہ وہ امور سلطنت

صحیح طور پر نہ چلا سکا ارباب حل و عقد نے ملک التمش کو جو سلطان قطب الدین ایبک کا غلام' اس کا داماد اور بچپن کا تربیت یافتہ تھا اور جو اس وقت بدایوں کا حاکم تھا وہاں سے بلا کر امور مملکت اس کے سپرد کر دیئے۔ سلطان شمس الدین التمش ایک با تدبیر حکمران اور بہادر و عالی شان بادشاہ تھا۔ والی غزنیں تاج الدین یلدوز کو اس نے ایک معرکہ میں گرفتار کیا اور قتل کر دیا' اور والی ملتان ملک ناصر الدین سے جو قطب الدین ایبک کا داماد تھا' متعدد مرتبہ اس کا مقابلہ ہوا۔ التمش ہر معرکہ میں غالب آتا یہاں تک کہ اسنے اس کا استیصال کر دیا اور اس کی سلطنت پر جو بھکر سے سوستان تک پھیلی ہوئی تھی قبضہ کر لیا۔ لکھولی اور بہار کا علاقہ جو غیاث الدین خلجی کے قبضہ میں تھا التمش نے اس سے چھین لیا۔ ۶۳۱ھ میں اس نے اجین پر قبضہ کر لیا اور مہا کال کا وہ بتخانہ جو گزشتہ تین سو سال کا تعمیرشدہ تھا مسمار کر دیا اور بکرماجیت' جس سے ہندو اپنی تاریخ شروع کرتے ہیں' اس کی تشبیہ کو جامع مسجد دہلی کے دروازہ پر فرش پر ڈال دیا (کہ لوگ بکرماجیت کو روندتے ہوئے جامع مسجد' دہلی میں داخل ہوں) ۶۳۳ھ میں سلطان التمش نے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ اس کی مدت سلطنت ۲۶ سال تھی۔ للذا یہ بات علم میں رہے کہ (جیسے پہلے ذکر ہوا) دہلی ۵۸۹ھ میں اسلام کے تصرف میں آیا۔

الحمدللہ کہ یہ رسالہ اپنے اختتام کو پہنچا اور وہ آرزو جو سالوں سے دل میں چھپی ہوئی تھی پوری ہوئی۔ سادات عظام اور شرفائے کرام سے توقع ہے کہ اس عاجز مولف سے اگر کوئی تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو تو اسے معاف فرما دیں گے اور جہاں کوئی سہو ہوا ہو اس کی اصلاح فرما دیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب (صحیح بات کا سب سے زیادہ علم صرف اللہ کو ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا اور ہمیشہ کا ٹھکانا ہے)

(ا) ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ مطابق ۲۰ نومبر ۱۸۹۶ء بروز جمعہ بوقت صبح بمقام قصبہ مولہ ضلع جھانسی یہ رسالہ کمترین خلائق' عاصی و گنہگار محمد نقی ساکن قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند

شہر کی کتابت و خط بے ربط سے اتمام پذیر ہوا۔
(یعنی ۱۳۱۴ ھ کی کتابت خط شکستہ میں تھی، جبکہ ۱۳۵۷ھ کی کتابت زیادہ بہتر اور صاف ستھرے خط نستعلیق میں)

(۲) ۳ شوال ۱۳۵۷ ھ مطابق ۲۶ نومبر ۱۹۳۸ بروز ہفتہ یہ رسالہ اعجاز احمد کی کتابت اور اس ؒکے قلم سے اتمام پذیر ہوا۔

(۳) ۲۱ جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ۴ نومبر ۱۹۹۶ء بروز پیر بوقت شب بمقام کراچی عاجز بے مایہ سید محبوب حسن واسطی بن سید شبیر حسن واسطی بن حضرت سید عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی ساکن کراچی نے اس فارسی رسالہ کا اردو ترجمہ مجّی برادرم سید منصور عاقل ساکن اسلام آباد کی فرمائش پر مکمل کیا۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان